لازمی نصاب

مُرقعِ اردو

جماعت نہم و دہم

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فرمانِ قائدِ اعظم

آپ کی توجہ صرف حصولِ علم کے لیے وقف رہے، صرف اسی صورت میں آپ اپنے ملک کو دنیا کا عظیم طاقت ور اور ترقی یافتہ ملک بنا کر سرخروئی حاصل کر سکتے ہیں۔ (نوجوانوں سے خطاب)

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ
۲۱۔ ای۔ ۲ گلبرگ ۳،
لاہور۔

عزیز طلبہ و طالبات
السّلام علیکم!

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ آپ کا اپنا ادارہ ہے جو نصاب کے مطابق معیاری کتابیں مہیا کرتا ہے۔ نصابی ضروریات کے علاوہ ان کتابوں کے ذریعے آپ میں اسلامی اقدار اور ملک کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کا شعور اجاگر کیا جاتا ہے۔

یہ کتابیں تجربہ کار ماہرینِ تعلیم سے لکھوائی جاتی ہیں تاہم اگر کوئی بات وضاحت طلب رہ گئی ہو تو یقیناً آپ کے اساتذہ اس کمی کو پورا کر سکتے ہیں۔ کتابوں کو مزید بہتر بنانے کے لیے آپ کے اور آپ کے اساتذہ اور والدین کے مشوروں کے لیے ہم آپ کے ممنون ہوں گے۔

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کی کتابیں بورڈ کے اس خاص نشان سے پہچانی جاتی ہیں جو ہر کتاب کے سرورق پر چھپا ہوتا ہے۔

فقط والسّلام
آپ کا خیر اندیش
پروفیسر سید زاہد حسین کاظمی
(چیئرمین)

لازمی

مُرقعِ اردو

جماعت نہم و دہم

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور

تاریخ اشاعت	بار اشاعت	طباعت	تعداد اشاعت
[illegible] ۱۹۹۲ء	سوم	اوّل	۳۵,۰۰۰

لازمی نصاب

مُرقعِ اردو

جماعت نہم و دہم

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور

تاریخ اشاعت	اشاعت	طباعت	تعداد اشاعت
مارچ ۱۹۹۲ء	سوم	اوّل	۳۵,۰۰۰

جملہ حقوق بحق پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور محفوظ ہیں
منظور کردہ : وزارت تعلیم حکومت پاکستان اسلام آباد،
بموجب مراسلہ 4-8/87- یو- آر، مورخہ 22 نومبر 1987ء

مولفین :

پروفیسر مشرف علی انصاری

سید غلام الثقلین نقوی

اختر الحسن بھٹی (مرحوم)

طاہر شادانی

سید سجاد رضوی

نگرانِ تدوین و طباعت :

نصیر احمد بھٹی

ناشر: پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

طابع : سجاد احمد، عبدالغنی

مطبع ہوشانکو پرنٹنگ پریس ۱۲ ہسپتال روڈ لاہور

پیش لفظ

"مرقع اردو" جماعت نہم و ہم کے لیے لازمی اردو کی نصابی کتاب کے طور پر پیش کی جا رہی ہے۔ یہ کتاب مرکزی وزارت تعلیم کے مقرر کردہ نصاب اور قومی تبصرہ کمیٹی کی سفارشات کے مطابق مرتب کی گئی ہے۔ مؤلفین نے بھرپور کوشش کی ہے کہ نظم و نثر کے منتخبات ہماری قومی زندگی سے ہم آہنگ دلچسپ اور بامقصد ہوں۔ نیز یہ کہ کتاب میں کوئی ایسا مواد شامل نہ ہو جو اسلامی تصوّرات، اُخلاقی اقدار اور نظریہ پاکستان کے منافی ہو۔ انتخاب کرتے وقت طَلَبہ کی نفسیات، اِستعداد اور تدریس اردو کے مقاصد کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ ہر سبق کے آخر میں سوالات دیے گئے ہیں جن کے ذریعے سے قواعدِ زبان کی تعلیم اور اسباق کی تفہیم کو بامعنی بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

نئے نصاب کی ضروریات کے مطابق اُدباء اور شعراء کے حالات زندگی نہیں دیے گئے کیونکہ یہ کتاب ادب کی تدریس کے لیے نہیں بلکہ زبان کی بامعنی تدریس کے مقصد سے مرتب کی گئی ہے۔ البتہ جہاں موجودہ صنعتی اور مشینی دور کے تقاضوں کو مدنظر رکھا گیا ہے وہاں یہ کوشش بھی کی گئی ہے کہ طَلَبہ کے سامنے معیاری ادبی نمونے رکھے جائیں تاکہ ان میں زبان کے مختلف پیرائے سیکھنے کے ساتھ ساتھ ادبی ذوق بھی پیدا ہو سکے۔

مؤلفین کو امید ہے کہ اساتذہ بھی اس کتاب کو نصاب کے تقاضوں کو مدِنظر رکھ کر پڑھائیں گے اور اپنی قیمتی آراء سے پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کو مطلع فرمائیں گے تاکہ ان کی روشنی میں اسے مزید بہتر بنایا جا سکے۔

مؤلفین

فہرست مضامین

حصہ نثر

نمبر شمار			صفحہ نمبر
۱۔	اُسوۂ کامل	سید سلیمان ندوی	۱
۲۔	نَظَرِیّۂِ پاکستان	سید سجاد رضوی	۸
۳۔	سحر خیزی اور پڑھنے کے فائدے	مولوی نذیر احمد	۲۲
۴۔	کتبہ	غلام عباس	۳۲
۵۔	صادِقہ کی مصیبت	علامہ راشد الخیری	۴۶
۶۔	ایک پنجابی زمیندار کی کہانی	چودھری افضل حق	۵۹
۷۔	کیلے کا چھلکا	چراغ حسن حسرت	۷۰
۸۔	گھر سے گھر تک	احمد ندیم قاسمی	۸۳
۹۔	بیگم کی بلی	امتیاز علی تاج	۱۰۰
۱۰۔	ہجرتِ حبشہ	مولانا شبلی	۱۱۴
۱۱۔	دستک	میرزا ادیب	۱۱۸
۱۲۔	حضرت لقمان	عبدالحلیم شرر	۱۳۲
۱۳۔	شیخ سعدیؒ	الطاف حسین حالی	۱۳۸
۱۴۔	خوش خُلقی	خواجہ حسن نظامی	۱۴۵
۱۵۔	چلتے ہو تو چین کو چلیے	ابنِ انشاء	۱۵۴

نمبر شمار			صفحہ نمبر
۱۶۔	شعراء کے ادبی لطیفے	مولانا محمد حسین آزاد	۱۶۳
۱۷۔	بحث و تکرار	سر سید احمد خان	۱۶۸
۱۸۔	مرحوم کی یاد میں	احمد شاہ پطرس بخاری	۱۷۳
۱۹۔	قومی زبان	مولوی عبد الحق	۱۸۵
۲۰۔	قدرِ ایاز	کرنل محمد خان	۱۹۱
۲۱۔	مکاتیبِ غالب	مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ	۲۰۳
۲۲۔	مکاتیبِ نذیر احمد	مولوی نذیر احمد	۲۱۳
۲۳۔	مولوی نذیر احمد کی کہانی	مرزا فرحت اللہ بیگ	۲۲۱
۲۴۔	شہابِ ثاقب	سید علی ناصر زیدی	۲۲۶
۲۵۔	چھلانگ	شوکت تھانوی	۲۳۵
۲۶۔	مسلمانوں کی تعلیم جنگِ آزادی کے بعد	مولانا غلام رسول مہر	۲۴۶
۲۷۔	ماحول پر انسانی اثرات	سید غلام الثقلین نقوی	۲۵۳
۲۸۔	انسان اور اس کا ماحول	پروفیسر مشرف علی انصاری	۲۶۶

حصہ نظم

۱۔	حمد	امیرؔ مینائی	۲۷۳
۲۔	نعت	مولانا ظفر علی خان	۲۷۴
۳۔	اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے	نظیرؔ اکبر آبادی	۲۷۶
۴۔	مفلسی	"	۲۷۷

نمبر شمار			صفحہ نمبر
۵۔	میدانِ کربلا میں گرمی کی شدت	میر انیسؔ	۲۸۰
۶۔	امامِ حسینؓ کی شہادت	"	۲۸۱
۷۔	نظمِ قومی	اکبرؔ الہ آبادی	۲۸۵
۸۔	بیٹا	"	۲۸۶
۹۔	محنت کی برکات	مولانا الطاف حسین حالیؔ	۲۸۹
۱۰۔	عظیم لوگ	"	۲۹۰
۱۱۔	چپ کی داد	"	۲۹۲
۱۲۔	شکوہ	علامہ محمد اقبالؔ رح	۲۹۴
۱۳۔	جوابِ شکوہ	"	۲۹۵
۱۴۔	فاطمہ بنت عبداللہ	"	۲۹۸
۱۵۔	پیوستہ رہ شجر سے	"	۲۹۹
۱۶۔	آنحضرتؐ کی مدینے میں تشریف آوری	حفیظؔ جالندھری	۳۰۱
۱۷۔	شام	"	۳۰۳
۱۸۔	نوائے سروش	احسان دانشؔ	۳۰۵
۱۹۔	لطفِ سحر	"	"
۲۰۔	بھٹائی کا پیغام	شیخ ایاز	۳۰۸
۲۱۔	یہ دیس مرا دیس	یوسف ظفر	۳۱۱

قطعات و رباعیات

۲۲۔	قطعات	اکبرؔ الہ آبادی	۳۱۳

نمبر شمار			صفحہ نمبر
۲۳۔	قطعہ	میر تقی میر	۳۱۴
۲۴۔	رباعیات	میر انیس	۳۱۵
۲۵۔	"	مولانا الطاف حسین حالی	۳۱۶

غزلیات

۲۶۔	جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہو گا	خواجہ میر درد	۳۱۸
۲۷۔	ان نے کیا تھا یاد مجھے بھول کر کہیں	"	"
۲۸۔	درد و غم سے دل کبھو فرصت نہ پائے	میر تقی میر	۳۲۰
۲۹۔	فقیرانہ آئے صدا کر چلے	"	"
۳۰۔	یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا	بہادر شاہ ظفر	۳۲۲
۳۱۔	لگتا نہیں ہے دل میرا اجڑے دیار میں	"	"
۳۲۔	کوئی امید بر نہیں آتی	میرزا غالب	۳۲۴
۳۳۔	ابنِ مریمؑ ہوا کرے کوئی	"	"
۳۴۔	کاٹیے دن زندگی کے ان یگانوں کی طرح	مولانا الطاف حسین حالی	۳۲۶
۳۵۔	یاروں کو تجھ سے حالی اب سر گرانیاں ہیں	"	"
۳۶۔	دل کو سکون، روح کو آرام آگیا	جگر مراد آبادی	۳۲۸
۳۷۔	عشق لامحدود جب تک رہنما ہوتا نہیں	"	"
۳۸۔	کب تک مدعا کہے کوئی	ناصر کاظمی	۳۳۰
۳۹۔	کسی کا درد ہو دل بیقرار اپنا ہے	"	"
۴۰۔	فرہنگ		۳۳۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اُسوۂ کامل

خدا کی محبت کا اہل اور اس کے پیار کا مستحق بننے کے لیے ہر مذہب نے ایک ہی تدبیر بتائی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس مذہب کے شارع اور طریقہ کے بانی نے جو عمدہ نصیحتیں کی ہیں، ان پر عمل کیا جائے، لیکن اسلام نے اس سے بہتر تدبیر اختیار کی ہے۔ اس نے اپنے پیغمبرؐ کا عملی مجسمہ سب کے سامنے رکھ دیا ہے اور اس عملی مجسمے کی پیروی اور اِتباع کو خدا کی محبت کے اہل اور اس کے پیار کا مستحق بننے کا ذریعہ بتایا ہے۔ چنانچہ اسلام میں دو چیزیں ہیں۔ "کتاب اور سنت" کتاب سے مقصود خدا کے احکام ہیں، جو قرآن مجید کے ذریعے سے ہم تک پہنچے ہیں اور سنت جس کے لغوی معنی راستہ کے ہیں، وہ راستہ جس پر پیغمبر اسلام علیہ السلام خدا کے احکام پر عمل کرتے ہوئے گزرے، یعنی آپ کا عملی نمونہ جس کی تصویر احادیث میں بصورت الفاظ موجود ہے۔

وہ تمام اشخاص جو کسی مذہب کے حلقۂ اطاعت میں داخل ہوں ناممکن ہے کہ وہ کسی ایک ہی صنفِ انسانی سے متعلق ہوں۔ اس دنیا کی بنیاد ہی اِختلاف عمل پر ہے۔ باہمی تعاون اور مختلف پیشوں اور کاموں ہی کے ذریعے یہ دنیا چل رہی ہے۔ اس میں بادشاہ یا رئیس جمہور اور حکام بھی ضروری ہیں اور محکوم، مطیع اور فرمانبردار رعایا بھی، امن و امان کے قیام کے لیے قاضیوں اور ججوں کا ہونا بھی ضرور ہے اور فوجوں کے سپہ سالاروں اور افسروں کا بھی۔ غریب بھی ہیں اور دولت مند بھی، رات کے عابد و زاہد بھی ہیں اور دن کے سپاہی اور مجاہد بھی، اہل و عیال بھی ہیں اور دوست احباب بھی، تاجر اور سوداگر بھی ہیں اور امام اور پیشوا بھی، غرض اس دنیا کا نظم و نسق ان مختلف اصناف کے وجود اور قیام ہی پر موقوف ہے۔ ان تمام اصناف کو اپنی اپنی زندگی کے لیے عملی مجسمے اور نمونے کی ضرورت ہے۔ اسلام ان

تمام انسانوں کو سنتِ نبویؐ کی اِتباع کی دعوت دیتا ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ مختلف طبقاتِ انسانی کے لیے اپنے پیغمبرؐ کی عملی سیرت میں نمونے اور مثالیں رکھتا ہے۔

ایک ایسی شخصی زندگی جو ہر طائفہ انسانی اور ہر حالتِ انسانی کے مختلف مظاہراور ہر قسم کے صحیح جذبات اور کامل اخلاق کا مجموعہ ہو، صرف محمد رسولؐ اللہ کی سیرت ہے۔ اگر دولت مند ہو تو مکّے کے تاجر اور بحرین کے خزینہ دار کی تقلید کرو، اگر غریب ہو تو شعب ابی طالب میں محصور اور مدینے کے مہمان کی کیفیت سنو، اگر بادشاہ ہو تو سلطانِ عرب کا حال پڑھو، اگر فاتح ہو تو بدر وحنین کے سپہ سالار پر ایک نظر ڈالو، اگر تم استاد اور معلّم ہو تو صُفہ کی درسگاہ کے معلّمِ قدُس کو دیکھو، اگر واعظ اور ناصح ہو تو مسجدِ مدینہ کے منبر پر کھڑے ہونے والے کی باتیں سنو، اگر تنہائی وبے کسی کے عالم میں حق کی منادی کا فرض انجام دینا چاہتے ہو تو مکّے کے صادق امین نبیؐ کا اُسوۂ حسنہ تمہارے سامنے ہے، اگر تم حق کی نصرت کے بعد اپنے دشمنوں کو زیر اور مخالفوں کو کمزور بنا چکے ہو تو فاتحِ مکّہ کا نظارہ کرو، اگر یتیم ہو تو عبداللہ وآمنہ کے جگر گوشے کو نہ بھولو اگر عدالت کے قاضی اور پنچایت کے ثالث ہو تو کعبے میں طلوعِ آفتاب سے پہلے داخل ہونے والے ثالث کو دیکھو جو حجرِ اَسود کو کعبے کے ایک گوشے میں کھڑا کر رہا ہے، مدینے کی کچی مسجد کے صحن میں بیٹھنے والے منصف کو دیکھو، جس کی نظرِ انصاف میں شاہ وگدا اور امیر وغریب برابر تھے، اگر تم بیویوں کے شوہر ہو تو خدیجہؓ اور عائشہؓ کے مقدس شوہر کی حیاتِ پاک کا مطالعہ کرو، اگر اولاد والے ہو تو فاطمہؓ کے والد اور حسنؓ وحسینؓ کے نانا کا حال پوچھو۔ غرض تم جو کوئی بھی ہو اور کسی حال میں بھی ہو تمہاری زندگی کے لیے نمونہ، تمہاری سیرت کی درستی واصلاح کے لیے سامان، تمہارے ظلمت خانے کے لیے ہدایت کا چراغ اور راہنمائی کا نور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے اُسوۂ حسنہ کے خزانے میں ہروقت اور ہمہ دم مل سکتا ہے۔

رسولِ پاکؐ کی مُبارک اور مُقدّس زندگی میں ہمیں بیک وقت اس قدر متنوّع اَوصاف نظر آتے ہیں، جو کسی ایک انسان میں تاریخ نے کبھی یکجا کر کے نہیں دکھائے۔ بادشاہ ایسا کہ ایک پورا ملک اس کی مٹھی میں ہو اور بے بس ایسا کہ خود اپنے کو بھی اپنے قبضے میں نہ جانتا ہو بلکہ خدا کے قبضے میں، دولت مند ایسا کہ خزانے کے خزانے اونٹوں پر لدے ہوئے اس کے دارالحکومت میں آرہے ہوں، اور اس کے باوجود مہینوں اس کے گھر چولھا نہ جلتا ہو اور کئی کئی وقت اس پر فاقے سے گزر جاتے ہوں، سپہ سالار ایسا کہ مٹھی بھر نہتے آدمیوں کو لے کر ہزاروں غرقِ آہن فوجوں سے کامیاب لڑائی لڑا ہو، اور صلح پسند ایسا کہ ہزاروں پُرجوش جاں نثاروں کی ہمرکابی کے باوجود صلح کے کاغذ پر بے چون وچرا دستخط کر دیتا ہو، شجاع اور بہادُر ایسا کہ ہزاروں کے مقابلے میں تن تنہا کھڑا ہو اور نرم دِل ایسا کہ کبھی اس نے انسانی خون کا ایک قطرہ بھی اپنے ہاتھ سے نہ بہایا ہو، باتعلّق ایسا کہ سارے سنسار کی اس کو فکر ہو اور بے تعلق ایسا کہ اپنے خدا کے سوا کسی اور کی یاد اس کو نہ ہو۔ اس نے اپنے برا کہنے والوں سے کبھی بدلہ نہ لیا اور اپنے ذاتی دشمنوں کے حق میں ہمیشہ دعائے خیر کی، لیکن خدا کے دشمنوں کو کبھی معاف نہ کیا۔ عین اس وقت جب اس پر کشور کُشا فاتح کا شبہہ ہو، وہ پیغمبرانہ معصومیت کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ عَین اس وقت جب ہم اس کو شاہِ عرب کہہ کر پکارنا چاہتے ہیں، وہ کھجور کی چھال کا تکیہ لگائے کھردری چٹائی پر بیٹھا درویش نظر آتا ہے۔ عین اس دن جب عرب کے اَطراف سے آ آکر اس کے صحنِ مسجد میں مال واَسباب کا انبار لگا ہوتا ہے، اس کے گھر میں فاقے کی تیاری ہو رہی ہے۔ عَین اس عہد میں جب جنگی قیدی مسلمانوں کے گھروں میں لونڈی اور غلام بن کر جا رہے ہیں، فاطمہؓ بنت رسولؐ اللہ جا کر اپنے ہاتھوں کے چھالے باپ کو دکھاتی ہیں جو چکی پیستے پیستے ہاتھوں پر پڑ گئے تھے مگر انھیں کام کرنے کے لیے کوئی لونڈی نہیں ملتی۔ عین اس وقت جب آدھا عرب اس کے زیرِ نگیں ہوتا ہے، حضرت عمرؓ حاضرِ دربار ہوتے ہیں، اِدھر اُدھر نظر اٹھا کر کاشانۂ نبوتؐ کے سامان کا جائزہ لیتے ہیں، آپ ایک کھری چارپائی یا چٹائی پر آرام فرما رہے

ہیں، جسم مبارک پر بانوں کے نشان پڑ گئے ہیں، ایک طرف مٹھی بھر جَو رکھے ہیں، ایک کھونٹی میں خشک مشکیزہ لٹک رہا ہے، سرورِ کائناتؐ کے گھر کی یہ کل کائنات دیکھ کر حضرت عمرؓ رو پڑتے ہیں، سبب دریافت ہوتا ہے، عرض کرتے ہیں، یا رسولؐ اللہ! اس سے بڑھ کر رونے کا اور کیا موقع ہو گا؟ قیصر و کسریٰ باغ و بہار کے مزے لوٹ رہے ہیں اور آپ پیغمبرؐ ہو کر اس حالت میں ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے عمر! کیا تم اس پر راضی نہیں کہ قیصر و کسریٰ دنیا کے مزے لوٹیں اور ہم آخرت کی سعادت۔

ابو سفیان جو آنحضرتؐ کے سب سے بڑے حریف تھے، فتحِ مکہ کے دن حضرت عباسؓ کے ساتھ کھڑے ہو کر اسلامی لشکر کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔ رنگ رنگ کی بیرقوں اور جھنڈیوں کے سائے میں اسلام کا دریا امنڈتا آ رہا ہے، قبائل عرب کی موجیں جوش مارتی ہوئی بڑھتی چلی آ رہی ہیں، ابوسفیان کی آنکھیں اب بھی دھوکا کھاتی ہیں، وہ حضرت عباسؓ سے کہتے ہیں، عباسؓ! تمھارا بھتیجا تو بڑا بادشاہ بن گیا، عباسؓ کی آنکھیں کچھ اور دیکھ رہی تھیں، فرمایا: ”ابوسفیان! یہ بادشاہی نہیں نبوّت ہے۔“

عدِی بن حاتم قبیلہ طے کے رئیس، مشہور حاتم طائی کے فرزند تھے اور مذہباً عیسائی تھے، وہ حضورؐ کے دربار میں آتے ہیں۔ صحابہؓ کی عقیدت مندیوں اور جہاد کا سازوسامان دیکھ کر ان کو اس فیصلہ میں دِقّت ہوتی ہے کہ محمدؐ بادشاہ ہیں یا پیغمبرؐ؟ دفعتہً مدینے کی ایک غریب لونڈی آکر کھڑی ہوتی ہے اور کہتی ہے کہ حضورؐ سے کچھ عرض کرنا ہے، فرماتے ہیں: ”دیکھو مدینے کی جس گلی میں کہو میں تمھاری باتیں سن سکتا ہوں“۔ یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور اس کی حاجت پوری کر دیتے ہیں۔ اس ظاہری جاہ و جلال کے پردے میں یہ عجز، یہ خاکساری، یہ تواضع دیکھ کر عدِی کی آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ جاتا ہے اور وہ دل میں فیصلہ کر لیتے ہیں کہ یہ یقیناً پیغمبرانہ شان ہے۔ فوراً صلیب اتار دیتے ہیں اور محمدؐ رسول اللہ کا حلقہ

اطاعت اپنی گردن میں ڈال لیتے ہیں۔

غرض محمدؐ رسول اللہ کا وجود مبارک ایک آفتاب عالم تاب تھا جس سے اونچے پہاڑ، ریتلے میدان، بہتی نہریں، سرسبز کھیت، اپنی اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق تابش اور نور حاصل کرتے تھے، یا ابر باراں تھا جو پہاڑ اور جنگل، میدان اور کھیت، ریگستان اور باغ، ہر جگہ برستا تھا اور ہر ٹکڑا اپنی اپنی استعداد کے مطابق سیراب ہو رہا تھا اور قسم قسم کے درخت اور رنگارنگ پھول اور پتے جم رہے تھے اور اُگ رہے تھے۔

اگر یہ دنیا انسانی مزاجوں، صلاحیتوں اور استعدادوں کے اختلاف کا نام ہے تو یقین کرو کہ محمد رسولؐ اللہ کی جامع شخصیت کے سوا اس کا کوئی آخری اور دائمی اور عالمگیر راہنما نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے اعلان فرمایا: اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ۔ (اگر تم کو خدا کی محبت کا دعوٰی ہے تو آؤ میری پیروی کرو، اللہ بھی تم سے محبت کرے گا)

(خطباتِ مدراس از سید سلیمان ندوی)

سوالات

۱۔ حضورؐ کی سیرتِ پاک میں ہر شخص اور ہر انسانی طبقے کے لیے ہدایت اور راہنمائی موجود ہے۔ مضمون "اُسوۂ کامل" کی روشنی میں اس موضوع پر ایک جامع پیراگراف لکھیے۔

۲۔ عدی بن حاتم کے ایمان لانے کا واقعہ قلمبند کیجیے۔

۳۔ جب حضرت عمرؓ سرورِ کائناتؐ کے گھر کی حالت دیکھ کر آبدیدہ ہوئے تو حضورؐ نے اس موقع پر کیا ارشاد فرمایا؟

۴۔ مندرجہ ذیل عبارات کی آسان اردو میں وضاحت کیجیے:-

(الف) خدا کی محبت کا اہل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ذریعہ بنایا ہے۔

(ب) محمدؐ رسول اللہ کا وجود ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگ رہے تھے۔

۵۔ مندرجہ ذیل بیانات کی تکمیل کے لیے نیچے دیے ہوئے جوابات سے درست جواب منتخب کیجیے اور اس کا حرفی نمبر جوابی کالم میں درج کیجیے۔

	جوابی کالم
(i) خدا کی محبت کا اہل بننے کے لیے اسلام نے ایک ہی تدبیر بتائی ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (الف) نماز پڑھی جائے۔ (ب) روزے رکھے جائیں۔ (ج) جملہ ارکان اسلامی پر عمل کیا جائے۔ (د) اُسوۂ رسولؐ کا اتباع کیا جائے۔	
(ii) ایک ایسی شخصی مثال جو ہر انسان کے لیے ہر حالت میں قابلِ اتباع ہے صرف ــــــــ (الف) آباء و اجداد کا کردار ہے۔ (ب) صحابہؓ کبار کی سیرت ہے۔ (ج) محمدؐ رسول اللہ کا اُسوہ ہے۔ (د) والدین کی شخصیت ہے۔	
(iii) حضرت عدی بن حاتم طائی جس بات کو دیکھ کر اسلام لائے وہ ــــــ (الف) صحابہؓ کی نبی اکرمؐ سے عقیدت تھی۔ (ب) رسولؐ اللہ کی خاکساری و تواضع تھی۔ (ج) جہاد کا سازوسامان تھا۔ (د) دربارِ رسالت مآب کا جاہ و جلال تھا۔	

۶۔ عربی قاعدے کے مطابق مندرجہ ذیل الفاظ میں جو جمع ہیں ، ان کے واحد

اور جو واحد ہیں ، ان کے جمع لکھیے :۔

مذہب ۔ احکام ۔ تصویر ۔ احادیث ۔ اشخاص ۔ صنف ۔ حکام ۔ صحابہ ۔

۷۔ نیچے دیے ہوئے الفاظ کے مترادفات لکھیے۔

محبت ۔ پیروی ۔ قاضی ۔ دوست ۔ امام ۔ استاد ۔ درستی ۔ ہدایت ۔

۸۔ "باتعلّق" میں "با" سابقہ ہے ۔ اس سابقے سے پانچ مزید الفاظ بنایئے۔

۹۔ بناوٹ کے لحاظ سے اسم کی تین قسمیں ہیں۔ اسم مُتعذّر ، اسم جامد ، اسم مُشتق۔ وہ اسم جو خود تو کسی سے نہ بنا ہو لیکن اس سے بہت سے کلمات بن سکتے ہوں ، اسم مُتعذّر کہلاتا ہے ، مثلاً دیکھنا۔ لکھنا۔ پڑھنا وغیرہ۔
وہ اسم جو نہ خود کسی مصدر سے بنا ہو اور نہ اس سے کوئی اسم بن سکتا ہو ، اسم جامد کہلاتا ہے ، مثلاً درخت ۔ کرسی ۔ پھول وغیرہ ۔ ایسا ہر اسم جو کسی نہ کسی مصدر سے بنا ہو ، اسم مُشتق کہلاتا ہے۔ جیسے ہنسنا سے ہنسی ۔ کھیلنا سے کھیلنے والا ۔ عربی اور فارسی کے اسمائے مُشتق بھی اردو میں کثرت سے استعمال ہوتے ہیں مثلاً طالب۔ عادل ۔ افسردہ ۔ مخلوق ۔ فاتح وغیرہ۔

ذیل میں کچھ الفاظ دیے گئے ہیں۔ ان کے سامنے جامد، مصدر اور مشتق کی اصطلاحات درج ہیں۔ صحیح اصطلاح کے گرد دائرہ لگا کر بتایئے کہ یہ لفظ قواعد کی رُو سے کیا ہے ؟

۱۔ چٹائی	جامد ر مصدر ر مشتق
۲۔ ہونا	جامد ر مصدر ر مشتق
۳۔ شارع	جامد ر مصدر ر مشتق
۴۔ لڑائی	جامد ر مصدر ر مشتق
۵۔ پہاڑ	جامد ر مصدر ر مشتق
۶۔ امنڈنا	جامد ر مصدر ر مشتق

~ ~ ~ ~ ~ ~ ~ ~ ~ ~

نظریۂ پاکستان

پاکستان ہمارا وطن ہے۔ اس وطن کے حصُول اور اس کی آزادی کے لیے برصغیر کے مسلمانوں نے بڑی جدوجہد کی ہے اور ہر قسم کی قربانیاں دی ہیں۔ اگست ۱۹۴۷ء کے واقعات پڑھیں تو ان کا تصوّر کر کے ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان حادثات میں انسان کی درندہ صفتی کھل کر سامنے آئی تھی۔ ہندوستان سے پاکستان کی سرزمین کی طرف ہجرت کرنے والے قافلوں پر موت، بیماری، بھوک اور بے بسی کے سائے بہت گہرے تھے۔ ان قافلوں میں شامل افراد کی حالت اور ان کی داستان عبرت انگیز بھی تھی اور دلخراش بھی۔ ان واقعات کو پڑھ کر ممکن ہے ذہنوں میں یہ سوال سر اٹھائے کہ آخر پاکستان کے قیام کی ضرورت ہی کیا تھی اور برطانوی ہندوستان ہی میں آزادی کے بعد شامل رہنے کا نقصان ہی کیا تھا؟ اس سوال کا جواب جاننا اور قیام پاکستان کی ضرورت کا احساس کرنا پاکستان کے اِستحکام اور اس کی ترقی کے لیے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

ہر کام کا آغاز ایک خیال، ایک تصَوُّر سے ہوتا ہے جو کام کرنے والے کے ذہن میں موجود ہوتا ہے۔ اس خیال کو اس کام کا نظریہ کہتے ہیں۔ اس نظریے کے مطابق کام کو مکمل کرنے کے طریقے کو اس کا منصوبہ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح پاکستان کا ایک نظریہ ہے یعنی وہ تصور جو برِّصغیر کے مسلمانوں کے ذہنوں میں ابھرا اور ان میں یہ لگن پیدا کی کہ وہ پاکستان کے قیام کے لیے ہر ممکن کوشش کریں۔ لیکن ہمارے ذہنوں میں خیال یونہی پیدا نہیں ہوا کرتے اس کا بھی ایک سبب یا بہت سے اسباب ہوا کرتے ہیں۔ اس لیے سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ خیال کیوں پیدا ہوا کہ وہ برِّصغیر کے باقی علاقوں سے اور وہاں کے باقی لوگوں سے الگ ہو جائیں اور اپنے لیے ایک وطن، آزاد وطن حاصل کریں۔ اس سوال کا

جواب نظریہ پاکستان کی صورت میں نکلتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ نظریہ پاکستان وہ بنیاد ہے جس پر پاکستان کی عمارت بلند ہوئی ہے یا وہ اُصول ہے جو تشکیلِ پاکستان کا باعث ہوا ہے۔

یہ نظریہ راتوں رات کسی کے ذہن میں نہیں آیا اور نہ اسے کسی اور ملک سے درآمد ہی کیا گیا بلکہ یہ پورے برِصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ سے ابھرا ہے اور برطانوی دور میں حاصل ہونے والے تجربات کا نتیجہ ہے۔ جس کی بنا پر باشعور مسلمان راہنماؤں نے اس بات کا یقین حاصل کر لیا کہ برطانوی دَور کے ہندوستان میں بسنے والے مسلمان ہندوؤں سے بالکل جدا حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ایک الگ قوم ہیں اور یہ بات ممکن نہیں کہ برطانوی حکومت سے آزادی حاصل کرنے کے بعد وہ ہندوؤں کے ساتھ مل جل کر رہ سکیں اور ان کے حُقُوق محفوظ رہیں۔

اس بات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم بعض ایسے حقائق کو اپنی نگاہ میں رکھیں جنھیں عام طور پر قابلِ غور نہیں گردانا جاتا۔

اس سلسلے میں پہلی بات تو ایک غلط فہمی کو دور کرنا ہے کہ موجودہ پاکستان اور موجودہ ہندوستان تاریخی طور پر ایک ہی ملک رہے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں۔ تاریخ کے مطالعے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ صرف اشوک، علاؤالدین خلجی اور اورنگ زیب عالمگیر کے زمانوں میں تقریباً وہ تمام علاقے ایک ہی حکومت کے ماتحت تھے جنھیں برطانوی دَور میں ہندوستان کہا جاتا تھا۔ ورنہ باقی زمانوں میں یہ سارا منطقہ مختلف ریاستوں میں تقسیم رہا ہے۔ پھر یہ بات بھی غور طلب ہے کہ اگر کچھ علاقے ایک ہی حکومت کے ماتحت آجائیں تو وہ ایک ملک نہیں بن جایا کرتے اور نہ ان علاقوں میں بسنے والے لوگ ایک قوم ہی بن جایا کرتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب منگول تقریباً سارے ایشیاء پر حکمرانی کرتے تھے لیکن اس کا نتیجہ ہرگز یہ نہیں نکلا کہ ان کے ماتحت رہنے والے سب لوگ ایک قوم بن گئے ہوں۔ ہاں یہ بات تاریخ سے ثابت ہوئی ہے کہ موجودہ پاکستان اور ہندوستان کے منطقے کو قدیم تاریخ میں ہمیشہ ہند،

سندھ اور دکن کے ناموں سے یاد کیا گیا ہے اور وہ علاقہ جسے ہند کہا جاتا تھا اس میں موجودہ پاکستان اور بنگلہ دیش کے علاقے شامل نہیں ہوتے تھے۔

ایک بات یاد رہے کہ عربوں کا اس منطقے سے بہت پرانا رابطہ رہا ہے زمانہ جاہلیت میں بھی اور ظہور اسلام کے بعد بھی لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ صرف ان علاقوں کی زبانیں عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں جو پاکستان میں شامل ہیں حالانکہ ان علاقوں پر عربوں کا اثر بہت بعد میں پڑا اور ان سے کہیں پہلے ہندوستان کے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ عربوں کے تجارتی روابط قائم تھے۔

مزید برآں یہ خیال کہ ہندوستان میں ایک ہی قوم آباد تھی یا ہے، یورپی فکر کی پیداوار ہے، جہاں قوم کی بنیاد جغرافیائی حد بندیوں پر تھی یعنی فرانس میں بسنے والے فرانسیسی قوم کے افراد ہیں اور جرمنی میں رہنے والے جرمن قوم ہیں اور یہ تَصَوُّر بھی کہیں اٹھارویں صدی میں جا کر قائم ہوا۔ مسلمانوں کے نظام فکر میں جغرافیائی حد بندیاں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں کیونکہ یہ حدود بدلتے رہتے ہیں۔ ایک زمانے میں موجودہ پاکستان کے علاقے ایرانی سلطنت کا حصہ تھے اور موجودہ برما برطانوی ہندوستان کا ایک صوبہ تھا۔

متحدہ ہندوستان یا اکھنڈ بھارت کا تَصَوُّدُ یورپی تَصَوُّرات پر مبنی ہے جن میں قوم کی بنیاد اکثراوقات لسانی یا جغرافیائی حد بندیوں پر ہوتی ہے لیکن مسلمان جس دین کے پیرو ہیں اس میں قوم کی اساس جغرافیائی حدود پر نہیں بلکہ ایک ایسے عقیدے پر ہے جس میں سب انسان ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور ان کے مابین قبیلے اور قومیں محض پہچان اور شناخت کے لیے ہیں۔ اس عقیدے میں رنگ، نسل، زبان، مال ودولت، آباء واجداد کی بنا پر کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے افضل گردانے۔

ہند و پاکستان میں مسلمانوں کی آمد عرب تاجوں کے وسیلے سے اسلام کے

ابتدائی دور ہی میں ہو چکی تھی لیکن تاریخی واقعات نے ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم کی سرکردگی میں مسلمانوں کو فاتح کی حیثیت میں سندھ کے ساحل پر اتارا اور انھوں نے سندھ اور ملتان کے بہت سے علاقے حاصل کر کے یہاں پہلی مسلمان حکومت کی بنیاد اور اسلامی اثرات کی اساس رکھی۔ مسلمان اپنے ساتھ اپنا دین، اپنا مذہب، اپنے رہنے سہنے کے طریقے، اپنی سوچ کے انداز یا دوسرے لفظوں میں اپنی تہذیب لے کر آئے۔

مسلمانوں کی آمد کے وقت یہاں کے لوگ اپنی زندگی سے خوش نہ تھے۔ اس کا بنیادی سبب ذات پات کا وہ نظام تھا جس کے مطابق کچھ لوگ پیدائشی طور پر بہتر تھے اور کچھ بدتر اور پھر یہ بدتر لوگ کسی صورت بھی بہتر نہیں ہو سکتے تھے، چاہے وہ لاکھ کوشش کریں۔ اس وقت ہند و پاکستان کے علاقوں میں تمام لوگ چار ذاتوں میں بٹے ہوئے تھے۔ پہلی دو ذاتوں کے لوگوں کو تو انسانی حقوق حاصل تھے اور باقی دو ذاتوں کے افراد کا مقصد اونچی ذاتوں کے لوگوں کی خدمت کرنا ہی تھا۔ اسلام تمام انسانوں کو برابر کے حقوق دیتا ہے۔ اس لیے جب مسلمان یہاں آئے تو انھوں نے سب کو احترام اور عزت کی نگاہ سے دیکھا۔ اس بات نے پسماندہ طبقے کے لوگوں کو متاثر کیا اور انھوں نے آہستہ آہستہ اسلام قبول کرنا شروع کر دیا۔

مسلمانوں نے ہند و پاکستان کے علاقے پر کم وبیش ایک ہزار سال تک حکومت کی۔ اس دوران میں مسلمان حکمران اپنی ہندو رعایا سے نہایت منصفانہ سلوک کرتے تھے اس کے باوجود ہندو موقع پا کر بغاوت کر ہی دیا کرتے تھے۔ ان بغاوتوں کے اسباب جو کچھ بھی ہوں، ایک سبب ہمیشہ موجود ہوتا تھا۔ مسلمانوں نے نیچی ذات کے ہندوؤں کو یہ سبق دیا تھا کہ سب انسان پیدائش کے اعتبار سے برابر ہیں۔ یہ بات اعلیٰ طبقے کے ہندوؤں کے مفاد کے خلاف تھی کیونکہ یوں نیچی ذات کے ہندوؤں نے مسلمانوں کے زیرِ اثر اپنے آپ کو ان اونچی ذات کے لوگوں کے برابر سمجھنا شروع کر دیا تھا بہر حال اعلیٰ طبقے کے ہندو مسلمانوں کی حکومت کو دل سے پسند

نہ کرتے اور موقع ملنے پر اپنے آپ کو مسلمان حکومتوں کے خلاف کھڑا کر ہی لیا کرتے۔

اسی لیے جب انگریزوں نے تاجروں کے روپ میں اس علاقے پر اپنی حکومت قائم کرنا شروع کی تو اونچی ذات کے ہندوؤں نے ان کا ساتھ دیا کبھی کھل کر اور کبھی چھپ کر۔ سراج الدولہ اور سلطان ٹیپو کو زک پہنچانے میں سازشی ہندوؤں کا بڑا ہاتھ تھا۔

جب انگریزوں نے اس علاقے پر اپنی حکومت مضبوط کر لی تو ہندوؤں نے کھل کر ان کا ساتھ دیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں بہادُر شاہ ظفر کی شکست کے بعد تو انگریزوں اور ہندوؤں کا باہمی تعاوُن اور بھی بڑھ گیا۔ کیونکہ دونوں مسلمانوں سے نفرت کرتے تھے۔

ہندوؤں کی ایک خصوصیت ان کے لیے بڑی مفید رہی ہے اور وہ یہ کہ وہ اپنے آپ کو ہر رنگ میں رنگ لیتے ہیں اور ہر روپ اختیار کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ مسلمانوں کے عہد حکومت میں ہندوؤں نے فارسی سیکھی اور کاروبار سلطنت میں شریک ہوئے۔ انگریزوں کا دور آیا تو انھوں نے انگریزی زبان سیکھنے میں پھرتی دکھائی اور اس کے وسیلے سے ان کا آلہ کار بن کر ان کی حکومت کو مضبوط کیا اور ساتھ ہی مسلمانوں کے خلاف اپنی روایتی نفرت کو پوری طرح پھلنے پھولنے دیا اور یوں مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے اپنا غلام بنانے کا منصوبہ تیار کیا۔ اس منصوبے کا سراغ انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد رکھنے سے لگتا ہے جسے ایک انگریز نے اس لیے قائم کیا کہ وہ ہندوستان کے باشندوں کے مسائل انگریزی حکومت کے سامنے پیش کرے۔ اس طرح بالواسطہ طوُر پر اس تصور کی داغ بیل ڈالی گئی کہ ہندوستان کے سب باشندے انگلستان یا فرانس یا پھر ایران اور مصر کے رہنے والوں کی طرح ایک قوم ہیں مگر چند ہی برسوں میں اس ڈھول کا پول کھل گیا جب ہندو اپنے اثر و رسوخ کی بنا پر اس جماعت پر چھا گئے۔ اس بات کو سر سید احمد خان نے بھانپ لیا اور

اپنی تقریروں اور مضامین کے ذریعے سے مسلمانوں کو تلقین کی کہ اس جماعت پر بھروسا نہ کریں اور اس سے الگ رہیں۔ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ یہ بات واقعی درست تھی۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد جب تحریکِ خلافت زوروں پر تھی ہندوؤں کے لیڈر گاندھی جی نے ہندو مسلم اتحاد کے حُصُول کے لیے اس تحریک کا ساتھ دیا لیکن کچھ دیر بعد جب گاندھی جی نے محسوس کیا کہ انگریزی حکومت ہل چکی ہے اور یوں مسلمانوں کو اس سے فائدہ حاصل ہونے کا امکان ہے تو وہ ایک معمولی بات کا بہانہ بنا کر اس تحریک سے الگ ہو گئے۔

ہندو بنیادی طور پر مسلمانوں کو غیر ملکی سمجھتے تھے۔ حالانکہ ان کو یہاں رہتے ہوئے سیکڑوں سال بیت چکے تھے اور ان کی اکثریت ان لوگوں پر مُشتمل تھی جو ہندو سماج کے جبر سے تنگ آ کر مسلمان ہو گئے تھے۔ ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کا کردار، ان کی زبانیں، ان کا کلچر، ان کا طرزِ زندگی اس ہندوستان کی سرزمین سے ابھرے اور یہیں کی آب و ہوا میں پھلے پھولے تھے۔ مسلمان رہنماؤں نے بڑی پر مُخلوص کوششیں کیں کہ ہندو مسلمانوں کو اپنا ہم وطن گردانیں اور زندگی کی ہر سطح پر ان میں باہمی تعاون اور متبادل احترام کے جذبات بر قرار رہیں لیکن ہندوؤں نے ذہنی اور عملی طور پر اس بات کو ماننے سے انکار کیا کیونکہ ان کے دل میں یہ بات سما چکی تھی کہ انگریزوں کے جانے کے بعد مغربی جمہوریت کی بنیاد پر وہ اکثریت میں ہونے کے سبب حکومت کا حق رکھیں گے اور مسلمان اقلیت میں ہونے کی بنا پر ان کے ماتحت ہوں گے۔ اس لیے جب کبھی کوئی موقع ایسا آیا کہ مسلمانوں کو فائدہ پہنچ سکے ہندوؤں نے اس کی سرتوڑ مخالفت کی۔ اس کی ایک معمولی مثال بنگال کی تقسیم پر ہندوؤں کا احتجاج تھا جس کی بنا پر انگریز حکومت نے تقسیمِ بنگال کو ختم کرایا اور مشرقی اور مغربی بنگال کو پھر ایک صوبہ بنا دیا جس پر ہندوؤں کا تسلط تھا۔

مسلمانوں کو پسماندہ اور محتاج رکھنے کے لیے انگریز اور ہندو دونوں نے

باہمی تعاون کا ثبوت دیا اور اس سلسلے میں انھوں نے بعض ، نافہم مسلمان رہنماؤں کی خدمات بھی حاصل کیں جنھوں نے مثلاً مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ انگریزی نہ پڑھیں کہ یہ کافروں کی زبان ہے۔ وہ تو خدا بھلا کرے سرسید احمد خان کا جنھوں نے اس مشورے کو رد کر کے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی طرف راغب کیا ورنہ انگریزی نہ جاننے کی بنا پر وہ ہندوؤں اور انگریز دونوں کے ہاتھوں پس جاتے۔

یوں تو ہندو اور ان کے خریدے ہوئے مسلمان رہنما یہ نعرہ لگایا کرتے تھے کہ ہم سب ایک ہی قوم کے افراد ہیں لیکن مسلمانوں کے خلاف ہر ناانصافی برداشت ہو جایا کرتی اور اگر کبھی کسی بات سے مسلمانوں کو فائدہ حاصل ہونے کا امکان ہوتا تو ہندو رہنما گاندھی جی سمیت ، بے تاب ہو جاتے اور کوشش کرتے کہ مسلمانوں کو وہ فائدہ حاصل نہ ہو پائے۔ ان ناانصافیوں کا قصہ بہت طویل ہے لیکن چند ایک مثالوں سے ان کا سراغ مل سکتا ہے۔

انگریزوں کے زمانے کی ہندوستانی فوج میں اکثریت ان علاقوں کے لوگوں کی تھی جو موجودہ پاکستان کے علاقوں میں رہتے تھے لیکن جب ملٹری اکیڈمی بنی تو ان علاقوں سے بہت دور پونا میں۔ پورے برصغیر میں کھالیں پیدا کرنے والے علاقے موجودہ پاکستان سے تعلّق رکھتے تھے لیکن چمڑے کے کارخانے ہندوستان کی موجودہ ریاست اُتر پردیش (یو۔پی) میں تھے۔ پورے پاکستانی علاقوں کے لیے صرف ایک یونیورسٹی لاہور میں تھی لیکن اتنی ہی آبادی کے صوبے یو۔پی میں جہاں ہندو اکثریت تھی سات یونیورسٹیاں تھیں۔ اسی طرح سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی تعداد بے حد کم تھی اور اعلیٰ عہدوں پر تو گنے چنے لوگ پہنچ پاتے تھے۔ یہ باتیں مسلمانوں کے خلاف تعصّب کو ظاہر کرتی ہیں۔

ابتداء میں مسلمان بھی اس بات کے قائل تھے کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ مل جل کر رہیں۔ عدم تعاون کی تحریک میں جو کانگریس نے انگریزوں کے خلاف شروع کی تھی مسلمانوں نے پوری طرح حصہ لیا۔ قائداعظم بھی کانگریس کے ساتھ تھے اور

ہندو مسلم اتحاد کے بڑے مُبلّغ تھے اسی بنا پر کانگریس والوں نے بمبئی میں ایک ہال ان کے نام سے تعمیر کروایا تھا لیکن جب قائداعظم نے ہندوؤں کا رویہ دیکھا تو وہ بھی اس بات کے قائل ہو گئے کہ برصغیر کی جغرافیائی حدود میں رہنے والے سب کے سب ایک ہی قوم کے افراد نہیں بلکہ ہندو اور مسلمان خاص طور پر دو الگ الگ قومیں ہیں جن کا صرف مذہب ہی جدا نہیں بلکہ ان کی سوچ کا انداز، ان کا رہن سہن، ان کے معاشرتی آداب، ان کی ثقافت، ان کا ماضی، ان کی تاریخ، ان کے قومی ہیرو غرضیکہ ہر بات جدا ہے اور ان دونوں کو کسی طور پر بھی ایک قوم نہیں کہا جاسکتا۔ اسی بات کو دوسرے الفاظ میں دو قومی نظریہ کہا جاتا ہے۔ یہی دو قومی نظریہ اس مطالبے کی بنیاد بنا کہ انگریزوں کے ہندوستان چھوڑ جانے کے بعد یہاں پر دو حکومتیں ہونا چاہیں۔ ایک حکومت کے ماتحت وہ علاقے ہوں جن میں ہندوؤں کی اکثریت ہو اور دوسری کے پاس وہ علاقے جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہو۔ اس بات کو علامہ اقبال نے اپنے خطبۂ صدارت میں بیان کیا جو انھوں نے الہ آباد میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں ارشاد فرمایا یہی بات چودھری رحمت علی مرحوم نے لندن سے اور اسی بات کو قائداعظمؒ نے لاہور میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء میں ایک قرار داد کی صورت میں منظور کروایا جسے قرار داد پاکستان کا نام دیا گیا۔ اس قرار داد نے کانگریس کی صفوں میں بے حد زیادہ بے چینی پیدا کر دی لیکن مسلم لیگ کا موقف بالکل واضح ہو گیا کہ برصغیر کے مسائل کا حل سوائے اس کی تقسیم کے اور کچھ نہیں۔ قیام پاکستان کے تصور اور اس کے امکان نے مسلمانوں میں ایک نیا ولولہ اور تازہ جوش پیدا کر دیا اور ان کی بے حد نمایاں اکثریت قائداعظم کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہو گئی اور پاکستان کے قیام کے لیے جدوجہد میں مصروف ہو گئی۔

مسلمانوں کے لیے ایک الگ وطن کے قیام کے مطالبے کو پہلے تو ہندوؤں نے مذاق میں اڑایا اور اس پر پھبتیاں کسیں لیکن جب انھیں احساس ہوا کہ یہ مطالبہ

لو بڑا زور پکڑ رہا ہے تو انھیں مخالف پراپیگنڈے کا سہارا لینا پڑا اور اس کے ساتھ انھیں ایسے نادان مسلمان مقررین اور راہنما مل گئے جنھوں نے ان کا ساتھ دیا۔ ان مسلمان کانگریسیوں نے مسلمانوں اور ان کے رہنماؤں کو جن میں قائداعظم سرفہرست تھے، گالیوں کا نشانہ بنایا۔ ان پر کفر کا الزام لگایا ان کو اسلام دشمن کہا اور مسلمان عوام کو تلقین کی کہ وہ ہندو کانگریس کا ساتھ دیں، متحدہ ہندوستان میں رہیں اور ہندوستانی قومیت کا تمغہ اپنے سینوں پر سجائیں۔ لیکن ۱۹۴۶ء تک مسلمان اپنی جدوجہد کے ایک ایسے مرحلے میں داخل ہو چکے تھے جہاں دنیا کی کوئی طاقت ان کے قدموں میں لغزش پیدا نہ کر سکتی تھی۔ ۱۹۴۶ء میں اسلامیہ کالج لاہور کی گراؤنڈ میں قائدِاعظمؒ نے جس عظیم الشان جلسے سے خطاب فرمایا اس کے بارے میں لاہور کے ہندو اخبارات پرتاپ، ملاپ اور ویر بھارت نے یہ خبر دی کہ اس میں سات لاکھ افراد شریک تھے۔ اس زمانے میں برطانیہ سے کیبنٹ مشن آیا ہوا تھا جو ہندوستان کے مختلف لیڈروں سے آزادی کے بارے میں بات چیت کر رہا تھا۔ اس مشن کے افراد نے مسلمانوں کا یہ عظیم اجتماع دیکھا اور اس پر اپنی حیرت کا اظہار کیا۔ ۱۹۴۶ء ہی میں مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات نے صورتِ حالات اور واضح کر دی کہ مسلم لیگ نے ہر جگہ اپنے مخالفوں کو شکست دی۔

مسلسل جدوجہد، لگاتار محنت اور قائدِاعظمؒ کی راہبری کا نتیجہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو قیامِ پاکستان کی صورت میں نکلا اور دنیا کے نقشے پر ایک ایسے ملک کے خدوخال واضح ہوئے جس کے لیے کئی لاکھ مسلمانوں نے اپنی جانیں قربان کیں۔ اپنا گھر بار لٹایا، اپنے بچوں کو یتیم اور اپنی ماؤں، بہنوں اور بیویوں کو ان کے بیٹوں، بھائیوں اور شوہروں سے محروم کیا لیکن جو عہد کیا تھا اسے نبھایا اور مسلمانوں کو ایک ایسا ملک بنانے میں مدد دی جس میں وہ اپنے انداز میں، اپنے تصورات، اپنے عقاید، اپنی تہذیب وثقافت کے مطابق زندہ رہ سکیں اور اپنے شاندار ماضی کے مادّی، روحانی، علمی اور ادبی پہلوؤں کو روشن کر کے دنیا والوں کو بتا سکیں کہ اسلام ایک

ایسا دین ہے جو ہر زمانے میں انسان کو ہر قسم کی مادی اور روحانی ترقی کی راہ چلنے میں مدد دے سکتا ہے۔

یہ وطنِ عزیز اس لیے قائم نہیں ہوا تھا کہ مسلمانوں کو کچھ وزارتیں اور عہدے مل جائیں۔ یہ وزارتیں اور عہدے دینے کے لیے تو کانگریس بھی تیار تھی اور نہ اس لیے قائم ہوا تھا کہ مسلمانوں پر مال و دولت کے حُصُول کے دروازے کھل جائیں بلکہ اس کو حاصل کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اس ملک میں اسلام کے اصولوں کے مطابق ایک نظام قائم ہو جس میں ہر مسلمان، تمام اِختلافات کے باوجود، دوسرے مسلمانوں کا بھائی ہو اور اس کی زبان سے اور ہاتھ سے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کے مطابق، کسی دوسرے مسلمان کو ایذاء نہ پہنچے۔ پاکستان کے قیام کا مقصد محض الگ حکومت بنانا نہیں تھا بلکہ ایک ایسی حکومت قائم کرنا تھا جو اپنے ذاتی مفاد کو عام مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے قربان کر دے اور انھیں اس قابل بنائے کہ وہ اس دور میں اپنی اسلامی شخصیت کو نمایاں کر کے دنیا والوں کو بتا سکیں کہ اسلام صرف عقائد و عبادات کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک جامع نظام زندگی ہے۔ جو ہر دَور میں ہر ملک کے حالات کے مناسب حال ہے اور بنی نوع انسان کو ترقی کی ان راہوں پر چلنے کے قابل بناتا ہے جو انسان کے شایانِ شان ہیں۔

نظریہ پاکستان جن عوامل پر مبنی ہے ان میں ایک تو اسلام ہے اور اس کی تمام تعلیمات جن پر ایمان لانے اور عمل کرنے کے بعد کوئی ایمان والا علاقائی تعصبات اور برادری کے اختلافات کی پروا نہیں کرتا۔ وہ پنجابی، پٹھان، سندھی، بلوچی، کشمیری وغیرہ کے الفاظ صرف اپنوں اور دوسروں کی پہچان کے لیے اسی طرح استعمال کرتا ہے جس طرح وہ اپنے ذاتی نام کو لیکن سب کو اسلام کے رشتے سے اپنا بھائی سمجھتا ہے اور اس کے لیے ایثار و قربانی، ہمدردی، عدل و انصاف، شفقت اور نرم دلی کے جذبات سے بھرا ہوتا ہے۔ یہی رشتہ مختلف زبانیں بولنے والوں کو بھائی چارے کے اسلامی جذبے سے یوں ملا دیتا ہے جس طرح مختلف اینٹوں کو سیمنٹ جوڑ دیتا ہے۔

نظریہ پاکستان کا دوسرا بنیادی جزو برصغیر کا مسلم کلچر ہے جو ایران و توران وعرب سے آنے والے مسلمانوں اور مقامی مسلمانوں کے باہمی میل ملاپ سے پیدا ہوا اور جسے کانگریس کے ارکان ختم کرنا چاہتے تھے یا اس پر ہندو کلچر کی چھاپ لگانا چاہتے تھے اس مسلم کلچر کی نمائندگی اردو زبان کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ اسی لیے کانگریس کے لیڈر بھی اردو کے خلاف تھے۔ گاندھی جی اسی بات پر مُصرّ تھے کہ اردو کا نام ہندوستانی ہو اور اسے عربی یا فارسی رسم الخط میں لکھنے کے بجائے سنسکرت کے حروف میں لکھا جائے۔ بعض لوگوں کو شاید یہ بات معمولی سی لگے کہ آخر زبان کا نام بدلنے یا اس کی تحریر کا طریقہ بدلنے سے کیا فرق پڑتا ہے لیکن یہ بات اس قدر معمولی اور غیر اہم نہیں۔ زبان کسی قوم کے تہذیبی سرمایے کا خزانہ ہوا کرتی ہے جو قوم اپنی زبان کی پروا نہیں کرتی وہ زوال کا نشانہ بن جاتی ہے۔ اردو ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کا سراغ دیتی ہے یہ کسی خاص علاقے کی زبان نہیں بلکہ پورے برصغیر کے مسلمانوں کا مشترک ورثہ ہے اور ان کی باہمی بات چیت اور اظہارِ خیال کا وسیلہ ہے۔ بعض لوگ غلطی سے اسے دہلی یا لکھنؤ کے ساتھ منسوب کر دیتے ہیں لیکن اردو کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس کو نکھارنے اور ترقی دینے میں صرف دہلی یا لکھنؤ کے رہنے والے ہی شامل نہیں بلکہ ان سے کہیں زیادہ دوسرے علاقے کے لوگوں نے اس کی نشوونما میں حصہ لیا ہے۔ اس لیے قائداعظم نے مسلم لیگ کی طرف سے اس بات کا اعلان بار بار کیا کہ اردو ہماری سرکاری اور رسمی زبان ہے۔

آج پاکستان بن چکا ہے اور ہم اس کے آزاد شہری ہیں، ہمارا قومی فرض بنتا ہے کہ ہم اس تصور کو، ان حالات کو، ان اسباب کو جانیں، پہچانیں اور اس کے بنیادی تصور، اساسی نظریے کے دو اجزاء یعنی اسلام اور اردو کو اپنانے اور ان کو اپنی زندگیوں کا جزو بنانے میں کوشاں رہیں اور یوں اپنے اس وطن کو مضبوط بنائیں اور ان مقاصد کو حاصل کریں جن کی خاطر لاکھوں بہنوں اور بھائیوں نے ہر قسم کی

قربانیاں دیں۔

(سید سجاد رضوی)

سوالات

اردو کے تمام الفاظ تین حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ کچھ الفاظ اپنے معنی رکھتے ہیں لیکن زمانے کے بدلنے سے ان کی شکل نہیں بدلتی مثلاً مکان کمرہ حمید اور چاقو۔ ان کو **اسم** کہتے ہیں۔ کچھ الفاظ اپنے معنی رکھتے ہیں لیکن زمانے کے بدلنے کے ساتھ ان کی شکل بدل جاتی ہے مثلاً کرتا ہے، جاتا تھا، لکھے گا۔ ان کو **فعل** کہتے ہیں۔ الفاظ کی تیسری قسم میں وہ الفاظ آتے ہیں جن کے اپنے تو کوئی معنی نہیں ہوتے بلکہ دوسرے الفاظ کے ساتھ ملکر ان میں معنی پیدا ہوتے ہیں اور وہ زمانے کے بدلنے کے ساتھ بدلتے بھی نہیں مثلاً پر، تک اور سے ۔ ان کو **حرف** کا نام دیا جاتا ہے۔

۱۔ اپنے اس سبق میں سے دس دس اسم، فعل اور حرف چنیے۔

۲۔ مندرجہ ذیل بیانات میں سے درست بیان کی نشاندہی کریں۔

(الف) پاکستان انگریزوں نے بنایا تھا۔	صحیح	غلط
(ب) قائداعظم برصغیر کے مسلمانوں کے عظیم رہنما تھے۔	صحیح	غلط
(ج) کانگریس مسلمانوں کے ساتھ برابر کا سلوک کرتی تھی۔	صحیح	غلط
(د) اردو تمام مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے۔	صحیح	غلط
(ہ) اسلام تمام مسلمانوں کو بھائی بھائی قرار دیتا ہے۔	صحیح	غلط
(و) گاندھی اردو زبان، کی حمایت کرتے تھے۔	صحیح	غلط
(ز) پاکستان اس لیے بنا تھا کہ مسلمانوں کو عہدے مل جائیں۔	صحیح	غلط

(ح) ۱۹۴۷ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کو ہر جگہ کامیابی حاصل ہوئی۔ صحیح غلط

۳۔ مندرجہ ذیل بیانات کی تکمیل کے لیے نیچے دیے ہوئے جوابات میں سے درست جواب چنیے اور اس کا حرفی نمبر جوابی کالم میں لکھیے۔

جوابی کالم

(i) ہر کام کا آغاز

(الف) محنت سے ہوتا ہے۔

(ب) پیسے سے ہوتا ہے۔

(ج) دوسروں کی مدد سے ہوتا ہے۔

(د) ایک تصور سے ہوتا ہے جو ان کے ذہن میں ہو۔

(ii) اگست ۱۹۴۷ء کے واقعات پڑھیں ---

(الف) تو ان کو یاد کر کے لوگ خوش ہو جاتے ہیں۔

(ب) لوگ حیران ہو جاتے ہیں۔

(ج) لوگ بار بار یاد کرتے ہیں۔

(د) تو ان کا تصور کر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

(iii) قیامِ پاکستان کے تصور نے ----

(الف) کانگریس میں ایک جوش پیدا کر دیا۔

(ب) انگریزوں میں مسلمانوں کے حق میں جذبہ پیدا کر دیا۔

(ج) مسلمانوں کی اکثریت میں غصہ پیدا کر دیا۔

(د) مسلمانوں میں ایک نیا ولولہ اور تازہ جوش پیدا کر دیا۔

۴۔ کس بات نے مسلمانوں کو پاکستان کا مطالبہ کرنے پر آمادہ کیا؟

۵۔ کیا تاریخ میں ہند و پاکستان کے علاقے ہمیشہ ایک ہی ملک رہے ؟

۶۔ تحریکِ خلافت سے کیا مراد ہے ؟ اپنے استاد سے دریافت کر کے ایک پیراگراف لکھیں

۷۔ قرار دادِ پاکستان کب اور کہاں منظور ہوئی ؟

۸۔ مندرجہ ذیل الفاظ کے ہم معنی الفاظ لکھیے۔

آغاز ، حادثات ، ابھرنا ، آزادی ، منطقہ ، سلطنت ، رابطہ ، سبب

- - - - - - - - - - -

صبح خیزی اور پڑھنے کے فائدے

محمودہ : سب لڑکیوں نے ساجھا ملایا ہے ۔ کل کڑھائی چڑھے گی۔ سامان آیا رکھا ہے۔ تلی تو ابھی جاتی ، استانی جی نے کہا دن کے وقت گرمی بہت ہوتی ہے ۔ سویرے تڑکے دھوپ نکلتے نکلتے تل تلا کر فراغت ہو جاؤ۔ سو کل آپ بھی سیر دیکھیے گا۔

حسن آرا : سموسے بھی تلنے آتے ہیں ؟

محمودہ : ان شاء اللہ ایسے سموسے تل کر کھلاؤں ، نرم اور خستہ ، پتلے پرت کہ آپ بھی پسند کریں ، مگر یہ تو فرمایئے کہ میٹھے ، سلونے ، سادے یا قیمہ بھرے۔

حسن آراء : میٹھے

محمودہ : میٹھے سموسے شہربانو ایسے بناتی ہیں کہ سبحان اللہ !

حسن آرا : مگر سویرے تڑکے تو میں نہیں آسکتی۔ میں تو کوئی پہر دن چڑھے سو کر اٹھتی ہوں۔

پہر دن چڑھے کا نام سن کر محمودہ بے اختیار ہنس پڑی

محمودہ : کیا ہر روز آپ دن چڑھے اٹھا کرتی ہیں ؟

حسن آرا : ہر روز۔

محمودہ : سوتی آپ کس وقت ہیں ؟

حسن آرا : سرِ شام۔

محمودہ : بُلا کی نیند آپ نے بڑھا رکھی ہے۔

حسن آرا : میں نے بڑھا رکھی ہے؟ نیند بھی کوئی اپنے اختیار کی بات ہے۔ میری آنکھیں تو کچھ دن رہے سے بند ہونے لگتی ہیں اماں جان کھانے کے واسطے مجھ کو بہلاتی ہی رہتی ہیں۔ جب دیکھتی ہیں کہ سوئی ہی جاتی ہے تو ناچار کھانا کھلوا دیتی ہیں۔ پہر دن چڑھے بھی میری آنکھ آپ سے نہیں کھلتی۔ سوتی کو زبردستی اٹھا بٹھاتی ہیں۔ کچی نیند جو جگا دیتی ہیں تو گھنٹوں نیند کا خمار رہتا ہے۔ اسی واسطے دوپہر کو پھر کوئی دو چار گھڑی کے واسطے سو رہتی ہوں۔

دوپہر کو سونے کا نام سن کر محمودہ پھر ہنسی اور کہنے لگی کہ اگر آپ کو جی بھر کر سونے دیا جائے تو شاید آپ رات دن سویا ہی کریں۔

حسن آرا : کیا بتاؤں نیند کمبخت ایسی ٹوٹ پڑی ہے کہ کسی طرح مجھ کو سونے سے سیری ہی نہیں ہوتی۔ گھر بھر مجھ کو چھیڑا کرتا ہے اور چاہے کوئی بیماری ہو، ابا جان ہمیشہ کہا کرتے ہیں کہ تمام تر سونے کا فساد ہے، مگر کیا کروں نیند پر قابو نہیں چلتا۔ ہر روز ارادہ کرتی ہوں کہ آج سب کے ساتھ سوؤں، مگر جب وقت آتا ہے تو نیند کے غلبے سے ایسا جی خراب ہونے لگتا ہے کہ کچھ بن نہیں پڑتی۔ نیند کے آثار شروع ہوتے ہیں تو مجھ کو خیال ہوتا ہے کہ آج بڑا پکا وعدہ کر چکی ہوں ابھی سے سو رہوں گی تو لوگ چھیڑیں گے اور اس شرمندگی کے مارے جی مضبوط کر کے تھوڑی دیر سنبھلی، بیٹھا جاتا نہیں، پلنگ پر جھکی اور ادھر سے اماں جان بولیں، ادھر

سے آپا جان، لیکن ان کی بات پوری بھی نہیں ہونے پاتی کہ بندی لیٹنے کے ساتھ خراٹے لینے لگی۔ میرے لیٹے پیچھے جو کچھ یہ لوگ کہتے سنتے ہوں، مجھ کو مطلق خبر نہیں ہوتی۔

محمودہ : اگر آپ دل سے نیند کو گھٹانا چاہیں تو کچھ مشکل بات نہیں۔ میں آپ کو بہت سہل تدبیر بتا سکتی ہوں۔

حسن آرا : ہاں اس نظر سے کہ گھر بھر مجھ کو سونے کے واسطے چھیڑا کرتا ہے، میں بھی چاہتی ہوں کہ زیادہ نہیں تو سب کے ساتھ سوؤں اور سب کے ساتھ اٹھ بیٹھوں۔

محمودہ : دو باتوں کا التزام کیجیے، اول تو یہ کہ نیند کو بھلانے کے لیے کچھ مشغلہ چاہیے کہ طبیعت اس میں مصروف ہو جائے، دوسرے یہ کہ جو شخص سویرے اٹھنے والا ہو، اس پر تاکید کر دیجیے کہ جس طرح ممکن ہو، جھنجوڑ کر، پانی کے چھینٹے دے کر آپ کو ہوشیار کر دیا کرے اور اٹھنے کے ساتھ آپ منہ ہاتھ دھو، طبیعت کو سنبھال کسی کام میں لگ جایا کیجیے۔ اول اول آٹھ دس دن خلافِ عادت سویرے اٹھنے سے ایک خفیف سی گرانی اور درد معلوم ہو گا۔ مگر پھر عادت ہو جائے گی۔ خود بخود آنکھ کھلنے لگے گی اور گرانی سر بھی موقوف ہو جائے گی۔ بلکہ سویرے اٹھنے سے صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھا کر مزاج ایسا باغ باغ ہو جائے گا کہ دن بھر طبیعت بحال رہا کرے گی۔ میں بھی بلا کی سونے والی تھی۔ مُردوں سے شرط باندھ کر سوتی۔ استانی جی ہر روز مجھ کو نصیحت کیا کرتیں کہ دنیا میں انسان اس واسطے نہیں آیا کہ سونے اور نکمے پڑے

رہنے سے دن تیر کرے۔ خدا نے دن کام کے لیے بنایا ہے۔ رات کیا تھوڑی ہوتی ہے کہ دن کو بھی سویا کریں؟ بہت سونے سے انسان کاہل غبی اور ذہن مٹھا ہو کر کند ہو جاتا ہے۔ آدمی کا وقت بڑی قیمتی چیز ہے۔ فرصت کا ایک لمحہ بس غنیمت ہے۔ اس وقت میں ہو سکے تو لگ لپٹ کر علم و ہنر حاصل کر لیں کہ جس سے دنیا اور عاقبت دونوں درست ہوں۔ چنانچہ میں نے رفتہ رفتہ سونا کم کر دیا، یہاں تک کہ اب سب سے پیچھے سوتی اور سب سے پہلے اٹھتی ہوں اور بہ نسبت سابق کے میں اپنے تئیں زیادہ تندرست بھی پاتی ہوں، مگر مکتب کی لڑکیاں غضب کرتی ہیں کہ گھر بھی ان کے چار چار چھے چھے پیسے ڈولی پر ہیں[1] اور اندھیرے منہ یہاں آ جاتی ہیں۔ آپس میں شرط لگا رکھی ہے کہ دیکھیں سب سے پہلے کون مکتب میں پہنچتا ہے۔

حسن آرا : دیکھیے ان شاء اللہ اب میں بھی ضرور اس کا انتظام کروں گی اور جس طرح بن پڑے گا، خدا نے چاہا تو کل کڑھائی چڑھنے نہ پائے گی کہ مجھ کو یہاں پہنچا دیکھنا۔

محمودہ اور حسن آراء آپس میں یہ باتیں کر رہی تھیں کہ اتنے میں استانی جی نے آواز دی، "محمودہ! تم تو نئی سہیلی سے اس قدر جلد بے تکلف ہوئیں کہ کون وقتوں سے باتیں کر رہی ہو، اب تک تمھاری باتیں ہو نہیں چکیں۔ پہلے ہی دن ایسا کیا مشورہ ہونے لگا؟"

محمودہ : بیگم صاحب تو نہایت اچھی آدمی ہیں۔ دو ہی باتوں میں میرا دل

۱۔ گھر خاصے دور ہیں کہ پالکی کا کرایہ بھی اتنا ادا کرنا پڑتا ہے۔

ان سے مل گیا۔ میں نے ان کو اپنی گڑیاں دکھائیں۔ مرآۃ العروس اور چند پند وغیرہ سے طاعت شعاری اور صبح خیزی کے فائدے سنائے۔

استانی جی : تم نے ایسی ایسی باتیں کر کے حسن آرا بیگم کو کہیں ناخوش تو نہیں کیا؟

حسن آرا : استانی جی! ایسی ایسی اچھی عقل اور نصیحت اور فائدے کی باتیں محمودہ بیگم نے بیان کی ہیں کہ میں نے کبھی نہیں سنی تھیں اور میرا جی ان باتوں سے نہایت خوش ہوا۔ ان کی صرف ایک بات البتہ میں کسی قدر ناپسند کرتی ہوں کہ یہ امیروں کی بہت مذمت کرتی ہیں۔

استانی جی : امیروں کی یا اُن کے کردار کی؟

حسن آرا : کردار کی مذمت ہوئی تو امیروں کی ہوئی۔ وہ ایک ہی بات ہے۔

استانی جی : نہیں ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ اگر مطلق امیروں کی مذمت کی جائے تو اس سے مطلق دولت کی مذمت نکلتی ہے، حالانکہ دولت بڑی قدر و منزلت کی چیز ہے۔ (یہ سن کر حسن آرا نے محمودہ کی طرف دیکھا) لیکن اگر دولت پا کر آدمی گھمنڈ اور غرور کرے اور یہ سمجھے کہ وہی سب میں بڑا ہے اور جتنے غریب ہیں، حقیر اور ذلیل ہیں اور اس کی ٹہل اور خدمت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں تاکہ وہ آپ ہاتھ نہ ہلائے اور دوسروں کی محنت سے آرام حاصل کرے اور دولت اس کو صرف اسی کے

۱۔ کتابوں کے نام ہیں۔

آرام و آسائش کے لیے دی گئی ہے اور غریبوں کو دینا اور محتاجوں کی مدد کرنا اپنا فرض نہ سمجھے تو ایسی دولت دنیا کا جنجال ہے اور عاقبت کا وبال۔

حسن آرا : مجھ کو اس میں چند شبہے ہیں۔

استانی جی : میں تمھارے سب شبہوں کو ان شاء اللہ بخوبی رفع کر دوں گی، لیکن اب وقت بہت کم ہے۔ سب لڑکیاں کہانیوں کی منتظر ہیں

کہانیوں کا نام سن کر تو حسن آرا اور بھی خوش ہوئی اور بیتاب ہو کر پوچھنے لگی۔ "اچھی! کون کہانیاں کہے گا؟ آپ یا محمودہ بیگم؟"

استانی جی : نہ میں اور نہ محمودہ بلکہ جس کی باری ہو گی۔

حسن آرا : کیا ان سب لڑکیوں کو کہانیاں یاد ہیں؟

استانی جی : یاد تو شاید کسی کو بھی نہیں۔

حسن آرا : پھر کہیں گی کہاں سے؟

استانی جی : بہت اچھی اچھی کہانیاں ایک کتاب میں لکھی ہیں۔ پڑھنا ان سب کو آتا ہے۔ جس کی باری ہوئی وہی کتاب میں سے پڑھ پڑھ کر کہانی کہے گی۔

حسن آرا : جس کو پڑھنا آتا ہو، وہ کہانیوں کی کتاب پڑھ لے؟

استانی جی : بے شک۔

حسن آرا : تو پڑھنا بڑی اچھی چیز ہے۔ ایک پڑھنا آجائے تو سیکڑوں ہزاروں کہانیاں آجائیں۔

استانی جی : پڑھنے کا یہ تو ایک ادنیٰ فائدہ ہے۔ سیکڑوں فائدے بڑے بڑے عمدہ ہیں جن سے پڑھا لکھا آدمی مزے لیا کرتا ہے۔ کہانیوں ہی کو دیکھو کہ بعض مرتبہ جی چاہتا ہے کہ کوئی اچھی سی کہانی کہتا ہو تو سنتے اور ایسا اتفاق پیش آتا ہے کہ یا تو کسی کو نئی کہانی آتی نہیں یا آتی ہے تو اس کو فرصت نہیں۔ بس دل کا شوق دل ہی میں رہ جاتا ہے۔ پڑھنا آتا ہو تو کتاب اٹھا لی اور بیسیوں افسانہ خواں ہاتھ جوڑ کر آموجود ہوئے۔ اجی! پڑھنا تو وہ چیز ہے کہ اس سے ہر طرح کی دانائی اور ہر طرح کی ہوشیاری آتی ہے۔ جن کے منہ پر آنکھیں نہیں، وہ تو ظاہر ہی کے اندھے ہیں، دل کے اندھے وہ ہیں جن کو علم نہیں۔ دنیا اور دین دو ہی چیزیں ہیں۔ سو علم کے بدون دنیا بھی اکارت ہے اور دین بھی خراب ہے۔ آدمی کسی حالت میں کیوں نہ ہو، علم سے اس کو فائدہ ہی ہو گا۔ اگر مصیبت میں ہے تو علم اس کی ایسی غمگساری کرے گا جو کسی درد مند سے نہ ہو سکے اور اگر خوشی میں ہے تو علم اس خوشی کو بے خرخشہ اور پائیدار کر دے گا۔ آسودگی اور قائم مزاجی اور استغنا اور سیر چشمی جیسی علم سے حاصل ہوتی ہے، نہ دولت سے ہوتی ہے، نہ حکومت سے۔ واری جائیے پڑھنے کے اور صدقے جائیے کتاب کے۔ فرصت کا مشغلہ، دل بہلاؤ، گھر بیٹھے کی سیر، استانی کی استانی، سہیلی کی سہیلی۔ جو عورتیں پڑھنا نہیں جانتیں کیسی بری طرح ان کا وقت کٹتا ہے کہ معاذاللہ، اس کی غیبت، اس کی بدی، مجھ سے لڑ، تجھ سے بھڑ یا اٹوانی کھٹوانی لے کر پڑ رہیں۔ پڑھنا آتا ہو تو کتاب ہاتھ میں لی، جس ملک کی چاہا سیر کر

آئے۔ پڑھنا حاضرات کا ایک عجیب و غریب علم ہے۔ جس کو چاہا پکڑ بلایا اور اسی سے باتیں کرنے لگے۔

حسن آرا : اچھی ! استانی جی، پڑھنے سے یہ کرامت بھی حاصل ہو جاتی ہے۔

استانی جی : بے شک۔ دیکھو یہ لڑکیاں کتابیں پڑھتی ہیں گویا ان کے مصنفوں سے جنھوں نے یہ کتابیں بنائی ہیں باتیں کر رہی ہیں۔ غرض کہ علم جنت کا میوہ ہے۔ جس نے کھایا ہے، وہی اس کی لذت خوب جانتا ہے۔ کہنے اور بیان کرنے سے اس کی کیفیت ظاہر نہیں ہوتی۔ ہزاروں برس پہلے کی باتیں ایسی معلوم ہوتی ہیں کہ گویا آنکھوں کے سامنے سماں بندھا ہوا ہے۔

(بنات النعش از مولوی نذیر احمد)

سوالات

۱۔ استانی جی نے کس قسم کی دولت کو دنیا کا جنجال اور عاقبت کا وبال کہا ہے؟

۲۔ مولوی نذیر احمد نے کن لوگوں کو "دل کے اندھے" کہا ہے اور کیوں؟

۳۔ استانی جی نے علم کے جو فائدے بتائے ہیں انھیں اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔

۴۔ مندرجہ ذیل عبارات کی تشریح کیجیے۔

الف ۔ اگر مطلق دولت کی مذمت ۔۔۔۔۔ عاقبت کا وبال

ب ۔ آدمی کسی حالت میں ۔۔۔۔۔ نہ حکومت سے

۵۔ مندرجہ ذیل سوال کا درست جواب منتخب کیجیے اور اس کا حرفی نمبر جوابی کالم میں درج کیجیے :۔

حسن آرا صبح سویرے مدرسے کیوں نہیں پہنچ سکتی تھی۔	جوابی کالم
الف۔ وہ بیمار تھی۔	
ب۔ اس کا گھر مدرسے سے دور تھا۔	
ج۔ اس کے ماں باپ اسے وقت پر نہ جگاتے تھے۔	
د۔ وہ پہر دن چڑھے سو کر اٹھتی تھی۔	

۶۔ مندرجہ ذیل جملوں میں خالی جگہیں پُر کرنے کے لیے نیچے دیے ہوئے الفاظ سے مناسب لفظ منتخب کیجیے اور اس کا حرفی نمبر جوابی کالم میں درج کیجیے:۔

(i) بہت سونے سے انسان ——— ہو جاتا ہے۔	جوابی کالم
(الف) تندرست۔ (ب) تازہ دم۔	
(ج) غبی۔ (د) ذہین۔	
(ii) آسودگی اور سیر چشمی ——— سے حاصل ہوتی ہے۔	
(الف) دولت۔ (ب) علم۔	
(ج) حکومت۔ (د) جاہ و منصب۔	
(iii) جو عورتیں ——— نہیں جانتیں، ان کا وقت بری طرح کٹتا ہے۔	
(الف) باتیں کرنا۔ (ب) غیبت کرنا۔	
(ج) لکھنا پڑھنا۔ (د) لڑائی کرنا۔	

۷۔ مندرجہ ذیل محاورات کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:۔

سیری نہ ہونا۔ کچھ بن نہ پڑنا۔ باغ باغ ہونا۔ مردوں سے شرط باندھ کر سونا۔ لگ لپٹ کر۔

کسی عام شخص، جگہ یا چیز کے نام کو **اسم نکرہ** اور کسی خاص شخص، جگہ یا چیز کے نام کو **اسم معرفہ** کہتے ہیں مثلاً لڑکا **اسم نکرہ** ہے اور عمران **اسم معرفہ**۔

۸۔ اس سبق سے اسم نکرہ اور اسم معرفہ چن کر اپنی کاپی میں لکھیے۔

۹۔ مندرجہ ذیل الفاظ پر اعراب لگا کر ان کا تلفظ واضح کیجیے:۔

خمار ۔ الزام ۔ مشغلہ ۔ مرآۃ العروس

۱۰۔ مندرجہ ذیل الفاظ کے سامنے ان کے متضاد بے ترتیبی سے درج ہیں۔
جوابی کالم میں آپ متعلقہ لفظ کے سامنے درست متضاد کا حرفی نمبر تحریر کیجیے:۔

نمبر شمار	الفاظ	متضاد	جوابی کالم
۱۔	نرم	(الف) بیمار	
۲۔	سہل	(ب) ذہین	
۳۔	غبی	(ج) نیکی	
۴۔	تندرست	(د) سخت	
۵۔	بدی	(ہ) مشکل	

کتبہ

شہر سے کوئی ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر پُر فضا باغوں اور پھلواریوں میں گھری ہوئی، قریب قریب ایک ہی وضع کی بنی ہوئی عمارتوں کا ایک سلسلہ ہے جو دور تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ ان عمارتوں میں کئی چھوٹے بڑے دفتر ہیں جن میں کم و بیش چار ہزار آدمی کام کرتے ہیں۔ دن کے وقت اس علاقے کی چہل پہل اور گہما گہمی عموماً کمروں کی چار دیواریوں ہی میں محدود رہتی ہے مگر صبح کو ساڑھے دس بجے سے پہلے اور سہ پہر کو ساڑھے چار بجے کے بعد وہ سیدھی اور چوڑی چکلی سڑک جو شہر کے بڑے دروازے سے اس علاقے تک جاتی ہے ایک ایسے دریا کا روپ دھار لیتی ہے جو پہاڑوں پر سے آیا ہو اور اپنے ساتھ بہت سا خس و خاشاک بہا لایا ہو۔

گرمی کا زمانہ، سہ پہر کا وقت، سڑکوں پر درختوں کے سائے لمبے ہونے شروع ہو گئے تھے مگر ابھی تک زمین کی تپش کا یہ حال تھا کہ جوتوں کے اندر تلوے جھلسے جاتے تھے۔ ابھی ابھی ایک چھڑکاؤ گاڑی گزری تھی۔ سڑک پر جہاں جہاں پانی پڑا تھا ابخرات اٹھ رہے تھے۔

شریف حسین کلرک درجہ دوم معمول سے کچھ سویرے دفتر سے نکلا اور اس بڑے پھاٹک کے باہر آ کر کھڑا ہو گیا جہاں سے تانگے والے شہر کی سواریاں لے جایا کرتے تھے۔ گھر کو لوٹتے ہوئے آدھے راستے تک تانگے میں سوار ہو کر جانا ایک ایسا لطف تھا جو اسے مہینے کے شروع کے صرف چار پانچ روز ہی ملا کرتا تھا اور آج کا دن بھی انہی مبارک دنوں میں سے ایک تھا۔ آج خلافِ معمول تنخواہ کے آٹھ روز بعد بھی اس کی جیب میں پانچ روپے کا نوٹ اور کچھ آنے پیسے پڑے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ اس کی بیوی مہینے کے شروع ہی میں بچوں کو لے کر میکے چلی گئی تھی

اور گھر میں وہ اکیلا رہ گیا تھا۔ دن میں دفتر کے حلوائی سے دو چار پوریاں لے کر کھا لی تھیں اور اوپر سے پانی پی کر پیٹ بھر لیا تھا۔ رات کو شہر کے کسی سستے سے ہوٹل میں جانے کی ٹھہرائی تھی۔ بس بے فکری ہی بے فکری تھی۔ گھر میں کچھ ایسا اثاثہ تھا نہیں جس کی رکھوالی کرنی پڑتی، اس لیے وہ آزاد تھا کہ جب چاہے گھر جائے اور چاہے تو ساری رات سڑکوں ہی پر گھومتا رہے۔

تھوڑی دیر میں دفتروں سے کلرکوں کی ٹولیاں نکلنی شروع ہوئیں، ان میں ٹائپسٹ، ریکارڈ کیپر، ڈسپیچر، اکاؤنٹنٹ، ہیڈ کلرک سپرنٹنڈنٹ غرض ادنیٰ و اعلیٰ ہر درجہ اور حیثیت کے کلرک تھے اور اسی لحاظ سے ان کی وضع قطع بھی ایک دوسرے سے جدا تھی۔ مگر بعض ٹائپ خاص طور پر نمایاں تھے۔ سائیکل سوار آدھی آستینوں کی قمیض، خاکی زین کے نیکر اور چپل پہنے، سر پر سولا ہیٹ رکھے، کلائی پر گھڑی باندھے، رنگدار چشمہ لگائے، بڑی بڑی توندوں والے بابو چھاتا کھولے، منہ میں بیڑی، بغلوں میں فائلوں کے گٹھے دبائے، ان فائلوں کو وہ قریب قریب ہر روز اس امید میں ساتھ لے جاتے کہ جو گتھیاں وہ دفتر کے غل غپاڑے میں نہیں سلجھا سکے ممکن ہے گھر کی یکسوئی میں ان کا کوئی حل سوجھ جائے۔ مگر گھر پہنچتے ہی وہ گرہستی کاموں میں ایسے الجھ جاتے کہ انھیں دیکھنے تک کا موقع نہ ملتا اور اگلے روز انھیں یہ مفت کا بوجھ جوں کا توں واپس لے آنا پڑتا۔

بعض منچلے تانگے، سائیکل اور چھاتے سے بے نیاز، ٹوپی ہاتھ میں، کوٹ کاندھے پر، گریبان کھلا ہوا جسے بٹن ٹوٹ جانے پر انھوں نے 'سیفٹی پن' سے بند کرنے کی کوشش کی تھی اور جس کے نیچے سے چھاتی کے گھنے بال پسینے میں تر بتر نظر آتے تھے۔ نئے رنگروٹ سستے سلے سلائے ڈھیلے ڈھالے بد قطع سوٹ پہنے، اس گرمی کے عالم میں واسکٹ اور نکٹائی کالر تک سے لیس، کوٹ کی بالائی جیب میں دو دو تین تین فوٗنٹین پن اور پنسلیں لگائے خراماں چلے آرہے تھے۔

گو ان میں زیادہ تر کلرکوں کی مادری زبان ایک ہی تھی مگر وہ لہجہ بگاڑ بگاڑ

کر غیر زبان میں باتیں کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اس کی وجہ وہ طمانیت نہ تھی جو کسی غیر زبان پر قدرت حاصل ہونے پر اس میں باتیں کرنے پر اکساتی ہے بلکہ یہ کہ انھیں دفتر میں دن بھر اپنے افسروں سے اسی غیر زبان میں بولنا پڑتا تھا اور اس وقت وہ بات چیت کر کے اس کی مشق بہم پہنچا رہے تھے۔

ان کلرکوں میں ہر عمر کے لوگ تھے۔ ایسے کم عمر بھولے بھالے ناتجربہ کار بھی جن کی ابھی مسیں بھی پوری نہیں بھیگی تھیں اور جنھیں ابھی سکول سے نکلے تین مہینے بھی نہیں ہوئے تھے اور ایسے عمر رسیدہ جہاں دیدہ گھاگھ بھی جن کی ناک پر سالہا سال عینک کے استعمال کے باعث گہرا نشان پڑ گیا تھا اور جنھیں اس سڑک کے اتار چڑھاؤ دیکھتے دیکھتے پچیس پچیس تیس تیس برس ہو چکے تھے۔ بیشتر کارکنوں کی پیٹھ میں گدی سے ذرا نیچے خم سا آ گیا تھا اور کند استروں سے متواتر ڈاڑھی مونڈھتے رہنے کے باعث ان کے گالوں اور ٹھوڑی پر بالوں میں جڑیں پھوٹ نکلی تھیں جنھوں نے بیشمار ننھی ننھی پھنسیوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔

پیدل چلنے والوں میں بہتیرے لوگ بخوبی جانتے تھے کہ دفتر سے ان کے گھر کو جتنے راستے جاتے ہیں ان کا فاصلہ کے کے ہزار قدم ہے۔ ہر شخص افسروں کے چڑچڑے پن یا ماتحتوں کی نالائقی پر نالاں نظر آتا تھا۔

ایک تانگے کی سواریوں میں ایک کی کمی دیکھ شریف حسین لپک کر اس میں سوار ہو گیا۔ تانگہ چلا اور تھوڑی دیر میں شہر کے دروازے کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ شریف حسین نے اکنی نکال کر کوچوان کو دی اور گھر کے بجائے شہر کی جامع مسجد کی طرف چل پڑا جس کی سیڑھیوں کے گرداگرد ہر روز شام کو کہنہ فروشوں اور سستا مال بیچنے والوں کی دکانیں سجا کرتی تھیں اور میلہ سا لگا کرتا تھا۔ دنیا بھر کی چیزیں اور ہر وضع اور ہر قماش کے لوگ یہاں ملتے تھے۔ اگر مقصد خرید و فروخت نہ ہو تو بھی یہاں اور لوگوں کو چیزیں خریدتے، مول تول کرتے دیکھنا بجائے خود ایک پُر لطف تماشا تھا۔

شریف حسین لیکچر باز حکیموں ، سنیاسیوں ، تعویذ گنڈے بیچنے والے سیانوں اور کھڑے کھڑے تصویر اتار دینے والے فوٹوگرافروں کے جمگھٹوں کے پاس ایک ایک دو دو منٹ رکتا ، سیر دیکھتا اس طرف جا نکلا جہاں کباڑیوں کی دکانیں تھیں۔ یہاں اسے مختلف قسم کی بے شمار چیزیں نظر آئیں۔ ان میں سے بعض ایسی تھیں جو اپنی اصلی حالت میں بلاشبہ صنعت کا اعلیٰ نمونہ ہوں گی۔ مگر ان کباڑیوں کے ہاتھ پڑتے پڑتے یا تو ان کی صورت اس قدر مسخ ہو گئی تھی کہ پہچانی ہی نہ جاتی تھی یا ان کا کوئی حصہ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا جس سے وہ بیکار ہو گئی تھیں۔ چینی کے ظروف اور گلدان ، ٹیبل لیمپ ، گھڑیاں ، جلی ہوئی بیٹریاں ، چوکھٹے ، گراموفون کے کل پرزے و جراحی کے آلات ، ستار ، بھس بھرا ہرن ، پیتل کے لُم ڈھینگ ، بدھ کا نیم قد مجسمہ----

ایک دکان پر اس کی نظر سنگ مرمر کے ایک ٹکڑے پر پڑی جو معلوم ہوتا تھا کہ مغل بادشاہوں کے کسی مقبرے یا بارہ دری سے اکھاڑا گیا ہے۔ اس کا طول کوئی سوا فٹ تھا اور عرض ایک فٹ۔ شریف حسین نے اس ٹکڑے کو اٹھا کر دیکھا۔ یہ ٹکڑا ایسی نفاست سے تراشا گیا تھا کہ اس نے محض یہ دیکھنے کے لیے کہ بھلا کباڑی اس کے کیا دام بتائے گا قیمت دریافت کی۔

تین روپے ! کباڑی نے اس کے دام کچھ زیادہ نہیں بتائے تھے۔ مگر آخر اسے اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس نے ٹکڑا رکھ دیا اور چلنے لگا۔

"کیوں حضرت چل دیے ؟ آپ بتایئے کیا دیجیے گا!"

وہ رک گیا۔ اسے یہ ظاہر کرتے ہوئے شرم سی آئی کہ اسے اس چیز کی ضرورت نہ تھی اور اس نے محض اپنے شوقِ تحقیق کو پورا کرنے کے لیے قیمت پوچھی تھی۔ اس نے سوچا ، دام اس قدر کم بتاؤ کہ جو کباڑی کو منظور نہ ہوں۔ کم از کم وہ اپنے دل میں یہ تو نہ کہے کہ یہ کوئی کنگلا ہے جو دکانداروں کا وقت ضائع

اور اپنی حرص پوری کرنے آیا ہے۔

"ہم تو ایک روپیہ دیں گے"۔ یہ کہ کر شریف حسین نے چاہا کہ جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا کباڑی کی نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ مگر اس نے مہلت ہی نہ دی۔

"اجی سنیے تو کچھ زیادہ نہیں دیں گے؟ سوا روپیہ بھی نہیں ---- اچھا لے جایئے۔"

شریف حسین کو اپنے آپ پر غصہ آیا کہ میں نے بارہ آنے کیوں نہ کہے۔ اب لوٹنے کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ قیمت ادا کرنے سے پہلے اس نے اس مرمریں ٹکڑے کو اٹھا کر دوبارہ دیکھا بھالا کہ اگر ذرا سا بھی نقص نظر آئے تو اس سودے کو منسوخ کر دے۔ مگر وہ ٹکڑا بے عیب تھا۔ نہ جانے کباڑی نے اسے اس قدر سستا بیچنا کیوں قبول کیا تھا۔

رات کو جب وہ کھلے آسمان کے نیچے اپنے گھر کی چھت پر اکیلا بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا تو اس سنگِ مرمر کے ٹکڑے کا ایک مصرف اس کے ذہن میں آیا۔ خدا کے کارخانے عجیب ہیں۔ وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔ کیا عجب اس کے دن پھر جائیں۔ وہ کلرک درجہ دوم سے ترقی کر کے سپرنٹنڈنٹ بن جائے اور اس کی تنخواہ چالیس سے بڑھ کر چار سو ہو جائے ---- یہ نہیں تو کم سے کم ہیڈ کلرکی ہی سہی۔ پھر اسے ساجھے کے مکان میں رہنے کی ضرورت نہ رہے۔ بلکہ وہ کوئی چھوٹا سا مکان لے لے اور اس مرمریں ٹکڑے پر اپنا نام کندہ کرا کے دروازے کے باہر نصب کر دے۔

مستقبل کی یہ خیالی تصویر اس کے ذہن پر کچھ اس طرح چھا گئی کہ یا تو وہ اس مرمریں ٹکڑے کو بالکل بے مصرف سمجھتا تھا یا اب اسے ایسا محسوس ہونے لگا گویا وہ ایک عرصے سے اس قسم کے ٹکڑے کی تلاش میں تھا اور اگر اسے نہ خریدتا تو بڑی بھول ہوتی۔

شروع شروع میں جب وہ ملازم ہوا تھا تو اس کا جوش اور ترقی کا ولولہ انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ مگر دو سال کی سعیِ لا حاصل کے بعد رفتہ رفتہ اس کا یہ جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور مزاج میں سکون آچلا تھا۔ مگر اس سنگِ مرمر کے ٹکڑے نے پھر اس کے خیالوں میں ہل چل ڈال دی۔ مستقبل کے متعلق طرح طرح کے خوش آئند خیالات ہر روز اس کے دماغ یں چکر لگانے لگے۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، دفتر جاتے، دفتر سے آتے، کوٹھیوں کے باہر لوگوں کے نام کے بورڈ دیکھ کر، یہاں تک کہ جب مہینا ختم ہوا اور اسے تنخواہ ملی تو اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس سنگ مرمر کے ٹکڑے کو شہر کے ایک مشہور سنگ تراش کے پاس لے گیا جس نے بہت چابکدستی سے اس پر اس کا نام کندہ کر کے کونوں میں چھوٹی چھوٹی خوش نما بیلیں بنا دیں۔

اس سنگِ مرمر کے ٹکڑے پر اپنا نام کھدا ہوا دیکھ کر اسے ایک عجیب سی خوشی ہوئی۔ زندگی میں شاید یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اپنا نام اس قدر جلی حروف میں لکھا ہوا دیکھا ہو۔

سنگ تراش کی دکان سے روانہ ہوا تو بازار میں کئی مرتبہ اس کا جی چاہا کہ کتبے پر سے اس اخبار کو اتار ڈالے جس میں سنگ تراش نے اسے لپیٹ دیا تھا اور اس پر ایک نظر اور ڈال لے۔ مگر ہر بار ایک نامعلوم حجاب جیسے اس کا ہاتھ پکڑ لیتا۔ شاید وہ راہ چلتوں کی نگاہوں سے ڈرتا تھا کہ کہیں وہ اس کتبے کو دیکھ کر اس کے ان خیالات کو نہ بھانپ جائیں جو پچھلے کئی دنوں سے اس کے دماغ پر مسلّط تھے۔

گھر کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی اس نے اخبار اتار پھینکا اور نظریں کتبے کی دلکش تحریر پر گاڑے، دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ بالائی منزل میں اپنے مکان کے دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ جیب سے چابی نکالی۔ قفل کھولنے لگا۔ پچھلے دو برس میں آج پہلی مرتبہ اس پر یہ انکشاف ہوا کہ اس کے مکان کے دروازے کے باہر ایسی کوئی جگہ ہی نہیں کہ اس پر کوئی بورڈ لگایا جا سکے۔ اگر جگہ ہوتی بھی تو اس قسم کے کتبے وہاں تھوڑا ہی لگائے جاتے ہیں۔ ان کے لیے تو بڑا

سا مکان چاہیے جس کے پھاٹک کے باہر لگایا جائے تو آتے جاتے کی نظر بھی پڑے۔۔

قفل کھول کر مکان کے اندر پہنچا اور سوچنے لگا کہ فی الحال اس کتبے کو کہاں رکھوں ۔ اس کے حصہ مکان میں دو کوٹھڑیاں ایک غسل خانہ اور ایک باورچی خانہ تھا۔ الماری صرف ایک ہی کوٹھڑی میں تھی مگر اس کے کواڑ نہیں تھے۔ بالآخر اس نے کتبے کو اسی بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا۔

ہر روز شام کو جب وہ دفتر سے تھکا ہارا واپس آتا تو سب سے پہلے اس کی نظر اس کتبے ہی پر پڑتی۔ امیدیں اسے سبز باغ دکھاتیں اور دفتر کی مشقّت کی تکان کسی قدر کم ہو جاتی۔ دفتر میں جب کبھی اس کا کوئی ساتھی کسی معاملے میں اس کی راہنمائی کا جویا ہوتا تو اپنی برتری کے احساس سے اس کی آنکھیں چمک اٹھتیں۔ جب کبھی کسی ساتھی کی ترقی کی خبر سنتا آرزوئیں اس کے سینے میں ہیجان پیدا کر دیتیں۔ افسر کی ایک ایک نگاہِ لطف و کرم کا نشہ اسے آٹھ آٹھ دن رہتا۔

جب تک اس کے بیوی بچے نہیں آئے وہ اپنے خیالوں ہی میں مگن رہا۔ نہ دوستوں سے ملتا، نہ کھیل تماشوں میں حصہ لیتا، رات کو جلد ہی ہوٹل سے کھانا کھا کر گھر آجاتا اور سونے سے پہلے گھنٹوں عجیب عجیب خیالی دنیاؤں میں رہتا۔ مگر ان کے آنے کی دیر تھی کہ نہ تو وہ فراغت ہی رہی اور نہ وہ سکون ہی ملا۔ ایک بار پھر گرہستی کے فکروں نے اسے ایسا گھیر لیا کہ مستقبل کی یہ سہانی تصویریں رفتہ رفتہ دھندلی پڑ گئیں۔

کتبہ سال بھر تک اسی بے کواڑ کی الماری میں پڑا رہا۔ اس عرصے میں اس نے نہایت محنت سے کام کیا۔ اپنے افسروں کو خوش رکھنے کی انتہائی کوشش کی مگر اس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔

اب اس کے بیٹے کی عمر چار برس کی ہو گئی تھی اور اس کا ہاتھ اس بے کواڑ کی الماری تک بخوبی پہنچ جاتا تھا۔ شریف حسین نے اس خیال سے کہ کہیں اس

کا بٹا کتبے کو گرا نہ دے اسے وہاں سے اٹھا لیا اور اپنے صندوق میں کپڑوں کے نیچے رکھ دیا۔

ساری سردیاں یہ کتبہ اس صندوق ہی میں پڑا رہا۔ جب گرمی کا موسم آیا تو اس کی بیوی کو گرم کپڑے رکھنے کے لیے اس کے صندوق میں سے فالتو چیزوں کو نکالنا پڑا۔ چنانچہ دوسری چیزوں کے ساتھ بیوی نے کتبہ بھی نکال کر کاٹھ کے اس پرانے بکس میں ڈال دیا جس میں ٹوٹے ہوئے چوکھٹے، بے بال کے برش، بیکار صابن دانیاں، ٹوٹے ہوئے کھلونے اور ایسی ہی اور دوسری چیزیں پڑی رہتی تھیں۔

شریف حسین نے اب اپنے مستقبل کے متعلق زیادہ سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ دفتروں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر وہ اس نتیجہ پر پہنچ گیا تھا کہ ترقی لطیفۂ غیبی سے نصیب ہوتی ہے، کڑی محنت جھیلنے اور جان کھپانے سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ اس کی تنخواہ میں ہر دوسرے برس تین روپے کا اضافہ ہو جاتا جس سے بچوں کی تعلیم وغیرہ کا خرچ نکل آتا اور اسے زیادہ تنگی نہ اٹھانا پڑتی۔

پے در پے مایوسیوں کے بعد جب اس کو ملازمت کرتے بارہ برس ہو چکے تھے اور اس کے دل سے رفتہ رفتہ ترقی کے تمام ولولے نکل چکے تھے اور کتبے کی یاد تک ذہن سے محو ہو چکی تھی تو اس کے افسروں نے اس کی دیانت داری اور پرانی کارگزاری کا خیال کر کے اسے تین مہینے کے لیے عارضی طور پر درجہ اول کے ایک کلرک کی جگہ دے دی جو چھٹی جانا چاہتا تھا۔

جس روز اسے یہ عہدہ ملا اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس نے تانگے کا بھی انتظار نہ کیا بلکہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا پیدل ہی بیوی کو یہ مُژدہ سنانے چل دیا۔ شاید تانگہ اسے کچھ زیادہ جلدی گھر نہ پہنچا سکتا!

اگلے مہینے اس نے نیلام گھر سے ایک سَستی سی لکھنے کی میز اور ایک گھومنے والی کرسی خریدی۔ میز کے آتے ہی اسے پھر کتبے کی یاد آئی اور اس کے

ساتھ ہی اس کی سوئی ہوئی امنگیں جاگ اٹھیں۔ اس نے ڈھونڈ ڈھانڈ کے کاٹھ کی پیٹی میں سے کتبہ نکالا، صابن سے دھویا، پونچھا اور دیوار کے سہارے میز پر ٹکا دیا۔

یہ زمانہ اس کے لیے بہت کٹھن تھا کیونکہ وہ اپنے افسروں کو اپنی بر تر کارگزاری دکھانے کے لیے چھٹی پر گئے ہوئے کلرک سے دگنا کام کرتا۔ اپنے ماتحتوں کو خوش رکھنے کے لیے بہت سا ان کا کام بھی کر دیتا۔ گھر پر آدھی رات تک فائلوں میں غرق رہتا۔ پھر بھی وہ خوش تھا۔ ہاں جب کبھی اسے اس کلرک کی واپسی کا خیال آتا تو اس کا دل بجھ سا جاتا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا، ممکن ہے وہ اپنی چھٹی کی میعاد بڑھوا لے ---- ممکن ہے وہ بیمار پڑ جائے ---- ممکن ہے وہ کبھی نہ آئے ----

مگر جب تین مہینے گزرے تو نہ تو اس کلرک نے چھٹی کی میعاد ہی بڑھوائی اور نہ بیمار ہی پڑا۔ البتہ شریف حسین کو اپنی پرانی جگہ پر آ جانا پڑا۔

اس کے بعد جو دن گزرے وہ اس کے لیے بڑی مایوسی اور افسردگی کے تھے۔ تھوڑی سی خوش حالی کی جھلک دیکھ لینے کے بعد اب اسے اپنی حالت پہلے سے بھی زیادہ ابتر معلوم ہونے لگی تھی۔ اس کا جی کام میں مطلق نہ لگتا تھا۔ مزاج میں آلکس اور حرکات میں سستی سی پیدا ہونے لگی۔ ہر وقت بیزار بیزار سا رہتا۔ نہ کبھی ہنستا، نہ کسی سے بولتا چالتا۔ مگر یہ کیفیت چند دن سے زیادہ نہ رہی۔ افسروں کے تیور اسے جلد ہی راہ راست پر لے آئے۔

اب اس کا بڑا لڑکا چھٹی میں پڑھتا تھا اور چھوٹا چوتھی میں اور منجھلی لڑکی ماں سے قرآن مجید پڑھتی، سینا پرونا سیکھتی اور گھر کے کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹاتی۔ باپ کی میز کرسی پر بڑے لڑکے نے قبضہ جما لیا۔ وہاں بیٹھ کر وہ سکول کا کام کیا کرتا۔ چونکہ میز کے ہلنے سے کتبہ گر جانے کا خدشہ رہتا تھا اور پھر اس نے میز کی بہت سی جگہ بھی گھیر رکھی تھی اس لیے لڑکے نے اسے اٹھا کر پھر اسی بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا۔

سال پر سال گزرتے گئے۔ اس عرصے میں کتبے نے کئی جگہیں بدلیں۔ کبھی بے کواڑ کی الماری میں تو کبھی میز پر۔ کبھی صندوقوں کے اوپر تو کبھی چارپائی کے نیچے۔ کبھی بوری میں تو کبھی کاٹھ کے بکس میں۔ ایک دفعہ کسی نے اٹھا کر باورچی خانے کے اس بڑے طاق میں رکھ دیا جس میں روز مرہ کے استعمال کے برتن رکھے رہتے تھے۔ شریف حسین کی نظر پڑ گئی۔ دیکھا تو دھوئیں سے اس کا سفید رنگ پیلا پڑ چلا تھا۔ اٹھا کر دھویا، پونچھا اور پھر بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا۔ مگر چند ہی روز میں اسے پھر غائب کر دیا گیا اور اس کی جگہ وہاں کاغذی پھولوں کے بڑے بڑے گملے رکھ دیے گئے جو شریف حسین کے بڑے بیٹے کے کسی دوست نے اسے تحفے میں دیے تھے۔ رنگ پیلا پڑ جانے سے کتبہ الماری میں رکھا ہوا بد نما معلوم ہوتا تھا۔ مگر اب کاغذی پھولوں کے سرخ سرخ رنگوں سے الماری میں جیسے جان پڑ گئی تھی اور ساری کوٹھڑی دہک اٹھی تھی۔

اب شریف حسین کو ملازم ہوئے پورے بیس سال گزر چکے تھے۔ اس کے سر کے بال نصف سے زیادہ سفید ہو چکے تھے اور پیٹھ میں گدی سے ذرا نیچے خم آ گیا تھا۔ اب بھی کبھی کبھی اس کے دماغ میں خوشحالی و فارغ البالی کے خیالات چکر لگاتے مگر اب ان کی کیفیت پہلے کی سی نہ تھی کہ خواہ وہ کوئی کام کر رہا ہو تصورات کا ایک تسلسل ہے کہ پہروں ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اب اکثر اوقات ایک آہ دم بھر میں ان تصورات کو اڑا لے جاتی اور پھر بیٹی کی شادی، لڑکوں کی تعلیم، اس کے بڑھتے ہوئے اخراجات پھر ساتھ ہی ساتھ ان کے لیے نوکریوں کی تلاش —— یہ ایسی فکریں نہ تھیں کہ پل بھر کو بھی اس کے خیال کو کسی اور طرف بھٹکنے دیتیں۔

پچپن برس کی عمر میں اسے پنشن مل گئی۔ اب اس کا بڑا بیٹا ریل کے مال گودام میں کام کرتا تھا۔ چھوٹا کسی دفتر میں ٹائپسٹ تھا اور اس سے چھوٹا انٹرنس میں پڑھتا تھا۔ اپنی پنشن اور لڑکوں کی تنخواہیں سب مل ملا کے کوئی ڈیڑھ سو روپے ماہوار کے لگ بھگ آمدنی ہو جاتی تھی جس میں بخوبی گزر ہونے لگی تھی۔ علاوہ ازیں اس

کا ارادہ کوئی چھوٹا موٹا بیوپار شروع کرنے کا بھی تھا مگر مندے کے ڈر سے ابھی پوارنہ ہو سکا تھا۔

اپنی کفایت شعاری اور بیوی کی سلیقہ مندی کی بدولت اس نے بڑے بیٹے اور بیٹی کی شادیاں خاصی دھوم دھام سے کر دی تھیں۔ ان ضروری کاموں سے نمٹ کر اس کے جی میں آئی کہ حج کر آئے مگر اس کی توفیق نہ ہو سکی۔ البتہ کچھ دنوں مسجدوں کی رونق خوب بڑھائی۔ مگر پھر جلد ہی بڑھاپے کی کمزوریوں اور بیماریوں نے دبانا شروع کر دیا اور زیادہ تر چارپائی ہی پر پڑا رہنے لگا۔

جب اسے پنشن وصول کرتے تین سال گزر گئے تو جاڑے کی ایک رات کو وہ کسی کام سے بستر سے اٹھا۔ گرم گرم لحاف سے نکلا تھا، پچھلے پہر کی سرد اور تند ہوا تیر کی طرح اس کے سینے میں لگی اور اسے نمونیا ہو گیا۔ بیٹوں نے اس کے بہتیرے علاج معالجے کرائے۔ اس کی بیوی اور بہو دن رات اس کی پٹی سے لگی بیٹھی رہیں۔ مگر افاقہ نہ ہوا اور وہ کوئی چار دن بستر پر پڑے رہنے کے بعد مر گیا۔

اس کی موت کے بعد اس کا بڑا بیٹا مکان کی صفائی کر رہا تھا کہ پرانے اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے ایک بوری میں سے اسے یہ کتبہ مل گیا۔ بیٹے کو باپ سے بے حد محبت تھی۔ کتبے پر باپ کا نام دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے اور وہ دیر تک ایک محویت کے عالم میں اس کی خطّاطی اور نقش و نگار کو دیکھتا رہا۔ اچانک اسے ایک بات سوجھی جس نے اس کی آنکھوں میں چمک پیدا کر دی۔

اگلے روز وہ کتبے کو ایک سنگ تراش کے پاس لے گیا اور اس سے کتبے کی عبارت میں تھوڑی سی ترمیم کرائی اور پھر اسی شام اسے اپنے باپ کی قبر پر نصب کر دیا۔

(آنندی از غلام عباس)

سوالات

۱۔ شریف حسین اس دن گھر کی بجائے شہر کی جامع مسجد کی طرف کیوں چل پڑا ؟

۲۔ اس کہانی سے آپ جو اخلاقی نتیجہ اخذ کرتے ہیں ، اسے بیان کیجیے۔

۳۔ کہانی کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیں۔

۴۔ مندرجہ ذیل جملوں کی تکمیل کے لیے نیچے دیے ہوئے جوابات میں سے درست جواب منتخب کیجیے اور اس کا حرفی نمبر جوابی کالم میں درج کیجیے :۔

جوابی کالم

(i) شریف حسین کو سنگِ مرمر کا ٹکڑا ـــــــ

(الف) راستے میں پڑا ہوا ملا۔

(ب) ایک دوست نے تحفے کے طور پر دیا۔

(ج) کباڑی کی دکان سے ملا۔

(د) وراثت میں ملا۔

(ii) شریف حسین نے سنگِ مرمر کا ٹکڑا اس لیے خریدا کہ ـــــــ

(الف) وہ اسے اپنے گھر کے دروازے پر نصب کرانا چاہتا تھا۔

(ب) اس کی بیوی نے اس کی فرمائش کی تھی۔

(ج) اس کے دام کم تھے۔

(د) قیمت پوچھنے پر کباڑی اس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔

(iii) سنگِ مرمر کے ٹکڑے کا جو مَصرَف شریف حسین کے ذہن میں آیا تھا، وہ یہ تھا کہ ـــــــ

(الف) اسے مطالعے کی میز پر رکھ دے۔

جوابی کالم

(ب) اسے کارنس پر سجا دے۔
(ج) اس پر اپنا نام کندہ کرا کے مکان کے دروازے پر نصب کر دے۔
(د) اپنے افسر کو تحفے کے طور پر پیش کرے۔

(iv) شریف حسین کی موت کے بعد سنگ مرمر کا ٹکڑا ــــــ

(الف) بے کار پڑا رہا۔
(ب) اس کی قبر پر نصب ہوا۔
(ج) گم ہو گیا۔
(د) کباڑی کے ہاں بیچ دیا گیا۔

۵۔ مندرجہ ذیل تراکیب و محاورات کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:۔

خس و خاشاک ۔ وضع قطع ۔ جہاں دیدہ ۔ گھاگ ۔ سعی لا حاصل ۔ پٹی سے لگا رہنا۔ افاقہ ہونا۔

اسمِ ضمیر وہ اسم ہے جو کسی شخص یا چیز کے نام کی بجائے استعمال کیا جائے مثلاً وہ ۔ ہم ۔ اس وغیرہ۔

اسمِ اشارہ وہ اسم ہے جو کسی شخص یا چیز کی طرف اشارہ کرنے کے لیے استعمال کیا جائے مثلاً یہ کتاب اور وہ مکان میں "یہ" اور "وہ" اسمائے اشارہ ہیں۔

اسمِ مَوصُول وہ اسم ہے کہ جب تک اس کے ساتھ کوئی جملہ نہ ملایا جائے، ناتمام رہتا ہے اور کوئی معنیٰ نہیں دیتا مثلاً جو محنت کرتا ہے کامیاب ہوتا ہے۔ اس جملے میں "جو" اسمِ موصول ہے۔

۶۔ مندرجہ ذیل جملوں سے اسمِ ضمیر، اسمِ اشارہ اور اسمِ مَوصُول تلاش کیجیے:۔

(الف) شریف حسین کلرک اس بڑے پھاٹک کے باہر آکر کھڑا ہو گیا، جہاں سے تانگے والے شہر کی سواریاں لے جایا کرتے تھے۔

(ب) آج خلاف معمول تنخواہ کے آٹھ روز بعد بھی اس کی جیب میں پانچ روپے کا نوٹ اور کچھ آنے پیسے پڑے تھے۔

(ج) گھر میں وہ اکیلا رہ گیا تھا۔

(د) گھر میں کچھ ایسا اثاثہ نہیں تھا کہ جس کی رکھوالی کرنی پڑتی۔

۷۔ اس سبق سے پانچ ایسے الفاظ تلاش کیجیے جن میں سابقے استعمال ہوئے ہیں مثلاً "پُر فضا" اور "بے شمار" میں "پُر" اور "بے" سابقے ہیں۔

۸۔ جملوں میں استعمال کر کے واضح کیجیے کہ مندرجہ ذیل الفاظ میں مذکر کون سے ہیں اور مؤنث کون سے :۔

تصویر۔ مَصرف۔ بھول۔ جی۔ پنشن۔ وضع۔

۹۔ کالم I میں کچھ الفاظ درج ہیں۔ کالم II میں قواعد کی اصطلاحات رقم ہیں۔ آپ جوابی کالم میں حرفی نمبر کی مدد سے بتائیے کہ یہ الفاظ قواعد کی رُو سے کیا ہیں؟

کالم I	کالم II	جوابی کالم
۱۔ شریف حسین	(الف) اسمِ فاعل	
۲۔ پرونا	(ب) اسمِ آلہ	
۳۔ چابی	(ج) اسمِ موصول	
۴۔ وہ	(د) اسمِ مصدر	
۵۔ بیچنے والا	(ہ) اسمِ معرفہ	
۶۔ جس	(و) اسمِ ضمیر	

صادِقہ کی مصیبت

انعام غریب کو روٹی تو کیا خاک نصیب ہوتی، یہ بھی غنیمت تھا کہ لیٹ جانے کی مہلت مل گئی۔ سوچا یہ تھا کہ چودہ گھنٹے کی رات صاف آنکھوں میں نکل گئی، ایسا نہ ہو بیمار پڑ جاؤں۔ آنکھ لگ جائے گی تو گھنٹا دو گھنٹے آرام کر لوں گا مگر نیند کہاں! صبح کا سہم سر پر سوار تھا۔ ایک کندھے پر پیر جی اور ان کا لباس، دوسرے پر بیوی اور ساس ۔ اس ادھیڑ بن میں صبح ہو گئی تو پہلا مرحلہ ناشتے کا تھا، وہ طے کیا۔ کھانے کا انتظام رات ہی کو کر لیا تھا مگر سات بجے تک جوڑے کے دو تقاضے آ چکے تھے۔ دکانیں بھی نہ کھلی تھیں کہ جا پہنچا۔ لوٹتا تھا کہ راستے میں چچا زاد بہن صادِقہ کا گھر پڑا۔

صادقہ کہنے کو بچی، دیکھنے میں لڑکی اور ظاہر میں کم سِن نا تجربہ کار تھی مگر قدرت کی زبردست طاقت کا جلوہ اس کی ہستی میں جھلک رہا تھا۔ بڑے باپ کی بیٹی تھی، اونچے گھر میں بیاہی گئی۔ ماں باپ کی چہیتی تھی، ساس سسروں کی عزیز ہوئی۔ میکے کی سرتاج تھی، سسرال میں راج کیا۔ تین ساڑھے تین سال شاندار زندگی بسر کرنے کے بعد پے درپے کچھ ایسے اتفاقات پیش آئے کہ وہ بات تو درکنار، دانت کریدنے کو تنکا تک نہ رہا۔ انعام کو علم نہ تھا کہ ایک گھر پر حکومت اور خاندان پر سلطنت کرنے والی بیگم آج دو دو دانوں کو محتاج ہے۔ گھر جا کر آواز دی تو معلوم ہوا گلی میں رہتی ہے۔ وہاں گیا تو ٹوٹی ہوئی کچی دیواریں اور پرانے کواڑ مصیبت ماری بہن کی غربت کا پتا دے رہے تھے۔

کنڈی کھنکھٹائی تو ایک عورت نے دراڑوں میں آ کر جھانکا اور کہا: ”اندر آجاؤ“ اندر گیا تو عجیب سماں تھا۔ ماں باپ کی پیاری اور سسرال کی راج دلاری اس ٹوٹے ہوئے کھنڈر میں زندگی بسر کر رہی تھی۔ میلے چیکٹ کپڑے، جا بجا پیوند، بدن پر

تھے۔ چاروں طرف سے دوپٹے کو سمیٹ کر اوڑھا کہ پاجامے کے پیوند ظاہر نہ ہوں اور سلام کو جھک گئی۔ انعام نے تین برس بعد صادقہ کو دیکھا تھا اس کا اگلا دور دورہ اور عُروج آنکھوں کے سامنے تھا۔ کل کی بات تھی کہ گوندنی کی طرح زیور میں لدی، اعلیٰ اور نفیس لباس پہنے، تین تین چار چار مامائیں آگے، راج کر رہی تھی۔ آج وہ سماں کوسوں نہ تھا اور اس عیش کی یادگار صرف وہ دیکھنے والے باقی رہ گئے تھے جنھوں نے انقلاب کی اس تصویر کا اقبال اس طرح پامال ہوتے دیکھا۔

دو پونے دو برس کا ایک بچہ گود میں تھا اور یہ ننھی سی جان خدا کی شان یاد دلا رہی تھی کہ جس کی پیدائش پر بیسیوں جوڑے غرباء کو تقسیم ہوئے، اب کڑکڑاتے جاڑوں میں صرف آفتاب اس کے جسم کو سردی سے بچاتا۔ چاہتی تھی کہ پان بنا کر بھائی کو دوں مگر خیال آیا کہ خود ہی شام سے خالی زردہ کھا رہی ہوں۔ پٹاری میں پان اللہ کا نام ہے۔ اس وقت صادقہ کی عجب حالت تھی۔ ندامت کے مارے زمین پر گڑی جاتی تھی۔ آنکھیں نیچی، زبان بند، ہاتھ پاؤں ساکت۔ ایک بے جان جسم تھا جو سامنے کھڑا تھا۔ دو تین لمحے یہی حالت طاری رہی اور پھر انعام نے کہا:
"یہ تمھاری حالت میں کیا انقلاب ہو گیا؟ سید صاحب کہاں ہیں؟"

صادقہ : ان کا انتقال ہو گیا۔ مقروض تھے، جو کچھ چھوڑا سب قرض میں چلا گیا۔

انعام : مجھے تو اس کا علم ہی نہیں!

صادقہ : اپنی اپنی پریشانیوں میں سب گرفتار رہتے ہیں۔ کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ دوسروں کی پریشانیاں معلوم کرے۔ آپ کے ہاں سب خیریت ہے؟

انعام : ہاں خدا کا شکر ہے۔ آج تمھاری بھابی جان کی گود بھرائی ہے۔ تمھیں لینے آیا ہوں۔

صادقہ : خدا مبارک کرے! میں نہایت خوشی سے چلتی لیکن اب میں اس قابل نہیں رہی۔ اتنا کہہ کر صادقہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مگر ضبط کیا اور کہنے لگی: "ان شاء اللہ اور کسی موقع پر شرکت کی کوشش کروں گی"۔

انعام : میرا جی چاہتا ہے کہ تم آج ہی شریک ہو۔ تھوڑی دیر کے لیے چلی چلو۔ ایسا ہی ہے تو شام کو چلی آنا۔

صادقہ : دیر کا خیال نہیں ہے۔ کچھ اور سبب ہیں جن کی وجہ سے میں آج اس وقت مجبور ہوں۔

انعام : تم یقین کرو تمھاری شرکت سے مجھے بے حد خوشی ہو گی اور تمھارا انکار مجھے اس مسرت سے محروم کرتا ہے جس کی میں تم سے توقع رکھتا ہوں۔

صادقہ : آپ کو معلوم ہے میری صداقت ہمیشہ کنبہ بھر میں مشہور تھی۔ ابا جان کی یہ وصیت آج تک میرے دم کے ساتھ ہے۔ جس شخص نے عمر بھر کی رفاقت کا وعدہ اور ہمیشہ ہمیشہ کی نباہ کا اقرار کیا تھا، اس کی مفارقت میری تمام امیدوں کو ختم کر گئی۔ خدا اس کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے! میرے دل میں اب کوئی ارمان باقی نہیں۔ ہاں میرے چلنے سے اگر آپ کو خوشی میسر آ سکتی ہے۔ تو میں بسر و چشم حاضر ہوں۔ جس طرح بیٹھی ہوں چلی چلوں گی مگر انعام بھائی! تمھارے سسرال کے لوگ بھرے ہوں گے۔ میرے اس طرح چلنے سے آپ کی بے عزتی ہو گی۔ میرا خیال نہ کیجئے۔ آپ اپنی عزت اور بے عزتی کو سوچ لیجیے۔

انعام : زیور اور لباس عورت کی ذات ، تموّل اور دولت انسان کے واسطے وجہ عزت نہیں۔ تم تمام خاندان کے واسطے مایہ ناز ہو کہ باپ دادا کی لاج اور بڑوں کی آن بان لیے بیٹھی عزت آبرو سے زندگی بسر کر رہی ہو۔ میں ڈولی لاتا ہوں۔ تمہارے چلنے سے ہمارا گھر منور ہو جائے گا اور یہ چھوٹی سی شادی یقیناً تم جیسی خاتون کی شرکت پر فخر کرے گی۔

صادقہ اپنے بوسیدہ مکان سے چل کر بھائی کے ہاں پہنچی تو کیا دیکھتی ہے کہ عالی شان محل سرا بیویوں سے کھچا کھچ بھری ہے۔ سونے چاندی کے زیور گوٹے لپے کے کپڑے چاروں طرف جگمگا رہے ہیں۔ ظاہری ٹیپ ٹاپ اور زرق برق پوشاکوں نے گھر بھر کی رونق دوبالا کر دی ہے۔ صادقہ اس آرائشِ ظاہری سے قطعاً محروم تھی مگر اس کا دل مسرت حقیقی سے لبریز اور دل عارضی جلووں پر ہنس رہا تھا۔ بھاوج کی طرف سلام کرنے کو چلی مگر کپڑے میلے تھے۔ جواب تو مل گیا لیکن گلے کوئی نہ ملا۔ بچے کو لیے باہر انگنائی میں ایک پرانے تخت پر بیٹھ گئی۔ کھانے کا وقت آیا تو کیسی خاطر اور کس کی مدارات، کسی نے جھوٹوں بھی بات نہ پوچھی۔

دن بھر مارا مار پیرجی کا جوڑا تیار ہوا۔ شام کو گود بھرائی ہوئی۔ ہاجرہ کی چار سال کی بھانجی کے دونوں دہکتے ہوئے سونے کے کڑے کسی نے صاف تیر کر دیے۔ گھر بھر میں ڈھنڈیا مچ گئی۔ کونہ کونہ اور چپہ چپہ دیکھ ڈالا مگر بیس تولے کے کڑے سوئی تھوڑی ہی تھے کہ چھپ جاتے۔ دفعتہً پیرجی کی آمد کا غُلغلہ بلند ہوا تو سب بیویاں جدھر جس کا منہ اٹھا، کونے کھدروں میں جا گھسیں۔ پیرجی آئے تو دسترخوان بچھنے کی تیاریاں ہوئیں لیکن انھوں نے منظور نہ کیا اور کہا: "میں تو صرف آدھی رات کو ایک ٹکیا جوار کی کھاتا ہوں۔ تم لوگوں کا اِصرار تھا، اس لیے آگیا۔"

ہاجرہ کی ماں : ہمارا تو منہ نہیں کہ حضور کا شکریہ ادا کریں۔ آپ ہی کی جوتیوں

کا صدقہ ہے کہ خدا نے یہ دن دکھایا۔ ہم تو نا امید ہو چکے تھے۔ اب دیا ہے تو عمر کا دیجیے گا۔ چراغ کا جو حضور نے حکم دیا تھا جلا دیا ہے۔

پیر جی : سب دیکھ لی جائے گی۔ تم لوگ پہلے تو احتیاط کرتے نہیں، ہمیشہ ہم کو ستاتے ہو۔ ہم کو ہاجرہ کے علاج میں بہت دِقّت ہوئی۔ بڑی مشکل سے ظالم قبضہ میں آیا ہے۔

ہاجرہ کی ماں : خدا حضور کی عمر دراز کرے! ہماری تو اگر کھال کی جوتیاں بھی حضور پہنیں تو عذر نہیں۔ یہ کپڑے حضور کے لائق تو نہیں ہیں مگر ہمارا دل بڑھ جائے گا۔

پیر جی : اچھا! اگر تمھاری یہی خوشی ہے تو خیر۔ کسی نہ کسی کے کام آ ہی جائیں گے۔

ہاجرہ کی ماں : حضور! آج ایک اور واردات ہو گئی۔ ابھی ابھی حضور کے آنے سے ذرا پہلے کسی کم بخت نے بچی کے کپڑے اتار لیے۔ کسی نے کیا، ہم کو خود اچھی طرح معلوم ہے۔ اب حضور وہ نکلوا دیں۔

پیر جی : (کچھ تأمُّل کے بعد) ابھی تو کپڑے اس کے پاس موجود ہیں۔ اس سے کہ دو اگر ہنسی خوشی نہ دے گی، تہس نہس کر دوں گا۔ کیوں تم ایسے چوروں کو گھر میں گھسنے دیتے ہو؟

ہاجرہ کی ماں : حضور! سگے چچا کی بیٹی ہے، اس لیے بلا لیا تھا۔ صادقہ! ارے صادقہ! یہاں تو آ۔ حضور فرما رہے ہیں کہ اگر سیدھی طرح

کڑے نہ دیے تو غارت کر دوں گا۔

پیر جی : ایک کوری بدھنی پانی بھر کر لاؤ۔ کاغذ، قلم دوات دو اور سب مہمانوں کے نام لکھوا دو۔ میں ابھی چور کا نام نکال دیتا ہوں۔

پانی بھری ہوئی بدھنی ایک طرف سے پیر جی نے دوسری طرف سے انعام نے انگلی پر رکھی اور پیر جی کچھ پڑھتے گئے۔ ٹونٹی میں ایک ایک کر کے ناموں کے پرزے ڈالتے جاتے تھے۔ پھر ایک نام پر بدھنی نے گردش کی۔ پرزہ نکال کر دیکھا تو صادقہ کا نام تھا۔ پیرجی کی فال اور کچھ چوری چھپے نہیں سب کے روبرو اور ہر ایک کے سامنے۔ اب صادقہ کو چور سمجھنے میں کیا کسر رہ گئی تھی۔ یقین کامل ہو گیا۔ اپنے اپنے طور پر سمجھا کر بجھا کر، ڈانٹ کر، ڈپٹ کر، غصے سے، پیار سے، جس سے جس طرح ہو سکا، کڑوں کے نکلوانے کی کوشش کی۔ جب کامیابی نہ ہوئی تو خود انعام نے کہا: "صادقہ! دو چار روپیہ کا مال ہوتا تو مضائقہ نہ تھا۔ چار سو کے کڑے ہضم کر لینے آسان بات نہیں ہے۔ میں خدا سے ڈر کر اور تم پر رحم کھا کر لایا تھا۔ یہ خبر نہ تھی کہ تم اللہ کی عنایت سے سب گنوں پوری ہو اور ایسا کلیجے میں ہاتھ ڈالو گی کہ سب تڑپتے ہی رہ جائیں گے۔ اتنا کچھ کہا جا رہا ہے اور تم پر خاک اثر نہیں ہوتا۔ یہ میں جانتا ہوں کہ کچی نہیں، دھاڑی چور ہو۔ پہلا موقع نہیں کہ ڈرانے میں آجاؤ گی مگر یاد رکھو میں بھی داروغہ[1] ہوں کہ دم بھر میں اگلوا لوں گا۔ ابھی تو منہ سے کہہ رہا ہوں۔ پھر تم جانتی ہو، میرا غصہ کیسا ہے اب بھی کچھ نہیں گیا۔ کسی بہانے سے اِدھر اُدھر ڈال دو۔ آئندہ تم کو اختیار ہے۔

صادقہ کو اس وقت دین و دنیا کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔ اس کی آنکھیں نیچی تھیں جن سے زار و قطار آنسو بہ رہے تھے اس کی گود میں بچہ تھا جو بے خبر پڑا سوتا تھا۔ وہ ساکت تھی، خاموش تھی اور بس نہیں چلتا تھا کہ زمین میں گڑ جائے۔ سیکڑوں

۱۔ انعام نمک کے محکمے میں داروغہ تھا۔

بیویوں کی نگاہیں اس کے چہرے پر تھیں۔ اس کی حالت ظاہری، اس کے میلے کچیلے کپڑے، اس کا افلاس و مصیبت چوری کا پورا یقین دلا رہے تھے۔ اس کے دل میں رہ رہ کر جوش اٹھتا تھا اور وہ سوچتی تھی اب اس سے زیادہ نازک وقت اور مصیبت کا دن کیا ہو گا۔ شوہر گیا، دولت گئی، چین گیا، آرام گیا۔ پہننے کو چیتھڑا نہ رہا، رہنے کو جھگی نہ رہی۔ ماں باپ ساس سسرے سب رخصت ہوئے۔ ایک تھوڑی سی آبرو باقی تھی، آج وہ بھی چلی۔ جو لوگ عیش کرتے دیکھتے تھے، جن آنکھوں نے گھر والی اور بااختیار دیکھا تھا، اب ان کے سامنے چور بنی کھڑی ہوں۔ اللہ اللہ کیسا درد انگیز سماں ہے

دفعتہً اس نے آنکھ اوپر اٹھائی۔ انعام کی طرف دیکھا اور کہا "کچھ شک نہیں خدا نے آپ سب کو عزت دی ہے، میں اس وقت اس سے محروم ہوں۔ میری بابت جو کچھ کہا جائے، ٹھیک ہے۔ میں مفلس ہوں، مجھ پر الزام لگ سکتا ہے۔ بے وارثی ہوں، جس کا جو جی چاہے، کہہ لے۔ آپ کے گھر پر ہوں، جو کچھ سنوں درست۔ آپ کے قبضے میں ہوں، جو کچھ کہا جائے ٹھیک مگر وہ بدنصیب جس نے خدا سے کیا، کسی بندے سے بھی جھوٹ نہ بولا، تم کو یقین دلاتی ہے کہ چھٹے پہر کی بھوکی صرف اس کونے میں بیٹھی رہی۔ میں نے تمہاری خوشیاں، تمہاری رسمیں آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھیں۔ تم نے مجھ کو گھر پر بلا کر میری یہ آبرو کی۔ میں بے گناہ ہوں۔ گو! میں اس قابل نہیں ہوں کہ تمہارے برابر بیٹھ سکوں مگر چور نہیں۔ میں نے تمام عمر کبھی قسم نہیں کھائی لیکن! اس وقت کہتی ہوں کہ میری بے گناہی کا شاہد صرف وہ ہے جس کی نگاہ میں میرا افلاس اور تمہارا تموّل دونوں برابر ہیں۔

سب کچھ کھو چکی، میرے سر سے وارث اٹھ گیا، میری جائداد برباد ہوئی، میری کمائی لٹ گئی لیکن عمر بھر کی پونجی، زندگی کا سرمایہ، دنیا کی کل کائنات، صرف یہ ایک معصوم لال میری گود میں ہے۔ تم صاحبِ اولاد ہو، میری مامتا کی قدر کرو۔ میں اس بچے کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہتی ہوں، میں نے تمہارے کڑے نہیں لیے۔ میں

جب سے آئی ہوں، تمہارے گھر سے باہر نہیں نکلی۔ میں تنہا ہوں، میرا بچہ بغیر میری مدد کے چل بھی نہیں سکتا۔ تم میری تلاشی لے لو اور اس جرم کی سزا دے کر کہ جب میں اس لائق نہ رہی تھی تو کیوں تم لوگوں کی خوشی میں شریک ہونے کی خواہش مند ہوئی، مجھ کو گھر سے نکال دو۔ میرے پاس کچھ نہ تھا۔ ہاں یہ تھوڑی سی عزت باقی رہ گئی تھی، وہ یوں ختم ہو گئی۔ باپ دادا کی وقعت، بزرگوں کی آن، شوہر کی لاج، سسرال کی عزت اس وقت مجھ بدنصیب نے گنوا دی۔ میری مصیبت ہمدردی کی محتاج ہے۔ اپنے بچوں کا صدقہ مجھ کو اب زیادہ رسوا نہ کرو۔

اگر تمہارا ظلم صرف میری ذات تک رہتا تو شکایت نہ تھی۔ تم نے اس بے زبان پر، اس ننھی سی جان پر، اس معصوم روح پر ستم توڑا۔ اگر یہ زندہ رہا تو اس کی عمر برباد ہوئی۔ عزیز اس سے نفرت کریں گے، دوست اس پر لعنت بھیجیں گے اور ماں کی چوری اس کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہو گی۔ تم بااختیار ہو، قدرت رکھتے ہو، عزت رکھتے ہو، خدا نے تم کو دولت دی حکومت دی، اطمینان دیا، راحت دی۔ جس نے تم کو یہ خوشی کا دن دکھایا، اسی کا واسطہ دیتی ہوں، میرے درپے نہ ہو۔ میں دنیا کی بدترین مخلوق اور انقلاب کی بہترین تصویر ہوں۔ میرا دل زخمی ہے، میرے زخم ہرے ہیں، میرا کلیجہ چھلنی ہے، میرے داغ تازے ہیں۔ میں بے بس ہوں، بے کس ہوں، دکھیاری مصیبت ماری، میری حالت قابلِ رحم ہے، مجھ پر رحم کرو۔ مالک ہو، مختار ہو، کہ سکتے ہو، کر سکتے ہو۔

مسلمانو! ایمان رکھتے ہو، ایمان کی بولو۔ ایک تو میری بھی حمایت لو۔ میں تم سب کی عنایت و کرم کی محتاج ہوں۔ آج تم میری اعانت کرو، کل ایک زبردست طاقت والا حاکم میدان حشر میں جہاں تم محتاج ہو گے، تم کو مدد دے گا۔ میں بے قصور ہوں۔ میں نے تمہارے کڑے نہیں دیکھے۔ انعام بھائی! میرے وارث شرعی ہو، خدارا مجھ کو بچاؤ، اس مصیبت سے نجات دلواؤ، میری مشکل آسان کرو۔ اللہ تم پر رحم کرے گا۔ میں عہد کرتی ہوں کہ آج کے بعد اب کہیں آنے جانے کا نام نہ لوں

گی۔ مجھ کو ڈولی لا دو، میں چلی جاؤں۔

پیر جی : کیا چاتُر عورت ہے! قینچی کی طرح زبان چل رہی ہے۔ خدا کا کلام جھوٹا، ہم جھوٹے۔ کم بخت! چور! مکار!

جس جس کے منہ میں جو جو کچھ آیا، کہنے اور سنانے میں کمی نہ کی۔ بدنصیب حسرت سے ایک ایک کا منہ تکتی تھی کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ ایمان کی بھی بولے مگر چاروں طرف سے لعنت اور پھٹکار پڑ رہی تھی۔ گیارہ بجے کے قریب نذر نیاز ہو چکی تو پیر جی اپنا جوڑا، نقد روپے اور کھانا لے کر چلتے ہوئے مگر چلتے چلتے اتنا اور کہہ گئے "خدا کی شان ہے، ولیوں کے ہاں بھوت، مولویوں کے ہاں ایسی سپوت لڑکی پیدا ہو جو اچھے اچھے دھاڑیوں کے کان کترے۔ صبح تک راہ دیکھ لو۔ دے دے تو خیر، نہیں تو تھانے دار کے سپرد کر دینا۔"

تھانے دار کا نام سنتے ہی صادقہ تھرّا اٹھی۔ جانتی تھی کہ پیر جی کا حکم ٹل نہیں سکتا۔ صبح ہوتے ہی تھانہ آجائے گا۔ اس بکرے کی طرح جو قصائی کی آبدار چھری سے ڈر کر چاروں طرف چھپنے کی کوشش کرے، تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ہر طرف نگاہ دوڑاتی تھی مگر کوئی ایسا نظر نہ آتا تھا کہ اس آڑے وقت میں کام آجائے۔ پیٹ میں ہول اٹھ رہے تھے۔ اٹھتی تھی، ٹہلتی تھی، سوچتی تھی، بیٹھتی تھی۔ خیال آیا کہ مجھ سے زیادہ بدنصیب، مجھ سے بڑھ کر بے عزت کون ہو گا۔ دنیا کو موت آرہی ہے، کیسے کیسے پیارے آنکھوں کے سامنے سے اٹھ گئے اور میں کم بخت اس دن کو زندہ رہ گئی کہ باپ دادا کی ناک کاٹ دوں۔ تیری شان تجھی کو سزاوار ہے۔ جس کی پالکی میں دہرے پردے پڑیں، دیکھیے اسے تھانے دار کے سامنے برقع بھی نصیب ہوتا ہے یا نہیں۔ اوپر نگاہ اٹھا کر دیکھا تو آسمان کے موتی جگمگا رہے تھے۔ سجدہ میں گری اور گڑگڑا کر کہا "آقا! بدنصیب لونڈی تیرے حضور میں حاضر ہے۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی، دنیا بے خبر ہے مگر تو باخبر، سب سوتے ہیں اور تو جاگتا ہے، صبح قریب ہے اور آرہا ہے وہ وقت جب ایک غیر مرد کا آمنا سامنا اور

نامحرم نگاہیں میرے چہرے پر ہوں گی۔ جس کا پلہ بھی محلہ والوں نے نہ دیکھا، جس کی پرچھائیں تک نوکروں کو دیکھنی نصیب نہ ہوئی، آج دنیا اس کے ساتھ یہ سلوک کرتی ہے۔ اس وقت ظالموں سے بچانے والا کوئی نہیں۔ مولا! تیرے سامنے آئی ہوں، میری فریاد سن۔ دلوں کے حال دیکھنے والے! آنے والا وقت مجھ کو نہ دکھا۔ بچا بچا مولا بچا!

ماں باپوں کی بیٹیاں اور عفتؔ و عصمتؔ کی وہ دیویاں جن کے دامنوں پر فرشتے نماز پڑھیں، زندگی کی کسوٹی پر سونے کی طرح چمکیں اور کندن کی طرح دمکیں۔ صادقہ بے وارثی، محتاج، فقیر سب کچھ بنی مگر اس کے میلے کپڑوں پر مصالحہ دار پوشاکیں قربان، اس کے افلاس پر تمول اور اس کے ننگے بدن[1] پر جڑاؤ جھالے بالے فدا تھے۔ اس کی التجا دکھتے ہوئے دل سے نکلی اور عرش بریں پر پہنچی۔ زخمی دل کی صدا خالی نہیں جاتی۔ یہ تھا یا جو کچھ تھا۔ بھائی کی جانب سے ناامید ہو کر جب حقیقی وارث سے التجا کی تو اس کی دعا قبول ہوئی۔

سجدے میں تھی کہ جی متلایا، قے ہوئی اور ایک تین ہی گھنٹا میں پوری بارہ پہر کی بھوکی مہمان کی حالت بھائی کے در پر خراب ہونی شروع ہو گئی۔ تین بجے کے قریب جب زیادہ طبیعت بگڑی اور ہلنے کی طاقت نہ رہی تو بچے کی مفارقت کا خیال آیا۔ دل نے بے ساختہ صدا دی کہ کلیجے کا ٹکڑا ماں سے ہمیشہ کو چھوٹتا ہے۔ پرورش تو درکنار، کوئی اتنا بھی نہیں کہ سر پر ہاتھ پھیر دے گا۔ کچھ عمر بھی تو نہیں۔ نگوڑا تیسرے ہی سال میں ہے۔ بات بھی تو کرنی نہیں آتی۔ آج اس کی ضدیں اور ہٹیں سب ختم ہوتی ہیں۔ ابھی میرے حواس درست ہیں۔ ایک دفعہ کلیجے سے لگا لوں۔ آمیری جان آ! پیار کی نگاہیں اور محبت بھری نظریں آج ہمیشہ کو بند ہوتی ہیں۔ چھاتی سے لگانے والی ماں اور اس چاند سے مکھڑے پر قربان ہونے والی خدمت گزار رخصت ہوتی ہے۔ لپٹ لوں، لپٹا لوں۔ کوئی اتنا نہیں جس کے ہاتھ میں ہاتھ دوں۔

۱۔ مراد یہ ہے کہ زیوروں سے خالی بدن۔

خیر سب سے بہتر وارث خدا ہے۔ پیاس کی شدت زیادہ ہوئی۔ اٹھنے کا ارادہ کیا۔ جوں توں اٹھی بھی مگر دو ہی قدم چلی تھی کہ چکر آیا اور دھڑ سے گری۔

بیس بائیس برس کے زمانہ قیام کا نتیجہ صرف ایک بچہ تھا جو اس وقت ماں کے پاس تھا۔ اسی کا سہارا لے کر اٹھی اور پھر لیٹی۔ اس کے ننھے ننھے ہاتھ اٹھا کر آنکھوں سے لگائے، پیار کیا، گلے میں ہاتھ ڈال کر زور سے بھینچا۔ کہنے لگی، "الٰہی! زندہ رکھنا ہے تو عزت سے ورنہ بے عزتی کی زندگی سے موت بہتر"۔

مؤذن اذان دے رہا تھا کہ دروازے پر چند آدمیوں کی آواز آئی اور ایک شخص نے باآواز بلند کہا "مولانا! باہر آیئے۔ تھانے دار صاحب آئے ہیں۔ یہ آپ کی ماما کڑے بیچتے ہوئے پکڑی گئی ہے۔"

(طوفانِ حیات از علامہ راشد الخیری)

سوالات

۱۔ اس کہانی کا مرکزی خیال تحریر کیجیے۔

۲۔ صادقہ پر سونے کے کڑوں کی چوری کا شبہہ کیوں کیا گیا؟

۳۔ صادقہ نے اپنی صفائی میں جو باتیں کیں، ان کا خلاصہ لکھیے۔

۴۔ صادقہ نے خدا کے حضور جو دعا مانگی اس کا کیا اثر ہوا؟

۵۔ مندرجہ ذیل بیانات میں سے جو صحیح ہیں، ان کے آگے جوابی کالم میں "ص" اور جو غلط ہیں، ان کے آگے "غ" لکھیے :-

	جوابی کالم
(الف) صادقہ انعام کی سگی بہن تھی۔	
(ب) انعام کو علم نہ تھا کہ صادقہ آج دانے دانے کو محتاج ہے۔	

(ج) انعام نے اصرار کر کے صادقہ کو گود بھرائی کی دعوت میں بلایا۔

(د) انعام کے گھر میں صادقہ کی خوب خاطر مدارات ہوئی

(ہ) بچی کے کڑے صادقہ نے چرائے۔

(و) صادقہ کی غریبی کی وجہ سے اس پر کڑوں کی چوری کا شبہہ کیا گیا۔

(ز) پیر صاحب ایک پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔

(ح) صادقہ نے اللہ کے حضور جو دعا مانگی ، وہ قبول ہوئی۔

مندرجہ ذیل عبارات کی تشریح آسان اردو میں کیجیے :۔

(الف) زیور اور لباس .... فخر کرے گی۔

(ب) تھانے دار کا نام .... ناک کاٹ دوں ۔

مندرجہ ذیل محاورات کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے :۔

ادھیڑ بُن ۔ پے در پے۔ دانت کریدنے کو تنکا نہ رہنا۔ اپنے گریبان میں منہ ڈالنا۔ رونق دوبالا کرنا۔ ڈھنڈیا مچنا۔

اسمِ عَلَم سے مراد وہ مخصوص اسماء ہیں جو مختلف اشخاص کی پہچان کے لیے علامت کا کام دیتے ہیں، مثلاً غالب اور کلیم اللہ ۔ غالب ، مرزا اسد اللہ خان کا اور ، کلیم اللہ ، حضرت موسیٰؑ کا علامتی نام ہے ۔ **لقب** وہ وصفی نام ہے جو کسی وصف یا خصوصیت کی وجہ سے مشہور ہو جاتا ہے مثلاً سید الشہدا حضرت امام حسینؓ کا لقب ہے ۔ **خطاب** وہ اعزازی نام ہے جو کسی شخص کو اس کی علمی ادبی یا قومی خدمات کے اعتراف کے طور پر حکومت کی طرف سے ملتا ہے، مثلاً خان بہادر ، شفاء الملک ۔ حکومتِ پاکستان کی طرف سے خطاب کی بجائے اعزاز

ملتا ہے۔ مثلاً نشانِ حیدر - ستارۂ امتیاز وغیرہ۔

۸ - مندرجہ ذیل الفاظ اسمِ عَلَم کی کون سی اقسام ہیں ؟

ملک الشعراء۔ مصوّرِ غم۔ بہادر یار جنگ ۔ تمغۂ قائداعظم۔ لکھ داتا۔

۹۔ کالم I میں کچھ الفاظ اور کالم II میں ان کے مترادفات بے ترتیبی سے درج ہیں۔ جوابی کالم میں ہر لفظ کے آگے اس کے صحیح مترادف کا حرفی نمبر تحریر کیجیے :۔

کالم I	کالم II	جوابی کالم
۱۔ ندامت	(الف) خوشی	
۲۔ ساکت	(ب) درد	
۳۔ مسرت	(ج) خاموش	
۴۔ رفاقت	(د) شرمندگی	
۵۔ دکھ	(ہ) دوستی	

۱۰۔ (الف) عربی قاعدے سے واحد کے جمع اور جمع کے واحد لکھیے :۔

اتفاقات ۔ غرباء ۔ موقع ۔ توقع ۔ شک ۔ وارث ۔

(ب) مندرجہ ذیل الفاظ کا تلفظ اعراب کے ذریعے ظاہر کیجیے :۔

مرحلہ ۔ صادقہ ۔ عروج ۔ وصیت ۔ مفارقت ۔ غلغلہ ۔ افلاس نذر۔ تمول ۔ عصمت۔

- - - - - - - - -

ایک پنجابی زمیندار کی کہانی

پہلے میں فوج میں ملازم تھا۔ دو سال کی رخصت لے کر گھر آیا۔ خدا نے میرے گھر لڑکا دیا۔ برادری کی رسومات کے صدقے پانچ سو روپے کی قربانی کرنی پڑی۔ چھوٹی ملازمت میں کیا بچتا ہے! ایک ماہ پانچ بچائے، دوسرے مہینے سات خرچ ہو گئے۔ تیسرے مہینے پلہ برابر ہو گیا۔ خیر خدا نے چاند سا لڑکا دیا تھا۔ دل خوش تھا، قرضہ لیا اور دل کھول کر خرچ کیا۔ ماں بوڑھی تھی، باپ بیمار تھا، ہاتھ تنگ ہو گیا مگر ان کی مصیبت بھی دیکھی نہ جاتی تھی۔ چاہا کہ اور قرض لوں اور ان کی خدمت کروں مگر ہر روز ادھار کون دیتا ہے! ناچار کچھ زمین رہن رکھی اور ان کا علاج کیا۔ ایک تو میری ناداری کی شہرت ہوئی دوسرے والد کی عمر نے وفا نہ کی۔ اب ایک اور خرچ آ پڑا۔ خوشی کا وقت مقرر ہو سکتا ہے، غمی ہمیشہ ناگہانی ہوتی ہے۔ جنازہ گھر میں پڑا تھا۔ میں باہر قرض کے لیے مارا مارا پھر رہا تھا۔

برادری کے لوگ تو تماشا دیکھنا چاہتے تھے۔ دوسرے رسومات کے مارے میری طرح نادار تھے۔ ناچار میں نے مہاجن کے پاؤں پکڑے۔ پگڑی پاؤں پر رکھ دی۔ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے بڑی مہربانی کی۔ ہزار دے کر پندرہ سو لکھوائے۔ دو پیسے شرح سود پر راضی ہوا۔ تم کہو گے بڑی رقم لی مگر کیا کرتا! لڑکے کی پیدائش پر پانچ سو روپے خرچ کیے، باپ کی موت پر ہزار نہ خرچ کرتا تو ناک کہاں رہتی! لوگ نہ کہتے کہ جس باپ کی کمائی اتنی دیر کھائی، اس کی قدر بیٹے برابر بھی نہ ہوئی۔ خیر ایک ہزار خرچ ہوا۔ بقول برادری کے باپ کی موت سپھل ہوئی۔ میں نے شکر کیا مگر مصیبتیں کب اکیلی اور پوچھ کر آتی ہیں۔ والد فوت ہوئے۔ والدہ بیمار ہوئیں۔ بہت گھبرایا۔ بیوی کا زیور بیچا۔ مشکل سے کچھ دنوں گزارہ کیا۔ اب ماں

کی موت پر پھر رسومات کا خیال پیدا ہوا۔ اب کیا کروں، کدھر اور کس کے پاس جاؤں؟ مہاجن کا دروازہ پھر کھٹکھٹایا۔ پہلے قرض سے اصل چھوڑ سود کی پائی نہ پائی تھی۔ میری صورت دیکھ کر بولا، "آؤ میاں صاحب! کیا رقم چکانے آئے ہو؟" میں نے لجاجت سے کہا: "نہیں مہاراج! ماں کا جنازہ گھر پر پڑا ہے، کچھ لینے آیا ہوں۔"

اس نے کہا: "بھائی! یہ روپیہ میرے پسینے کی کمائی ہے۔ کل تیرا باپ مرا، آج ماں مری۔ موت نے تیرا گھر تاک لیا ہے۔ کل تو چل بسا تو میرا قرض کون دے گا؟ میں تو پہلی رقم دے کر پچھتاتا ہوں۔ ان تلوں میں تیل نہیں۔ اب جاؤ۔ کسی اور کو اپنا ساہوکار بناؤ۔"

جس پر میری سی کیفیت گزرے وہ میرے حال کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ گھر میں لاش پڑی ہے۔ پلے پیسہ نہیں۔ میں بچوں کی طرح رونے لگا۔ ساہوکار کی عورت گھر سے نکل آئی۔ میرا حال سن کر خود بھی آنسو بھر لائی اور لالہ سے کہا "اچھا! میرے حساب سے جو مانگتا ہے دے دے، خالی نہ پھیر۔" اس نے ہزار دے کر، دو ہزار لکھوایا اور شرح سود میں بھی اضافہ کیا۔ میں خوشی خوشی گھر آیا۔ حاتمِ ثانی بن کر چار و ناچار ہزار کا ہزار خرچ کر ڈالا۔ کوئی کیا کہتا کہ بیٹے کی پیدائش پر پانچ سو خرچ کیا، باپ کی مرگ پر ایک ہزار اور پیاری ماں کی مرگ پر سو دو سو؟" میں نے کہا "وقت نپٹاؤ۔ برادری سے عزت بچاؤ۔ دل کھول کر خرچ کرو۔ پھر اللہ مالک ہے۔"

غرض پانچ چھے ہزار کا مقروض ہو کر ملازمت پر گیا۔ سپاہی کی تنخواہ میں بچت کیا۔ پانچ گھماؤں زمین، اس میں کتنی پیداوار ہوتی! باوجود جزرسی کے قرضہ بڑھتا گیا۔ مہاجن کے تقاضے شروع ہوئے۔ میں نے نوٹس تک کا جواب نہ دیا۔ آخر دعوٰی ہوا۔ مجھ پر ڈگری ہوئی۔ ایمان کا تقاضا تھا کہ قرض لیا تو زمین رہن رکھ کر یا بیع کر کے دوں مگر میں نے قانون کی آڑ لی۔ زمین قانونِ وقت کے مطابق ناقابلِ قُرقی تھی۔ ڈگری کے اجراء پر بھی کچھ وصول نہ ہوا تو اس نے وارنٹ جاری کروا لیے۔

میں چار ماہ کی چھٹی پر آیا اور آتے ہی دھر لیا گیا۔ ادھر افسروں کو میرے دیوالیا ہونے کی خبر ہوئی۔ مجھے نوکری سے برخاست کر دیا۔ بیوی کو، جس پر زر نچھاور کر کے گھر لائے تھے، سر میں تیل ڈالنا میسر نہ تھا۔ بچہ جس پر سیکڑوں روپے نثار کیے تھے، ننگا گلیوں میں پھرنے لگا۔ بے رحم برادری —— اس کی رسومات اور اپنی حماقت پر میں لعنت بھیجتا تھا مگر موقع کھو کر پچھتانے سے کیا ہوتا ہے!

میں جیل سے گھر آیا۔ گھر کی بدحالی کا یہ نقشہ دیکھا کہ آخری برتن تک بک چکا تھا۔ اب بیوی باوجود فاقے کے چکی پیستی ہے۔ میرے آنے پر وہ رو پڑی۔ بچہ بھی رو دیا۔ اگر رونے سے گزارہ ہوتا تو اور روتے رہتے۔ سوچا کہ کیا کچھ کرنا چاہیے۔ ناچار زمین رہن رکھنے کی ٹھانی۔ پھر خیال آیا، زمین دوسرے کے قبضے میں دیکھ کر لوگ مجھے اور ذلیل سمجھیں گے۔ اس لیے بہ تقاضائے غیرت رہن بلا قبضہ رکھی، یعنی زمین تو میرے قبضے میں رہی اور اس پر سود چڑھتا رہا۔

جب آدمی ایک دفعہ قرض لے کر کھاتا ہے تو اس کا دل غنی اور ہاتھ کشادہ ہو جاتا ہے۔ قرض کے روپے کو بے گانی دولت سمجھ کر مہینوں میں اڑاتا ہے۔ بمشکل زمین کے روپے پر دو سال امیری کی ہو گی کہ وہ روپیہ بھی ختم ہو گیا۔ اب چھوٹی چھوٹی رقمیں قرض لینی شروع کیں حتیٰ کہ میرا اعتبار جاتا رہا۔ کوڑی مانگے نہ ملتی تھی۔ پھر فاقوں کی نوبت آئی۔ ایک صبح میں اپنے مزارعین کے ہاں گیا اور ان سے معاہدہ کیا کہ بیل تمہارے، زمین میری اور محنت مشترکہ، پیداوار نصف نصف، وہ مان گئے۔ اس سے پہلے وہ میری خدمت کیا کرتے تھے اور میری امداد پر نظر رکھتے تھے۔ اب انھوں نے مجھے چھ ماہ کے لیے غلہ ادھار دیا۔

میں صبح کھیتوں کو چلا گیا۔ چاشت کے وقت تک ہل چلایا۔ کچھ بھوک معلوم ہوئی۔ ہماری اونچی ذات تھی اور ہماری برادری میں پردے کی رسم جاری تھی۔ میرا ساجھی کمین تھا اور پردہ اس کے ہاں متروک تھا۔ اس لیے میرے ساجھی کی عورت سر پر چھاچھ کا گڑوا دھرے اس پر رومال میں روٹیاں رکھے آ گئی۔ ساجھی نے شرکت

طعام کی دعوت دی۔ میں نے یہ کہہ کر انکار کیا کہ میرے لیے بھی کھانا آرہا ہو گا۔ میں نے ہل چھوڑ کر حقہ تازہ کیا اور منہ گاؤں کی طرف کر کے کش لگانے شروع کر دیے۔ میں نے خیال کیا کہ عورت سلیقے والی ہے، روٹی ضرور پکائی ہو گی۔ کسی ہمسائے کے ہاتھ بھیج دے گی۔ جو عورت سر پر روٹی رکھے، گاؤں سے نکلتی، میں امید کرتا کہ وہ میری روٹی لا رہی ہو گی۔ ایک چلم پی، پھر دوسری بھری مگر دھوئیں سے پیٹ کب بھرتا ہے۔ ساجھی روٹی کھا، چھاچھ پی اور ڈاڑھی مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر کام کو لگ گیا۔ میری آنتیں قُل ھُوَ اللہ پڑھنے لگیں۔

ساجھی نے کہا: "چودھری! تیری روٹی تو اب آنے سے رہی، کام بھی نہ گنوا۔" میں شرمندہ سا ہوا۔ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھا۔ دل میں عورت کو ہزار گالیاں دیں اور ہاتھ ہل پر ڈالا۔ نہ بہت کھا کر محنت ہو سکتی ہے، نہ بھوکے رہ کر۔ ہل سیدھا رکھنا مشکل ہو گیا۔ پھر میں نے عورت کو گالیاں دینی شروع کیں۔ نو بجے کے بجائے گیارہ بجے ایک ہمسائے کے لڑکے کے ہاتھ روٹی آئی۔ میں نے شکر کیا اور اس خیال سے روٹی تھوڑی کھائی کہ اب دوپہر کی روٹی کا وقت ہوا چاہتا ہے۔ دوپہر کا وقت گزرنے لگا تو میں نے بچی ہوئی روٹی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر پانی کے گھونٹ سے کھا لیا اور خدا کا شکر کیا لیکن دن قیامت ہو کر گزرا آگ بگولا ہو کر شام کو گھر آیا۔ بیوی کو بہت سخت سست کہا۔ پھر بھی غصے کی آگ فرو نہ ہوئی۔ لاٹھی لے کر برس پڑا۔ اس نے نہ زبان ہلائی، نہ ہاتھ اٹھایا۔ جو کہا، سنا، جہاں پڑی، سہی۔ میری ہمسائی یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ دیوار کی اوٹ سے بولی "بھائی جو کیا، اچھا کیا۔ عورت کی کوئی قدر نہ سہی، انصاف ہی کیا ہوتا! صبح آٹھ بجے روٹی پکائی، گیارہ بجے تک لیے بیٹھی رہی۔ کون آئے کہ تمھارا کھانا کھیت پر پہنچائے۔ میرا لڑکا باپ کی روٹی دے کر آیا تو تمھاری روٹی لے کر گیا۔ دوپہر کو میں نے اس سے کہا تو اس نے جواب دیا کہ میں کسی کے باپ کا نوکر ہوں؟ تم نے اپنے بچے کو مدرسے میں داخل کرا دیا۔ مدرسہ دور، ننھی جان، وہ صبح جاتا ہے، شام کو آتا ہے۔"

میں نے کہا "تو بی بی! کیا میں اس کو علم کی دولت سے محروم کر دوں؟"

وہ بولی "بھائی! بھوکے غریب کو تو زندگی کے دن پورے کرنے قیامت ہوتے ہیں۔ یہ سب چیزیں تو فرصت اور اطمینان کی ہیں۔ جس کو پیٹ سے فرصت نہ ہو، وہ علم کی دولت کیسے حاصل کرے؟"

میں نے کہا "بیٹے کو حُصُولِ علم سے تو نہیں ہٹا سکتا۔"

وہ بولی "بھائی! کسی کا بیٹا بھی ہر روز کھانا نہیں پہنچا سکتا۔"

غصہ فرو ہوا تو ٹھنڈے دل سے سوچا۔ سات برس کا بچہ دو روٹیاں جس مصیبت سے لے کر آتا، مجھ سے وہ سماں دیکھا نہ جاتا۔ مگر کیا کرتا۔ وہی پانچ سو جو اس کی پیدائش پر خرچ کیے تھے پاس ہوتے تو اس کی تعلیم بھی جاری رہتی اور ایک ہاتھ بٹانے والا لڑکا پانچ روپے ماہوار پر رکھ لیتا۔ کب تک کوئی روٹی کھیتوں میں لائے گا؟ ایک دن میں قدر عافیت معلوم ہو گئی۔ مجبور ہو کر لڑکے کو مدرسے سے اٹھایا۔ وہ روٹی وقت پر لاتا تو میں کھاتا۔

اب سنیے: میں تن تنہا کام کرتا اور ساجھی کی بیوی بھی اس کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ لامحالہ زمین کو نصف تقسیم کر کے بیج ڈالا گیا۔ وہ جب کھیت ایک طرف سے سینچتا، اس کی بیوی دوسری طرف فصل کا ناکا بند کرتی اور کھولتی۔ وہ کھاد سر پر لاد کر کھیتوں میں ڈالتی۔ ان کی کھیتیاں لہلہانے لگیں۔ میں رہٹ چلاتا تو ناکا ٹوٹ جاتا، ناکا روکنے جاتا تو بیل کھڑے ہو جاتے۔ فصل سے زیادہ گھاس اور جھاڑیاں کھیتوں میں کھڑی ہو گئیں۔ بعض کھیت بالکل خشک ہو گئے۔ کاشت کی تو یہ صورت ہوئی، اب برداشت کا موقع آیا۔ وہ میاں بیوی دونوں کاٹنے بیٹھے، جو فصل کاٹتے، اٹھا کر گھر ڈال دیتے۔ میں نے ایک دوسرے شخص کو اجرت دے کر فصل کاٹنے میں شامل کیا۔ بہشتی، خاکروب، نائی اور میراثی فصلانہ لینے آئے۔ لے دے کے چھ ماہ کی کمائی پانچ من غلہ بچا۔

میں رات کو گھر میں جا کر لیٹ رہا مگر کسی کل نیند نہ آئی۔ یہی فکر تھی کہ زندگی اس طرح کیوں کر کٹے گی! نماز پڑھنے کھڑا ہوا مگر وہاں بھی "چہ خورد بامداد فرزندم"[1] کا نقشہ پیش نظر تھا۔ خیال کیا، چلو شہر چلیں۔ کوئی مزدوری کر کے کھائیں مگر شہر کے حالات مجھ سے پوشیدہ نہ تھے۔ مزدوری ہر کس و ناکس کو کہاں ملتی ہے۔ ہزاروں میری طرح فاقوں مرتے ہیں۔ پھر کیا کروں! خود کشی! اول مذہب اجازت کہاں دیتا ہے! پھر بیوی بچوں کا کیا ہو گا! تو کیا میں بھی رزیلوں کی طرح عورت کو کھیت میں لے جاؤں! اول تو برادری کب گوارا کرتی ہے! پھر مذہب کب برداشت کرتا ہے! سوچتے سوچتے سوجھا کہ در در دھکے کھا کے قرض اٹھانا اور ہاتھ پھیلا کر ادھار کھانا کہاں کی شرافت ہے! فاقہ مست کی برادری میں توقیر کیا! غریب کا ساتھی کون! البتہ مذہب ایک چیز ہے جس کی حرمت کو جان دے کر بچانا چاہیے۔ میدانِ غزا میں جوشِ مذہب کے اظہار کا اب موقع نہیں۔ ہمسائے کی خدمت، تیموں کی پرورش، غریبوں کی امداد جیسے مذہب کے احکام بجالانا تو اب مجھ سے ممکن بھی نہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں خود غیروں کی امداد کا مستحق ہوں۔ عبادت میں پریشانی کی وجہ سے دل نہیں لگتا۔ صرف پردہ غیرت کی ایک ظاہری نشانی میرے گھر میں رہ گئی ہے، اب بی بی کو گھر کی چار دیواری سے نکالوں، تو غیرت بھی گنواؤں۔ یہ تو جیتے جی مجھ سے ممکن نہیں!

خیر، پانچ من غلہ ابھی باقی تھا۔ کچھ اتنی فوری تشویش نہ تھی۔ عورت کے کپڑے پھٹے دیکھے۔ میں نے کہا: "خیر ہے۔ گھر میں بیٹھی ہے۔ بچہ ننگا دیکھا تو تسلی دے لی کہ ابھی بچہ ہے، بچے ننگے ہی رہتے ہیں۔" سردی کے دن آرہے تھے۔ شام کو ٹھنڈی ہوا چلی۔ لڑکے نے سینے میں درد کی شکایت کی۔ دو گھنٹے کے اندر اندر سانس لینے میں تکلیف ہو گئی۔ غلہ بیچا حکیم کو بلایا۔ دوا دی اور کچھ گرم کپڑے خریدے۔ بچے کو تو افاقہ نہ ہوا مگر تیسرے روز ہمیں فاقہ شروع ہو گیا۔ ہم میاں

۱۔ لفظی معنی ہیں کہ میرا بیٹا صبح کیا کھائے گا۔ مراد یہ ہے کہ غریب کو یہی خیال ستاتا رہتا ہے کہ پیٹ کیسے بھرے گا۔

بیوی تو بھاڑ میں گئے، بچے کے منہ میں ڈالنے کو ایک دانہ گھر میں نہ تھا۔ پھر اس موقع پر وہی پانچ سو روپیہ یاد آیا۔ اے کاش! اس وقت وہ روپیہ ہوتا لیکن بہایا ہوا پانی، لٹایا ہوا مال کب ملتا ہے! بچے کی حالت دیکھی نہ گئی۔ ماں سرہانے بیٹھ کر رونے لگی۔ میں باہر چلا گیا مگر باہر بھی آرام کہاں؟ اِدھر اُدھر پھر کر اضطراب سے واپس آیا۔ دیکھا بی بی کے پاس ایک عورت بیٹھی ہے۔ میرے آنے پر وہ اٹھ کر چلی گئی۔ بیوی نے بتایا کہ یہ عورت یہاں کے قانون گو کے ہاں ملازم ہے۔ ایک ماہ کی رخصت پر جانا چاہتی ہے۔ پانچ روپے اس نے دیے ہیں۔ اپنے عوض مجھے رہنے کو کہتی ہے۔ میں نے روپے لے لیے ہیں۔ فیصلہ آپ پر چھوڑا ہے۔

یہ پانچ روپے بھی پانچ ہزار کے برابر تھے۔ قرض مانگنے سے بھی نہ ملتا تھا مگر عورت کو کسی کے ہاں کام کاج پر بھیجنا بھی گوارا نہ تھا۔ میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ لڑکے کی حالت اضطراب انگیز تھی۔ میری اور میری بیوی کی حالت اس کو دیکھ کر بری ہو رہی تھی۔ بیوی کے دوبارہ دریافت کرنے پر میں نے کہا "اچھا فیصلہ بھی کر لوں گا۔ تم بچے کے منہ میں ڈالنے کا کچھ سامان کرو۔" وہ خوش ہو گئی۔ مجھے روپے دیے۔ میں سامان خور و نوش لایا۔

چوتھے روز آہستہ آہستہ خدا نے بچے کو صحت دی۔ وہ عورت غریب چوتھے روز آئی۔ مجھے پھر غیرت آئی۔ برادری کے خیال اور مذہب کے تخیل نے مل کر روکا کہ میں عورت کو گھر سے باہر نہ جانے دوں۔ اس لیے میں نے صاف جواب دے دیا۔ وہ روتی روتی پڑوس میں گئی تو ہمسائے کی بی بی جس نے بیوی کو پیٹنے پر مجھے ملامت کی تھی، اوٹ میں سے بولی "بھائی! یہ بھی بڑی غریب ہے۔ گھر جانا چاہتی ہے۔ اس پر رحم کرو۔ عورت کو کام پر بھیجو یا روپے واپس دو۔" باوجود اس امر کے جاننے کے کہ میری ہمسائی کو ان پانچ روپوں کا پورا علم ہے، میں ڈھیٹ ہو کر بولا "کیسے روپے؟" اس نے یہ سفید جھوٹ سنا تو آہستہ سے یہ کہہ کر چلی گئی کہ "غریب کا کوئی ایمان نہیں ہوتا۔" میرے دل پر چوٹ تو ضرور لگی مگر کیا کرتا، چپ

ہو رہا۔ رات کی تنہائیوں میں خیالات کا ہجوم ہوا۔ اس ہمسایہ عورت نے جس تلخ حقیقت کا اظہار کیا تھا، اس نے مجھے آسمان سے زمین پر لا گرایا'۔ اس عورت نے جو غریبوں کو سرٹیفکیٹ دیا، اس کا مستحق ضرور تھا تاہم وہ میرے لیے قابلِ قبول نہ تھا۔

باوصف یہ جاننے کے کہ وہ سچ کہتی ہے، میں اس سے سخت کبیدہ خاطر ہوا۔ بعض لوگ مذہب کو سب چیزوں سے بالا رکھتے ہیں۔ میں بھی ان میں سے ایک تھا مگر معلوم ہوا سوسائٹی کا قانون یعنی رسم و رواج سب چیزوں سے بالا ہیں۔ لاکھوں نہیں کروڑوں نے میری طرح سوسائٹی میں عزت برقرار رکھنے کے لیے خاموش شہید کی طرح گھربار لٹایا، فاقے کیے، جان گنوائی۔ مذہب کے لیے اور خدا کے خوف سے لاکھ میں سے ایک گھر لٹاتا ہے اور فاقہ کرتا ہے اور کروڑ میں ایک خدا کے لیے جان خطرے میں ڈالتا ہے۔ خدا کو انسان آسانی سے پسِ پشت ڈال دیتا ہے لیکن برادری کے قانون اور رسومات کو ٹھکرا نہیں سکتا۔ برادری میں بدنامی کے ڈر سے میں پانچ روپے کھا کر مکر گیا۔ حالانکہ میں نے خدا کے احکام کی خلاف ورزی کی مگر عوام کا مقابلہ نہ کر سکا۔ شرافت اور مذہب کا تقاضا تو یہ تھا کہ بیٹا بے دوا مرتا اور میں فاقوں جان دے دیتا مگر یہ کہنا آسان ہے اور کرنا مشکل۔

میں اپنے اسی پرانے مزارع کے پاس گیا اور وہی شرط پیش کی کیونکہ پچھلی دفعہ خاصا فائدہ رہا تھا۔ بڑا خوش ہوا اور اسی شرط پر آئندہ فصل کاشت کرنے کا معاہدہ ہوا۔

عورت کو اپنا عزمِ راسخ بتایا کہ رسمی پردہ ترک کرنا ہوگا۔ فاقہ موت بن کر گھور رہا تھا۔ اسے بھی اس کے سوا کیا چارہ تھا۔ چھ ماہ کے ادھار پر مجھے اس سے گندم بھی مل گئی اور میں کسی قدر اطمینان سے صبح کام کو گیا۔ اول کھیت کو جھاڑیوں سے پاک کرنے لگا مگر دل دھڑکتا تھا کہ عورت کو گھر سے باہر دیکھیں گے تو لوگ انگلیاں اٹھائیں گے۔ تنگ دستی مجبور کرتی تھی مگر دل دنیا سے اچاٹ تھا۔ بیوی ابھی

ا۔ میرے ضمیر کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

گھر میں بیٹھی بھی میں کھیتوں میں عرق عرق ہو رہا تھا۔ آہیں بھرتا تھا اور گاؤں کی طرف دیکھتا تھا کہ آج کیا ہو گا! کبھی لڑکے کی پیدائش کو منحوس کہتا تھا، کبھی ماں باپ کی موت کو الزام دیتا تھا۔ کبھی اپنی رسم پرستی پر لعنت بھیجتا تھا۔ جوں جوں چاشت کا وقت قریب آرہا تھا، میری جان پر بن رہی تھی۔ کئی دفعہ دل میں آئی کہ بے پردگی پر لعنت بھیجوں عورت کو جا کر باہر آنے سے منع کر دوں مگر تنگ دستی روکتی تھی اور میں بیٹھے کا بیٹھا رہ جاتا تھا۔

آخر دیکھا کہ بیوی خود نہیں آئی لڑکے کے سر پر روٹی دے کر بھیج دی ہے۔ میں نے شکر کیا۔ وقتی طور سے تسلی ہو گئی۔ مجھے لڑکے نے بتایا کہ ماں کئی دفعہ روٹی لے کر باہر آئی، پھر اندر چلی گئی۔ آخر مجھے ہی بلایا کہ جا روٹی لے جا۔ میں نے اپنے حال پر اس کا قیاس کیا کہ اس کو یکبارگی باہر آنے میں مشکلوں کا پہاڑ عبور کرنا ہو گا۔ جوں توں کر کے دوپہر کا وقت آیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک عورت چادر میں لپٹی، چھوئی موئی بنی، شرماتی، لجاتی، اکھڑی چال چلی آ رہی ہے۔ چار پانچ چھوٹے لڑکے لڑکیاں حیرت سے اسے تک رہے ہیں اور تماشا سمجھ کر ساتھ ساتھ آ رہے ہیں۔ جو راہ گیر آتا جاتا، وہ بھی چند منٹ دیکھنے کو رک جاتا۔ میں سمجھ گیا کہ گھر والی ہے۔ ہاتھ سے کدال رکھ دی۔ دھڑکتے دل سے اس کو دیکھنے لگا۔ اس کے لیے وہ راہ قیامت ہو گئی اور مجھ پر بھی حشر گزرا۔ کبھی خیال آتا کہ خود اٹھوں اور ہمراہ لے آؤں۔ کبھی وہیں بیٹھا منہ ہی منہ میں بچوں کو کہتا "نالائقو! ہٹو، گھروں کو جاؤ"۔

جب کوئی مرد کھڑا ہو کر گھورتا، میری پیشانی عرق آلود ہو جاتی اور غیرت آنکھیں نکال لینے کا تقاضا کرتی۔ غرض وہ پہنچی۔ مصیبت کا پہاڑ پھاند کر آئی۔ اس کا رنگ زرد، جسم پسینے میں شرابور، ہانپتی کانپتی بیٹھ گئی۔ اس کے لبوں پر پپڑی جمی ہوئی تھی۔ اس نے گھونگھٹ میں سے پانی کے لیے اشارہ کیا، میں نے اٹھا کر دیا۔ اب وہ ذرا ستائی اور تھوڑا گھونگھٹ اونچا کر کے اِدھر اُدھر کھیتوں کو حیرت سے

دیکھنے لگی گویا نیا جانور ابھی چڑیا خانے میں چھوڑا گیا ہے۔

(زندگی از چودھری افضل حق)

سوالات

۱۔ پنجابی زمیندار نے برادری کی رسومات پوری کرنے کے لیے جو قرضے لیے ان کا انجام کیا ہوا؟

۲۔ اپنے مزارع کے ساتھ ساجھے کی کاشت میں پنجابی زمیندار کو کن تکالیف کا سامنا کرنا پڑا؟

۳۔ اس نے یہ سفید جھوٹ سنا تو آہستہ سے یہ کہہ کر چلی گئی کہ "غریب کا کوئی ایمان نہیں ہوتا۔" یہ فقرہ ہمسائی نے کس موقع پر کہا؟ یہ واقعہ اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۴۔ مندرجہ بالا فقرے کا پنجابی زمیندار پر کیا اثر ہوا؟ اس کی جذباتی کشمکش کو اپنے لفظوں میں بیان کیجیے۔

۵۔ "خدا کو انسان آسانی سے پسِ پشت ڈال دیتا ہے لیکن برادری کے قانون اور رسومات کو ٹھکرا نہیں سکتا۔" کہانی کے واقعات کے حوالے سے پنجابی زمیندار کے اس فقرے کی وضاحت کیجیے۔

۶۔ مندرجہ ذیل جملوں میں خالی جگہ پُر کیجیے :-

(الف) ایک تو میری ناداری ______ شہرت ہوئی، دوسرے والد کی عمر ______ وفا نہ کی۔

(ب) باپ کی موت پر ہزار نہ خرچ کرتا ______ ناک کہاں رہتی؟

(ج) مزدوری ہر کس و ناکس ______ کہاں ملتی ہے۔

(د) ______ چاشت کا وقت قریب آرہا تھا، میری جان پر بن رہی تھی۔

(ہ) اس کے لبوں ـــــــــــ پپڑی جمی ہوئی تھی۔

۷۔ وہ نام جو ماں ، باپ ، بیٹے ، بیٹی یا کسی معنوی رشتے کی بنا پر پکارا جائے ، اسے کنیت کہتے ہیں مثلاً امِّ کلثوم ۔ ابو حنیفہؒ۔ خالدہ کی امی ۔ ابوالکلام ۔ وہ مختصر نام جو شعراء اپنے کلام میں اصلی نام کی بجائے استعمال کرتے ہیں ، اسے تخلص کہتے ہیں مثلاً انیس ۔ نظیر وغیرہ ۔ وہ نام جو محبت یا حقارت کی وجہ سے پکارا جائے ، عرف کہلاتا ہے مثلاً کالے خاں سے کلّن۔

کالم I میں کچھ الفاظ درج ہیں۔ کالم II میں اسمائے عَلَم کی اُقسام لکھی گئی ہیں۔ جوابی کالم میں ہر لفظ کے آگے درست جواب حرفی نمبر کی صورت میں تحریر کیجیے :۔

I	II	جوابی کالم
۱۔ حسرت	(الف) خطاب	
۲۔ حکیم الامت	(ب) کنیت	
۳۔ شبّو	(ج) تخلص	
۴۔ شمس العلماء	(د) عرف	
۵۔ ابن الخطاب	(ہ) لقب	

۸۔ مندرجہ ذیل الفاظ کو جملوں میں اس طرح استعمال کیجیے کہ ان کی تذکیر و تانیث واضح ہو جائے مثلاً ابتداء۔ ہر نئے کام کی ابتداء اللہ کے نام سے کیجیے :۔

احسان ۔ پپڑی ۔ انحصار ۔ گھونگھٹ ۔ افراط ۔ انتظام ۔

۹۔ اِعراب کی مدد سے مندرجہ ذیل الفاظ کا تَلَفُّظ واضح کیجیے :۔

قرض ۔ مطابق ۔ حماقت ۔ اعتبار ۔ مستحق ۔ اضطراب ۔

۱۰۔ "اضطراب انگیز" میں "انگیز" لاحقہ ہے۔ اس لاحقے سے تین الفاظ اور بنائیے۔

کیلے کا چھلکا

۱۷ فروری ۱۹۲۷ء کی رات کو نواب چھٹن نہر کے کنارے کنارے چلے جا رہے تھے کہ ایک کیلے کے چھلکے پر سے جو خدا جانے کس ناشدنی نے وہاں پھینک دیا تھا، پاؤں پھسلا اور نواب عالی قدر غڑاپ سے نہر میں جا رہے۔ ذرا ۱۷ فروری ۱۹۲۷ء کی تاریخ دھیان میں رکھیے۔ اگر بلرام پور کے شیخ شبراتی اس موقع پر موجود نہ ہوتے تو دنیا نواب چھٹن کو نیلی کوٹھی والے مرحوم نواب کے نام سے یاد کرتی۔ اب یہ سنیے کہ شیخ شبراتی نے نواب چھٹن کی جان کیسے بچائی؟

کہتے ہیں کہ جب شیخ جی نے جو نہر کے پاس سے گزر رہے تھے، پانی میں بلبلے سے اٹھتے دیکھے تو بول اٹھے، "ہائیں! یہ کیا؟" ادھر نواب چھٹن بھی پکار اٹھے کہ: "اماں بچائیو، میں ڈوبا۔" شیخ شبراتی نے اچکن اتارتے ہوئے کہا: "یار ابھی نہ ڈوبیو! میں آتا ہوں"۔

شیخ جی نے نہر میں کودتے ہی نواب کو بالوں سے پکڑ لیا۔ کہنے لگے: "تم بھی ذرا ہاتھ پاؤں مارو، تمھیں تو تیرنا بھی نہیں آتا۔ مجھے نہ مارو بھئی، ہاتھ پاؤں مارو۔"

غرض شیخ شبراتی نے نواب چھٹن کو کھینچ کھانچ کر کنارے پہنچایا لیکن کنارے پہنچنے سے پہلے نواب صاحب کو اس بات کا احساس ہو چلا تھا کہ اگر یہ مرد آدمی آج یہاں نہ ہوتا تو وہ مرحوم باپ نواب رفیع الشان کے پاس پہنچ چکے ہوتے۔ چنانچہ کنارے پہنچتے ہی انھوں نے کہا: "یار اگر تم یوں نہر میں کود نہ پڑتے تو میں ختم ہو چکا تھا۔"

شیخ شبراتی کہنے لگے: "آج زیادہ کھا گئے تھے کیا؟"

نواب نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا اور ادھر ادھر ٹٹولتے ہوئے کہنے لگے :" بھئی تم نے میرا چشمہ تو نہیں دیکھا ؟"

"ارے یار اس حالت میں بھی تمھیں چشمے کی پڑی ہے ، ذرا اپنی طرف دیکھو تو سہی سارا لباس چوڑا ہو رہا ہے۔"

"بات تو ٹھیک ہے لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نہر میں گرا کیسے ؟"

"معلوم ہوتا ہے کہ کسی چیز پر سے تمھارا پاؤں پھسل گیا۔"

"آخر کا ہے پر سے ؟"

شیخ شبراتی ادھر ادھر ٹٹول کر بولے :"لو مل گیا۔"

"میرا چشمہ ؟"

"جہنم میں جائے تمھارا چشمہ ، مجھے تو وہ کیلے کا چھلکا ملا ہے جس پر سے تمھارا پاؤں پھسلا تھا۔ اب میری صلاح مانو تو سیدھے گھر چلے جاؤ ، کپڑے اتار کر سو جاؤ ، اگر تھوڑی سی کافی مل جائے تو سبحان اللہ ۔ تم رہتے کہاں ہو؟"

"میں پاس ہی رہتا ہوں۔ آؤ چلیں ، ہاں بھئی میں تو تمھارا نام بھی نہیں جانتا"۔

"میرا نام شبراتی ہے ، شیخ شبراتی ۔"

"عجیب بات ہے کہ میں نے تمھارا نام پہلے کبھی نہیں سنا ، حالانکہ تم نے ابھی ابھی میری جان بچائی ہے"۔

"آؤ چلو ، میں تو سردی سے ٹھٹھرا جا رہا ہوں۔"

"ہاں چلو۔ لیکن بھئی تمھیں معلوم ہے کہ اگر تم نہ ہوتے تو آج میں ڈوب گیا ہوتا۔"

"اب اسے بھول بھی جاؤ۔"

"کیسے بھولوں، مرتے دم تک نہیں بھول سکتا۔"

"اتنے میں نیلی کوٹھی کا بیرونی پھاٹک آگیا اور نواب چھٹن اس کے پاس پہنچ کر رک گئے، شیخ شبراتی نے پوچھا "یہاں کیوں ٹھہر گئے؟"

"اچھا اب رخصت، میں یہیں رہتا ہوں لیکن میاں تم نے میری جان بچائی ہے اور مجھے تمھاری کوئی نہ کوئی خدمت ضرور کرنا چاہیے۔ اچھا تم نے اپنا نام کیا بتایا تھا؟"

"لاحول ولا قوۃ۔ ابھی بھول گئے، میرا نام شیخ شبراتی ہے۔"

"لیکن میاں شیخ شبراتی تمھیں معلوم ہے کہ میں تمھیں جانتا تک نہیں۔ عمر بھر میں پہلی مرتبہ تمھارا نام سنا ہے۔ ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا، کل یہاں نیلی کوٹھی میں ضرور آئیو اور مجھ سے ملیو۔"

"لیکن تمھارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام! چھٹن ہے چھٹن۔"

"ہاں چھٹن۔"

"تو اچھا خدا حافظ! میں تمھارا نام تو نہیں جانتا تھا لیکن تم نے بڑا احسان کیا ہے مجھ پر۔ جان بچائی ہے میری۔ اچھا خدا حافظ کل ضرور ملیو۔ میرا نام چھٹن ہے۔ "خدا حافظ!" "خدا حافظ!" یہ کہہ کر نواب چھٹن تو نیلی کوٹھی میں گھس گئے اور ہمارا شیخ شبراتی اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ یہاں سے اس کا گاؤں کوئی تین میل کے فاصلے پر تھا۔ ایک تو اندھیری رات، دوسرے سارے کپڑے بھیگے ہوئے تھے۔ بچارہ بڑی مشکل سے گرتا پڑتا گھر پہنچا اور سارے راستے یہی سوچتا گیا، خوب آدمی ہے یہ چھٹن بھی۔ کوئی سائیس یا خانساماں معلوم ہوتا ہے اور کیا عجب ہے کہ کسی بڑے آدمی کا داروغہ ہو۔

نواب چھٹن بڑے عالی خاندان رئیس تھے لیکن کچھ ان کے باپ کی فضول خرچی اور کچھ ان کے الّلے تلّلوں کی بدولت وہ پہلی سی بات نہیں رہی تھی۔ نیلی کوٹھی کے ارد گرد ہزاروں ایکڑ زمین تھی جس میں سے بہت سی بک گئی تھی اور جو باقی رہ گئی تھی وہ بھی نواب کے ہاتھوں سے نکلتی چلی جا رہی تھی۔ لیکن یہ نیلی کوٹھی کا ٹھاٹ باٹ ابھی تک وہی تھا۔ اس لیے شیخ شبراتی نے پھاٹک کے اندر قدم رکھا تو بہت چکرایا۔ الٰہی میں کہاں آگیا؟ ایک خدمت گار نے بڑھ کر روکا کہ تمھیں یہاں کیا کام ہے؟ خدمت گار نے کچھ ایسے بھڑکیلے کپڑے پہن رکھے تھے اور گفتگو کا انداز ایسا تھا کہ بچارہ شیخ بدحواس ہو گیا اور کہنے لگا: "حضور مجھے یہاں، یہاں چھٹن سے ملنا ہے۔"

خدمت گار بولا: "میاں چھٹن تو یہاں نہیں رہتے یہ تو نواب چھٹن کی کوٹھی ہے۔"

"یوں ہی سہی۔"

"کیا کام ہے تمھیں؟"

"یوں ہی ان سے ذرا ملنے چلا آیا تھا۔"

"ملنے چلے آئے تھے آپ لیکن ——— !"

"میں خود تھوڑے ہی آیا ہوں، انھوں نے بلایا تھا۔"

خدا جانے خدمت گار کیا کہتا اور شیخ شبراتی پر کیا گزرتی کہ حسن اتفاق سے خود نواب چھٹن کسی کام کو برآمدے میں چلے آئے۔ شبراتی نے انھیں دیکھتے ہی غل مچایا۔ "چھٹن۔"

"نواب چھٹن چونک پڑا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر شبراتی کو تکنے لگا۔ شبراتی بولا "کہو اچھے تو ہو۔ میں ذرا یوں ہی ملنے چلا آیا تھا۔"

نواب چھٹن لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولے "کیا تم سے میری جان پہچان ہے؟"

"بس بھول گئے؟"

"نہیں تو ——— تمھارا چہرہ کچھ چشم آشنا معلوم ہوتا ہے۔ یاد نہیں آتا تمھیں کہاں دیکھا ہے؟"

"وہ نہر کی بات یاد ہے؟"

"ہاں اب یاد آیا۔ آؤ اندر چلو۔"

نہر کا نام سن کر خدمت گار بہت گھبرایا کہ خدا جانے کیا قصہ ہے۔ دم بھر میں یہ خبر سارے نوکروں میں مشہور ہو گئی اور طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔

نواب چھٹن شیخ شبراتی کو دیوان خانے میں بٹھا کے کہنے لگے: "اب مجھے یاد آیا رات کو میں نہر میں غوطے کھا رہا تھا کہ تم نے میری جان بچائی۔"

"اماں اسے بھول بھی جاؤ۔"

"کیسے بھولوں بھائی، تمھارا بڑا احسان ہے مجھ پر، اب کہو تمھاری کیا خدمت کروں۔"

"کچھ بھی نہیں میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے گرمیوں میں شربت بیچتا ہوں، جاڑے میں نان کباب، ایک مرغی خانہ بھی کھول رکھا ہے۔ انڈوں اور مرغیوں سے بھی خاصا منافع ہو جاتا ہے اور کیا چاہیے۔ ہم تم دوست ٹھہرے۔ اب دوست سے کوئی کیا مانگے؟"

"ہم تم دوست تو ہیں لیکن پھر بھی مجھے تمھارے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیے۔"

"تمھیں ایسا ہی اصرار ہے تو اپنے ہاں کے سنگتروں کی ایک ٹوکری بھجوا دو اور بھجوانا کیا ہے، میں خود ہی لیے جاتا ہوں۔"

غرض شیخ شبراتی نے باغ میں پہنچ کر اچھے اچھے سنگترے چھانٹے اور انھیں لے کر گھر کا رخ کیا لیکن اتفاق یہ کہ نواب سے اس کی جو باتیں ہوئی تھیں وہ باورچی کے چھوکرے نے سن پائیں۔ اس نے اپنے باپ کو سارا قصہ سنایا۔ اس نے بوا لطیفن سے کہا اور بوا لطیفن نے نواب چھٹن کی خالہ خورشید لقا بیگم کو جا سنایا۔ یہ بیگم بڑی سلیقے والی اور دانشمند خاتون تھی۔ نواب کی جاگیر کا سارا انتظام اسی کے ہاتھوں میں تھا۔ اس نے سنا تو نواب کو بلا بھیجا اور کہا: "چھٹن! میں یہ کیا سنتی ہوں؟ تم نے کس موئے خدائی خوار کو سر چڑھا رکھا ہے؟"

نواب چھٹن کچھ دیر تو سر نیہوڑائے کھڑے رہے۔ پھر بولے: "میں کیا کروں؟ اس کمبخت کا مجھ پر احسان ہے۔ میری جان بچائی ہے اس نے۔"

خورشید لقا بیگم تنک کر بولیں: "جان بچائی ہے تو کچھ دے دلا کر رخصت کرو۔ ایسے لُچے شُہدوں سے یوں ربط ضبط بڑھانا ٹھیک نہیں۔"

نواب چھٹن نے کچھ جواب نہ دیا اور دیوان خانے میں آ گئے۔ دوسرے دن نواب چھٹن کے ہاں ایک پُرتکلف ضیافت کا انتظام تھا۔ شہر بھر کے رئیس اور اعلیٰ عہدیدار مدعو تھے۔ کچھ مہمان آ چکے تھے کچھ آ رہے تھے کہ نواب چھٹن اپنے دوست سر افتخار علی کے ساتھ باتیں کرتے کرتے باغ کی طرف آ نکلے۔ اتنے میں کسی نے پکارا۔ "چھٹن"۔ نواب صاحب گھبرا گئے، نظر اٹھا کر دیکھا تو سامنے دو چھوٹے چھوٹے لڑکے نظر آئے۔ ان میں سے ایک نے صرف غزقی باندھ رکھی تھی۔ دوسرا صرف کرتہ پہنے ہوئے تھا۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ایک ٹوکری بھی تھی۔ انھیں دیکھ کر وہ آگے بڑھا اور کہنے لگا تم میں سے نواب چھٹن کس کا نام ہے؟"

"نواب نے آگے بڑھ کر کہا میں ہوں۔"

نواب چھٹن لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولے "کیا تم سے میری جان پہچان ہے؟"

"بس بھول گئے؟"

"نہیں تو ——— تمھارا چہرہ کچھ چشم آشنا معلوم ہوتا ہے۔ یاد نہیں آتا تمھیں کہاں دیکھا ہے؟"

"وہ نہر کی بات یاد ہے؟"

"ہاں اب یاد آیا۔ آؤ اندر چلو۔"

نہر کا نام سن کر خدمت گار بہت گھبرایا کہ خدا جانے کیا قصہ ہے۔ دم بھر میں یہ خبر سارے نوکروں میں مشہور ہو گئی اور طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔

نواب چھٹن شیخ شبراتی کو دیوان خانے میں بٹھا کے کہنے لگے : "اب مجھے یاد آیا رات کو میں نہر میں غوطے کھا رہا تھا کہ تم نے میری جان بچائی۔"

"اماں اسے بھول بھی جاؤ۔"

"کیسے بھولوں بھائی، تمھارا بڑا احسان ہے مجھے پر، اب کہو تمھاری کیا خدمت کروں۔"

"کچھ بھی نہیں میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے گرمیوں میں شربت بیچتا ہوں، جاڑے میں نان کباب، ایک مرغی خانہ بھی کھول رکھا ہے۔ انڈوں اور مرغیوں سے بھی خاصا منافع ہو جاتا ہے اور کیا چاہیے۔ ہم تم دوست ٹھہرے۔ اب دوست سے کوئی کیا مانگے؟"

"ہم تم دوست تو ہیں لیکن پھر بھی مجھے تمھارے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیے۔"

"تمھیں ایسا ہی اصرار ہے تو اپنے ہاں کے سنگتروں کی ایک ٹوکری بھجوا دو اور بھجوانا کیا ہے، میں خود ہی لیے جاتا ہوں۔"

غرض شیخ شبراتی نے باغ میں پہنچ کر اچھے اچھے سنگترے چھانٹے اور انھیں لے کر گھر کا رخ کیا لیکن اتفاق یہ کہ نواب سے اس کی جو باتیں ہوئی تھیں وہ باورچی کے چھوکرے نے سن پائیں۔ اس نے اپنے باپ کو سارا قصہ سنایا۔ اس نے بوا للیفن سے کہا اور بوا للیفن نے نواب چھٹن کی خالہ خورشید لقا بیگم کو جا سنایا۔ یہ بیگم بڑی سلیقے والی اور دانشمند خاتون تھی۔ نواب کی جاگیر کا سارا انتظام اسی کے ہاتھوں میں تھا۔ اس نے سنا تو نواب کو بلا بھیجا اور کہا: "چھٹن! میں یہ کیا سنتی ہوں؟ تم نے کس موئے خدائی خوار کو سر چڑھا رکھا ہے؟"

نواب چھٹن کچھ دیر تو سر نیہوڑائے کھڑے رہے۔ پھر بولے: "میں کیا کروں؟ اس کمبخت کا مجھ پر احسان ہے۔ میری جان بچائی ہے اس نے۔"

خورشید لقا بیگم تنک کر بولیں: "جان بچائی ہے تو کچھ دے دلا کر رخصت کرو۔ ایسے لُچے شُہدوں سے یوں ربط ضبط بڑھانا ٹھیک نہیں۔"

نواب چھٹن نے کچھ جواب نہ دیا اور دیوان خانے میں آ گئے۔ دوسرے دن نواب چھٹن کے ہاں ایک پُر تکلّف ضیافت کا انتظام تھا۔ شہر بھر کے رئیس اور اعلیٰ عہدیدار مدعو تھے۔ کچھ مہمان آ چکے تھے کچھ آ رہے تھے کہ نواب چھٹن اپنے دوست سر افتخار علی کے ساتھ باتیں کرتے کرتے باغ کی طرف آ نکلے۔ اتنے میں کسی نے پکارا۔ "چھٹن"۔ نواب صاحب گھبرا گئے، نظر اٹھا کر دیکھا تو سامنے دو چھوٹے چھوٹے لڑکے نظر آئے۔ ان میں سے ایک نے صرف غرقِی باندھ رکھی تھی۔ دوسرا صرف کرتہ پہنے ہوئے تھا۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ایک ٹوکری بھی تھی۔ انھیں دیکھ کر وہ آگے بڑھا اور کہنے لگا تم میں سے نواب چھٹن کس کا نام ہے؟"

"نواب نے آگے بڑھ کر کہا میں ہوں۔"

لڑکا بولا : "اچھا تم ہو وہ نواب جسے میرے ابا نے نہر سے نکالا تھا۔ ہم دونوں بھائی تمھیں دیکھنے آئے ہیں۔ ابا نے سنگتروں کا بہت بہت شکریہ ادا کیا ہے اور یہ ٹوکری واپس بھیجی ہے۔"

سر افتخار علی کہنے لگے : "یہ عجیب واقعہ ہے۔"

نواب چھٹن بولے : "ہاں بھائی، بات یہ ہے میں پرسوں رات نہر میں گر پڑا تھا۔"

ان دنوں خورشید لقا بیگم کو نواب چھٹن کے بیاہ کی بہت فکر تھی۔ بہتیرے پیغام آئے لیکن نواب چھٹن نے کوئی رشتہ پسند نہ کیا۔ دراصل وہ مسٹر لطیف احمد بیرسٹر کی صاحبزادی زہراء لطیف سے بیاہ رچانے کی فکر میں تھے۔ لڑکی ایک تو بڑی حسین دوسرے اس نے پڑھنے لکھنے میں مردوں کے کان کاٹے تھے۔ نواب کی خالہ کو اس رشتے پر اگر کوئی اعتراض تھا تو صرف یہ کہ زہراء لطیف پردہ نہیں کرتی تھی لیکن نواب صاحب نے منت خوشامد کر کے خالہ کو رضامند کر لیا۔ ایک شام کا ذکر ہے۔ نواب چھٹن زہراء کو سینما دکھانے لے گئے۔ پکے پل کے قریب ان کی موٹر کوئی لمحہ بھر کے لیے رکی تھی کہ آواز آئی "ذرا ٹھہرے رہیے میں آیا۔" نواب چھٹن نے دیکھا کہ شیخ شبراتی سر پر انڈوں کی ٹوکری اٹھائے بغل میں مرغیاں دابے چلے آ رہے تھے۔ کمبخت آتے ہی موٹر کا دروازہ کھول کر اندر گھس گیا اور کہنے لگا : "یار تمھیں تکلیف تو ہو گی لیکن جمن بھٹیارے کے ہاں یہ مرغیاں اور انڈے پہنچانا ہیں۔ مجھے اگلے نکڑ پر اتار دیجیے اور دوست یہ نیک بخت کون ہیں؟ آداب عرض کرتا ہوں۔ مزاج اچھے ہیں آپ کے؟"

نواب پر تو گھڑوں پانی پڑ گیا لیکن بچارہ کہے تو کیا کہے۔ اتنے میں اگلا نکڑ آیا اور شیخ شبراتی آداب عرض کر کے رخصت ہوا۔ ادھر راستہ بھر زہراء لطیف نے نواب سے بات نہیں کی۔ نواب نے بہتیرا کہا : "بات یہ ہے بات یہ ہے" لیکن بے

سود۔ سنیما میں بھی وقت بڑی بے لطفی سے کٹا۔

دوسرے دن زہراء نے لکھ بھیجا کہ میں آپ سے راہ و رسم بڑھانا نہیں چاہتی۔ بیگم خورشید لقا کو معلوم ہوا تو وہ بہت بگڑیں اور نواب چھٹن سے کہنے لگیں "تم نے خاندان کی عزت خاک میں ملا دی میں اب اس کمبخت سے پیچھا چھڑانے کی کوئی تدبیر کرتی ہوں۔"

یہ کہ کر داروغہ کو بلایا اور اس سے شیخ شبراتی کے نام اس مضمون کا خط لکھوایا کہ "تم نے نواب چھٹن کی جان بچائی ہے اس لیے ڈیڑھ ہزار روپے کی رقم تمھاری نذر کی جاتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ آئندہ نیلی کوٹھی میں قدم نہ رکھو کیونکہ نواب چھٹن تم سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتے۔ خط کے ساتھ ڈیڑھ ہزار روپے کا چیک تھا۔"

دوسرے دن نواب چھٹن چھنامل بزاز کی دکان سے کچھ کپڑے خرید رہے تھے کہ شیخ شبراتی نے آلیا اور کہنے لگا۔

"میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ سامنے چائے کی دکان ہے، وہاں پانچ منٹ کے لیے چل بیٹھو۔"

نواب نے کہا "لیکن بات یہ ہے کہ ــــــــ"

شیخ شبراتی نے بات کاٹ کر کہا: "تو اچھا یہیں بات کر لیتا ہوں۔ آج مجھے ایک خط ملا ہے۔ تمھاری اس بڑھیا خالہ نے لکھوایا ہو گا۔"

نواب کی زبان سے صرف اتنا نکلا: "دیکھو دیکھو۔"

شبراتی نے جواب دیا: "دیکھوں کیا۔ اس نے مجھے ڈیڑھ ہزار روپے کا چیک بھیجا ہے۔ میں روپے کا بھوکا تو نہیں مگر اس خیال سے قبول کر لیا کہ تمھاری دل شکنی نہ ہو۔ ہاں تو خط میں لکھا ہے کہ نواب تم سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔

میں پوچھتا ہوں یہ کیا حرکت ہے میں نے تم سے کیا برائی کی ہے؟"

نواب نے کہا: "قسم ہے قسم ہے جنابِ امیر کی۔۔۔"

شیخ شبراتی گرج کر بولا: "یہی ہے میرے احسان کا بدلہ۔ اگر میں اس رات جان پر کھیل کر تمھیں نہر سے نہ نکالتا تو آج تم کہاں ہوتے۔ ارے مجھ ایسے دوست سے تمھارا یہ سلوک ہے۔ مجھ ایسے دوست سے، جس نے تمھاری جان بچائی۔ میں تو تمھیں دوست سمجھتا تھا، جگری دوست۔"

اتنے میں لوگ جمع ہو گئے۔ نواب فضیحتے کے ڈر سے بولا: "بھائی مجھے تو خبر بھی نہیں۔ خالہ اماں نے مجھ سے پوچھے بغیر تمھیں خط لکھوا دیا۔"

یہ سن کر شیخ شبراتی کا غصہ دھیما ہوا اور کہنے لگا: "یہ تو مجھے بھی شبہہ ہوا تھا۔ خیر اس قصے کو جانے دو، آؤ چل کے چائے پئیں۔"

جمن بھٹیارا آج تک ہر گاہک سے کہتا ہے کہ میرے ہاں نواب چھٹن اکثر چائے پینے آتے رہے ہیں۔

نواب آٹھ دن تک گھر سے باہر نہیں نکلے۔ خورشید لقا بیگم بھی اٹوانی کھٹوانی لیے پڑی ہیں۔ نویں دن نواب ٹہلتے ٹہلتے پھاٹک تک آئے کہ سامنے سے آواز آئی "نواب صاحب۔"

سڑک کے اس پار ایک چھوٹا سا مکان تھا جس کے سامنے شیخ شبراتی کے دونوں صاحبزادے کھڑے تھے۔ اتنے میں شبراتی کا چہرہ دکھائی دیا۔ اس نے دونوں لڑکوں کو ایک ایک چانٹا رسید کیا اور نواب کے قریب پہنچ کر کہنے لگا: "یہ مکان مدت سے بکاؤ تھا تم نے جو ڈیڑھ ہزار روپیہ بھیجا تو میں نے سوچا کہ مکان ہی کیوں نہ خرید لوں؟"

اب تمھارے پڑوسی ہیں ہم۔ آؤ نواب! تمھیں مکان دکھاؤں۔" نواب

نے سر کھجایا "پھر کبھی سہی۔"

رات کو نواب چھٹن خورشید لقا بیگم سے کہنے لگے :"خالہ اماں ! آپ نے شیخ شبراتی سے خوب پیچھا چھڑایا۔ اس ڈیڑھ ہزار روپے سے شیخ صاحب نے ہمارے پڑوس میں ایک مکان خرید لیا ہے۔ اب وہ رات دن میرے سر پر مُسَلّط رہیں گے۔"

۲۳ جون ۱۹۲۷ء کی رات کو نہر کے پاس ایک ٹوپی پڑی پائی گئی۔ تھوڑی دیر میں پولیس والے نیلی کوٹھی کے نواب چھٹن کو نہر سے کھینچ کنارے لے آئے۔ نواب میں صرف ایک رمق جان باقی رہ گئی تھی۔

اب نہر کے کنارے کوئی کیلے کا چھلکا بھی باقی نہیں تھا۔

(کیلے کا چھلکا از چراغ حسن حسرت)

سوالات

۱۔ خورشید لقا بیگم کون تھیں ؟ انھیں چھٹن اور شبراتی کی ملاقات کیوں ناپسند تھی؟

۲۔ خورشید لقا بیگم نے شیخ شبراتی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے کیا تدبیر کی اور اس کا کیا نتیجہ نکلا؟

۳۔ کہانی کے آخر میں نواب چھٹن دوبارہ نہر میں گر پڑے اس کا سبب کیا تھا؟

۴۔ اس کہانی کو اختصار کے ساتھ اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔

۵۔ مندرجہ ذیل بیانات کی تکمیل کے لیے نیچے دیے ہوئے جوابات میں سے درست جواب منتخب کیجیے اور اس کا حرفی نمبر جوابی کالم میں درج کیجیے:۔

(i) نواب چھٹن نہر میں اس لیے گر پڑے کہ ـــــــ

جوابی کالم

(الف) زیادہ کھا گئے تھے۔
(ب) کیلے کے چھلکے پر سے پاؤں پھسلا۔
(ج) دھیان کسی اور طرف لگا تھا۔
(د) کسی دشمن نے دھکا دے دیا تھا۔

(ii) شیخ شبراتی نے ڈوبتے ہوئے نواب چھٹن کی آواز سنی تو ——

(الف) نہر میں کود کر نواب کو بالوں سے پکڑ لیا۔
(ب) ڈر کر بھاگ گیا۔
(ج) شور وغل مچا کر لوگوں کو اکٹھا کر لیا۔
(د) زار و قطار رونے لگا۔

(iii) شیخ شبراتی کون تھا؟ ——

(الف) وہ ایک بڑا سوداگر تھا۔
(ب) ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔
(ج) شربت فروشی، نان کباب اور مرغ بانی کا کاروبار کرتا تھا۔
(د) نواب چھٹن کا دوست تھا۔

(iv) جب نواب چھٹن نیلی کوٹھی میں داخل ہوئے تو شیخ شبراتی سمجھا کہ وہ ——

(الف) وہ نیلی کوٹھی کے مالک ہیں۔
(ب) نیلی کوٹھی میں مہمان کے طور پر مقیم ہیں۔
(ج) نیلی کوٹھی والوں سے ملنے آئے ہیں۔
(د) نیلی کوٹھی کے سائیس، خانساماں یا داروغہ ہیں۔

۶۔ مندرجہ ذیل محاورات کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:۔

کان کاٹنا۔ گھڑوں پانی پڑنا۔ خاک میں ملانا۔ اٹواٹی کھٹواٹی لیے پڑے رہنا۔ سر چڑھانا۔

۷۔ وہ اسم جس میں وقت یا جگہ کے معانی پائے جائیں، **اسم ظرف** کہلاتا ہے۔ جو اسمِ ظرف وقت یا زمانے کے معنیٰ دے، اسے **ظرفِ زمان** کہتے ہیں مثلاً صبح دوپہر وغیرہ اور جو اسمِ ظرف جگہ یا مقام کے معنیٰ دے، اسے **ظرفِ مکاں** کہتے ہیں مثلاً باغ مدرسہ وغیرہ۔ وہ اسم جو کسی اوزار یا ہتھیار کا نام ہو، **اسمِ آلہ** کہلاتا ہے مثلاً قلم، تلوار، کلہاڑی وغیرہ۔

(الف) اس سبق سے پانچ اسمائے ظرف تلاش کیجیےاور بتائیے کہ یہ ظرفِ مکاں ہیں یا ظرفِ زماں۔

(ب) اپنے گھر میں استعمال ہونے والی اشیاء میں سے ان چیزوں کے نام لکھیے جو قواعد کی رو سے اسم آلہ کہلا سکتی ہیں۔

۸۔ نیچے دیے ہوئے جملوں میں خالی جگہ درج ذیل سابقوں اور لاحقوں سے پُر کیجیے اور صحیح جواب جوابی کالم میں جملوں کے سامنے درج کیجیے:۔

بد۔ آرائیاں۔ عالی۔ گار۔ پُر۔ نا۔

	جوابی کالم
۱۔خدا جانے کس ____ شُدنی نے وہاں پھینک دیا تھا۔	
۲۔نواب ____ قدر غڑاپ سے نہر میں جا رہے۔	
۳۔یک خدمت ____ نے بڑھ کر روکا۔	
۴۔بے چارہ شیخ ____ حواس ہو گیا۔	
۵۔رح طرح کی قیاس ____ ہونے لگیں۔	
۶۔ سرے دن نواب چھٹن کے ہاں ____ تکلف ضیافت ہوئی۔	

۹۔ ، چند کثیر الاستعمال الفاظ کے دو دو تلفظ اعراب کے ذریعے واضح کیے گئے

ہیں۔ ان میں ایک صحیح ہے۔ ہر گروپ کے سامنے جوابی کالم میں صحیح تلفظ کا حرفی نمبر درج کیجیے۔

نمبر شمار	الفاظ		جوابی کالم
۱۔	(الف) اِتِّفَاق	(ب) اِتِّفَاق	
۲۔	(الف) قِیَاس	(ب) قُیَاس	
۳۔	(الف) اُضْرَار	(ب) اِضْرَار	
۴۔	(الف) قُدَر	(ب) قَدْر	
۵۔	(الف) تُکَلُّف	(ب) تَکَلُّف	
۶۔	(الف) نَذَر	(ب) نَذْر	

~~~~~~~~~~~
~~~~~~~~~~~

گھر سے گھر تک

حاجی مقتدا احمد کے دیوان خانے میں قدم رکھتے ہی شیخ نورالزمان کی بیوی عشرت خانم، ان کی بیٹی ہما اور بیٹے وُقار کا سارا رعب داب صابن کے جھاگ کی طرح آناً" فاناً" غائب ہو گیا۔ یہ لوگ جس کار میں حاجی صاحب کے ہاں آئے تھے وہ اتنی لمبی تھی کہ اگر ہوائی اڈے پر کھلے دروازوں کے ساتھ کھڑی ہوتی تو لوگ اسے طیارہ سمجھ بیٹھتے۔ حاجی صاحب کی گلی میں مڑتے ہوئے ڈرائیور کو اسی لیے خاصی دقت ہوئی تھی۔ پھر یہ کار جتنی لمبی تھی اتنی ہی خوبصورت اور چمکیلی بھی تھی۔ اسے دیکھ کر عام آدمی کا ایکا ایکی جی چاہتا تھا کہ اسے چھونا اور محسوس کرنا چاہیے مگر فوراً خیال آتا تھا کہ اس ٹھاٹھ کی کار کو چھونا یقیناً خلافِ قانون ہو گا اور پولیس پکڑ کر لے جائے گی۔

کار حاجی مقتدا احمد کے مکان کے سامنے رکی تو باوردی ڈرائیور نے اتر کر کار کے باقی تینوں دروازے کھولے۔ عشرت خانم، ہما اور وُقار پھول میں سے بھونروں کی طرح بر آمد ہوئے۔ پھر ڈرائیور نے ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ تینوں دروازے تڑاخ تڑاخ بند کیے تو گلی کے اِس سرے سے اُس سرے تک کھڑکیوں میں سے جھانکتی ہوئی عورتوں اور آدھی لٹکتی ہوئی لڑکیوں کے کلیجے دھک سے رہ گئے۔ ڈرائیور بائیں بازو کو ہوا میں لہرا کر کلائی کو آنکھوں کے قریب لایا اور گھڑی میں وقت دیکھا۔ پھر اپنی سیٹ پر بیٹھ کر مونچھیں مروڑنے لگا۔

حاجی مقتدا احمد کی بیوی نورالنساء نے دروازے پر عشرت خانم، ہما اور وقار کا استقبال کیا اور کار کی طرف یوں دیکھا جیسے بچے پیسٹری کی طرف دیکھتے ہیں۔ پھر جب تینوں مہمان حاجی صاحب کے دیوان خانے کا ریشمی پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوئے

تو پائدان پر ذرا دیر کو یوں کھڑے رہ گئے جیسے آگے قدم بڑھایا تو بے ادبی کا ارتکاب کر بیٹھیں گے۔

سب سے آگے عشرت خانم تھیں۔ انھوں نے قالین پر قدم رکھا تو ڈگمگا گئیں جیسے پھسلنے سے بچی ہیں۔ پلٹ کر انھوں نے ہما کی طرف دیکھا اور شلوار کے پائنچوں کو ذرا سا اٹھا کر صوفے کی طرف بڑھیں جیسے تالاب میں اترنے چلی ہیں۔ ہما اور وقار پر بھی کم وبیش یہی عالم گزر گیا۔ نور النساء نے سلیپر پائدان پر اتار دیے اور ایک ڈگ بھر کر تخت کے پاس کھڑی ہو گئیں۔ سب اپنی اپنی جگھوں پر بیٹھنے لگے تو وقار ایک قدم پیچھے ہٹ کر دروازے کے پاس پلش میں لپٹے ہوئے ایک مونڈھے پر دربان کی طرح بیٹھ گیا۔

نور النساء چونک کر بولیں۔ "اے ہے وقار میاں، یہ کیا کر رہے ہو؟ اے بہن عشرت خانم، اسے سمجھایئے۔ یہ بھی کوئی بات ہے کہ وہیں مونڈھے ہی پر ٹک گیا۔ اٹھو میاں اٹھو صوفے کس لیے رکھے ہیں؟"

عشرت خانم نے وقار سے کہا: "سن رہے ہو میاں، تمھاری خالہ جان کیا کہ رہی ہیں۔"

وقار کچھ اس طرح چل کر صوفے کی طرف گیا جیسے ایک ایک سیڑھی چھوڑ کر زینہ اترا ہے۔

اس کے بعد تکلفات شروع ہوئے۔ تہذیب برتی جانے لگی، موسم کی بوالعجبیوں کا ذکر چلا۔ پھر نور النساء اٹھیں۔ "ہائے میں نے معصومہ کو تو بتایا ہی نہیں کہ تمھاری خالہ جان آئی ہیں۔"

وقار جو دائیں ٹانگ کو بائیں ٹانگ پر رکھے بیٹھا تھا۔ بائیں ٹانگ کو دائیں ٹانگ پر رکھ کر اور ہما کی طرف دیکھتے ہوئے یوں سکڑا جیسے کہ رہا ہے۔ "دیکھیے باجی، انھیں منع کر لیجیے۔"

ہما سرسراتے ہوئے ریشم کے لباس کو سنبھالتی ہوئی اٹھی اور مسکرا کر بولی "آپ تشریف رکھیے خالہ جان، معصومہ کو میں لیے آتی ہوں۔"

نورالنساء فوراً بولیں "نہیں نہیں ہما بیٹی تم بیٹھو میں نوکروں سے چائے لگانے کو بھی تو کہ دوں۔"

نورالنساء سلیپر پٹخاتی سیڑھیوں پر چڑھنے لگیں تو ہما بولیں "دیکھا اماں! میں نہ کہتی تھی؟"

"اسی لیے تو میں آتی نہیں تھی۔" عشرت خانم بولیں "سمجھ میں نہیں آتا حاجی صاحب نے اتنی بہت سی دولت کہاں سے بٹور رکھی ہے؟"

"غالیچہ دیکھیے جیسے سمندر کا جھاگ ہے۔" ہما نے ہاتھ بڑھا کر غالیچے میں انگلیوں کی پوریں ڈبو دیں۔ "پاؤں رکھو تو تھاہ نہ پاؤ۔ ایک ہزار کا تو ہو گا۔"

"ایک ہزار کا؟" وقار پہلی بار بولا: "کمال کرتی ہیں باجی ۔ دس ہزار کہئے۔"

"آہستہ بولو" ہما نے آہستہ سے کہا۔ "جب لڑکیوں کو دیکھنے آتے ہیں تو آہستہ بولتے ہیں۔ یوں سمجھو کو ہر پردے کے پیچھے کوئی کھڑا تمہاری باتیں سن رہا ہے۔"

"دس ہزار کا اگر صرف یہ غالیچہ ہے تو اس دیوان خانے کا پورا سامان ایک لاکھ سے کم کا کیا ہو گا۔" عشرت خانم نے صوفے میں گھوم کر پورے دیوان خانے پر نظریں دوڑائیں۔ "ایک لاکھ کوئی معمولی رقم نہیں ہے، منہ میں سماتی ہے، جیب میں رکھو تو پھٹ کر نیچے جا پڑے۔"

ہما جو دروازے کے قریب والے صوفے پر بیٹھی تھی، جھکتے ہوئے پردے کو چھو کر کہنے لگی: "خالص ریشم کے تو پردے ہیں۔" پھر وہ پردے کو ذرا سا جھٹک

کر بولی :"یہ دیکھیے - ذرا سی شکن جو پیدا ہوتی ہے وہ پانی کی لہر کی طرح آخر تک چلی جاتی ہے۔ یہ دیکھیے، یہ دیکھیے۔" ہما نے پردے کو دو تین بار جھٹکا۔

"اے رہنے دے۔" عشرت خانم نے سرزنش کی۔ "کیا کر رہی ہے پردہ گر پڑے گا۔" پھر دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت سے پردے گنتی ہوئی بولیں: "ایک دو تین چار پانچ اور چھے۔ اکٹھے چھے پردے ہیں ایک جیسے۔"

"کچھ نہیں تو چھے سو کے تو یہی ہوں گے۔" ہما بولی۔

"لیجیے اور سنیے" وقار تڑپ اٹھا۔ "باجی تو کمال کر رہی ہیں دو ہزار سے کم کے نہیں ہوں گے۔ لکھوا لیجیے مجھ سے۔"

"صوفا دیکھیے بالکل نئے فیشن کا ہے۔" ہما نے تبصرہ جاری رکھا "تپائیوں پر رکھے ہوئے عجائبات دیکھیے! وقار، مینٹل پیس پر وہ جو ہرن رکھا ہے وہ مٹی کا ہے کہ لکڑی کا؟"

وقار نے ہرن کی طرف جوہری کی طرح دیکھتے ہوئے کہا۔ "نہ مٹی کا ہے نہ لکڑی کا۔ مجھے تو کسی قیمتی پتھر کا معلوم ہوتا ہے شاید عقیق کا ہے۔"

"عقیق کا؟" عشرت خانم ہرن کو دیکھنے کے لیے آدھی اٹھ گئیں۔ بڑے بڑے گھروں کے دیوان خانے دیکھے ہیں۔" ہما نے جھوم کر کہا: "ایسے ٹھاٹھ کہیں نظر نہیں آئے۔"

عشرت خانم ہاتھ مل کر بولیں: "اتنے بڑے گھر کی لڑکی جانے مزاج کی کیسی ہو گی۔"

"میں نے تو کہا تھا پہلے دیکھ داکھ لیجیے۔" وقار نے کہا۔ "ہما سے پوچھو"۔ عشرت خانم بولیں۔ "مجھے تو یہی گھسیٹے لیے پھر رہی ہے۔"

"تو کیا ہے اماں؟" ہما بولی: "اس میں نقصان کون سا ہے۔ اتنا بہت سا جہیز ملے گا؟"

"تم بھی تو اتنے بڑے گھر کی بہو بن کر گئی تھیں۔" عشرت خانم اداس ہو گئیں۔ "بتاؤ کیا ملا؟"

"چپ" ہما نے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی۔

تینوں یوں سنبھل بیٹھیں جیسے ان کی تصویر اترنے والی ہے۔ سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ آ رہی تھی۔ ساتھ ہی بغل والے کمرے میں ریشمی پردے کے ادھر چینی کے برتن بجنے لگے تھے۔

نورالنساء پردہ ہٹا کر بولیں :" آ جا بیٹی۔ شرمانے کی کون سی بات ہے اپنی خالہ ہیں۔ اپنی باجی ہما ہیں جن سے تو سلیمہ کے ہاں ملی تھی۔ سب اپنے ہیں۔ آجا۔"

معصومہ کی صورت میں ریشم اور نائلون کا ایک ڈھیر دیوان خانے میں داخل ہوا۔ وقار ادب سے کھڑا ہو گیا۔ عشرت خانم اور ہما نے معصومہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور نورالنساء نے معصومہ کو وقار کے بالکل سامنے والے صوفے پر بٹھا دیا۔

معصومہ نے ایک دو بار سر پر سے کھسکتے ہوئے دوپٹے کو درست کرنے کے لیے اپنا ہاتھ یوں ہولے سے اٹھایا جیسے ذرا تیزی سے اٹھایا تو ریشم کہیں نہ کہیں سے ضرور مسک جائے گا۔ وہ عمر کے اس حصے میں تھی جہاں بدصورتی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ہما معصومہ سے باتیں کرنے کی کوشش کرتی رہی مگر "جی یا جی نہیں" سے زیادہ اسے کسی سوال کا جواب نہ ملا۔ وقار معصومہ کو یوں چوری چوری دیکھتا رہا جیسے اپنے مکان کی چھت پر کھڑا ہے۔ نورالنساء معصومہ کی سلیقہ مندیوں اور کشیدہ کاریوں کے قصے سناتی رہیں اور عشرت خانم "ماشاء اللہ، ماشاء اللہ" سے جواب دیتی رہیں۔

پھر جب لٹھے کی صاف ستھری شلوار قمیض میں ملبوس ملازم نے بغل والے کمرے کا دروازہ کھول کر پردہ سرکایا اور سب لوگ طعام گاہ میں داخل ہوئے تو

عشرت خانم تو جیسے گونگی ہو کر رہ گئیں۔ اتنی بڑی میز پر بچھے ہوئے منقش پلاسٹک پر انھیں ایسی کراکری نظر آئی، جس کے بارے میں انھوں نے بازار میں گزرتے ہوئے کئی بار کہا تھا کہ ایسے برتنوں کے لیے دو ہی جگہیں مناسب ہیں۔ دکانوں کے شو کیس یا وزیر وزراء کی طعام گاہیں۔ مگر یہ تو حاجی مقتدا احمد کا گھر تھا۔ جس کے بارے میں ہما نے انھیں بتایا تھا کہ منیاری کی دکان ہے اور خاصے کھاتے پیتے آدمی ہیں۔ عشرت خانم نے سوچا یہ تو خاصے کھاتے پیتے چھلکاتے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ طعام گاہ کے بڑے پن کو صرف ایک ریفریجریٹر کی کمی نے ٹھیس پہنچا رکھی تھی یا معصومہ کی انتہا درجے کی شرم وحیا نے۔ معصومہ نے نہ تو بڑے گھروں کی لڑکیوں کی طرح چمک چمک کر چائے بنائی۔ نہ کوئی پلیٹ اٹھا کر وقار چھوڑ، ہما اور عشرت خانم تک سے کہا کہ یہ خاص میرے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیز ہے۔ نہ اس نے کسی ذرا سی بات پر بڑا سا قہقہہ لگایا اور نہ اس انداز سے تعجب کا اظہار کیا کہ سب لوگوں کی نگاہیں اس پر گڑ جاتیں اور اس کی بھوؤں کے کٹیلے پن اور آنکھوں کے ہوشربا طول و عرض سے لے کر اس کی لمبی گردن کے مرمر تک کا جائزہ لے آتیں' وہ ہما اور اپنی اماں کے درمیان بیٹھی دیر تک مسلسل ایک ہی بسکٹ کو ذرا ذرا سا چکھتی رہی اور پیالی میں سے ایک ایک قطرہ چائے پی کر پرچ میں اسے یوں کوئی آواز پیدا کیے بغیر رکھتی رہی جیسے پیالی اور پرچ دونوں گتے سے بنی ہیں۔

"حاجی صاحب جب عدن میں بزنس کرتے تھے۔" نورالنساء نے بتایا۔ "تو وہ دنیا جہاں کے عجائبات اپنے گھر میں بھرتے رہے، چھے قسم کے تو صرف چائے کے روسی سیٹ تھے۔ کافی کے تین سیٹ انھوں نے ولایت جانے والے ایک دوست کے ہاتھ جرمن کے ملک سے منگائے اور ان کی قیمت جو ادا کی اس کا اندازہ آپ سے زیادہ کس کو ہو گا۔ ایران سے وہ جس آدمی کے ہاں سے قالین منگاتے تھے وہ ان سے یوں خط و کتابت کرتا تھا جیسے حاجی صاحب عدن میں قالینوں کے سوداگر ہیں۔ ایک بار انھیں کھانے کے کمرے کی میزیں خریدنے کا شوق چرایا تو ایک دو سال کے

اندر ساگوان کی اکھٹی پانچ میزیں جمع کر لیں۔ میں چیخی چلائی تو بجائے اس کے کہ نیلام کر دیتے، اپنے انگریز دوستوں کو مفت میں دے آئے۔ نیلام کرتے تو چار پانچ ہزار روپے تو ضرور آجاتے۔ اب آپ سے زیادہ کس کو اندازہ ہو گا کہ اگر نیلام کے دام یہ ہیں تو اصل قیمت کیا ہو گی۔ پھر جب اتنے بڑے بنگلے میں ایک نیا تنکا تک رکھنے کی جگہ نہ رہی اور ادھر اپنے وطن کی آزادی کے بعد انھوں نے واپسی کا فیصلہ کر لیا تو ساری عمر کی کمائی وہیں اونے پونے بیچنا پڑی۔ بڑے بڑے انگریز افسروں ا ر عرب شیخوں نے آکر بولیاں دیں۔ گھر سے باہر بازار لگ گیا۔ معصومہ اس وقت یہی کوئی پانچ سال کی ہو گی۔ اسے بھی یاد ہو گا کہ اس روز کیسے سارا عدن ہمارے گھر سے باہر امنڈ پڑا تھا۔ یاد ہے بیٹی؟"

"جی" معصومہ بولی۔

"اور بہن عشرت خانم۔" نورالنساء نے کہنا شروع کیا۔ "واپس وطن آکر——"

باہر کا دروازہ کھلا اور صاف ستھرے ملازم نے اندر آکر پوچھا۔ "اور چائے لا دوں بی بی؟"

لے آؤ۔ نورالنساء فوراً بولیں۔

عشرت خانم اور ہما چلا اٹھیں۔ " نہیں نہیں۔ ابھی رکھی ہے۔"

کچھ دیر خاموشی رہی اور ملازم بڑے ادب سے وہیں کھڑا رہا۔

سلسلہ کلام جاری رکھنے کے لیے نورالنساء نے گلا صاف کیا اور عشرت خانم کی طرف متوجہ ہوئیں مگر فوراً سیدھی ہو بیٹھیں اور بولیں :" ضرورت ہوئی تو بلا لیں گے۔ جاؤ۔"

ملازم چلا گیا تو نورالنساء بولیں :"تو بہن ۔ وہ میں کہہ رہی تھی کہ وطن

واپس آکر حاجی صاحب نے کتابیں جمع کرنے کا سلسلہ شروع کیا تو اب تک ختم ہونے میں نہیں آیا۔ ادھر جس کمرے میں بھی جایئے۔ کتابیں ہی کتابیں ٹھنسی پڑی ہیں۔ معصومہ اور میں کسی اور بات کی عادی تھیں۔ سو یہ سب غریبانہ چیزیں جو آپ کو یہاں نظر آرہی ہیں وہ ہم دونوں ہی کی دوڑ بھاگ کا نتیجہ ہیں۔ چیزیں میں نے جمع کر دی ہیں۔ انھیں ترتیب سے لگانے کا سلیقہ معصومہ کا ہے۔"

"ماشاء اللہ، ماشاء اللہ۔" عشرت خانم بولیں۔

"سلیقہ ہی تو سب کچھ ہے۔" ہما بولی۔" ورنہ مشین تو آدمی سے بھی زیادہ تیزی سے کام کر سکتی ہے۔"

وقار اپنے مکان کی چھت پر کھڑا نظر آنے لگا۔

واپس دیوان خانے میں آکر سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے مگر معصومہ کھڑی رہی اور اسے کھڑا دیکھ کر وقار بھی ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر نورالنساء نے کہا: "ادھر آج میری بیٹی جمیلہ کے بچے آئے ہوئے ہیں۔ صبح سے دھما چوکڑی مچا رکھی ہے۔ معصومہ کو اجازت دیجیے کہ جا کر انھیں سنبھالے۔ چائے پینے میں کپڑے سان لیں گے۔ چھوٹے چھوٹے سے ہیں۔"

ہاں ہاں کیوں نہیں۔ عشرت خانم بولیں۔

"میں بس ایک منٹ میں حاضر ہوئی۔" نورالنساء نے کہا اور بیٹی کے ساتھ باہر چلی گئیں۔ چند منٹ تک ماں، بیٹی اور بیٹا چپ چاپ بیٹھے رہے۔ جیسے مینار کی سیڑھیاں طے کرنے کے بعد چوٹی پر آئے ہیں تو چکرا گئے ہیں۔

"اماں جی۔" ہما بولی، "دیکھا؟"

عشرت خانم ابھی جواب نہیں دے پائی تھیں کہ باہر سے ڈرائیور کی آواز آئی۔"بی بی جی۔"

"کیا بات ہے؟" عشرت خانم جلدی سے باہر نکلیں۔ ڈرائیور کی بات سن کر بولیں : "بس کوئی پانچ منٹ میں ۔ زیادہ نہیں۔" ڈرائیور واپس اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔ عشرت خانم نے اوپر جاتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔ ذرا دیر کھڑی سوچتی رہیں۔ پھر دیوان خانے کے دروازے کا پردہ ہٹا کر بولیں :"تم دونوں یہیں بیٹھو ۔ میں ایک منٹ میں اوپر سے ہو کر آتی ہوں۔ نورالنساء کے نواسوں کو ایک ایک روپیہ دے آؤں۔"

"ایک ایک روپیہ ؟" ہما بولی۔ "نہیں اماں ۔ دو دو دیجیے گا۔ کیوں وقار۔؟"

"اماں کی مرضی ہے۔" وقار بولا۔

دو دو دے دوں گی پر نہ جانے ہیں کتنے ؟عشرت خانم سوچنے لگیں۔ ہما نے بڑی ناگواری سے کہا :"افوہ اماں ، کبھی کبھی تو آپ حد کر دیتی ہیں۔ جتنے بھی ہوں پر دیجیے گا دو دو۔"

عشرت خانم نے کچھ کہے بغیر پردہ گرا دیا اور آہستہ آہستہ اوپر جانے لگیں۔ سیڑھیوں کے پہلے ہی موڑ پر رک گئیں کیونکہ اوپر سے نورالنساء اتر رہی تھیں۔ انھوں نے عشرت خانم کو یہاں کھڑے دیکھا تو پہلے ہکا بکا رہ گئیں۔ پھر بولیں : "اے بہن! دیوان خانے میں جا کر بیٹھیے۔ یہاں کھڑی کیا کر رہی ہیں؟"

"یونہیں ذرا جی چاہا کہ اوپر سے بھی ہو آؤں۔" عشرت خانم نے مسکرا کر کہا "دو تین منزلوں والے مکان میں گھر کا ماحول اوپر کے حصے ہی میں ملتا ہے اور میں گھریلو عورت ہوں۔ آپ کے نواسے نواسیوں کو بھی تو نہیں دیکھا۔ چلیے۔ ملا دیجیے ان سے۔"

"میں انھیں نیچے ہی بلائے لیتی ہوں۔" نورالنساء بضد رہیں۔ "ایک تو اوپر بچوں نے دنیا جہان کا کوڑا کباڑ جمع کر رکھا ہے۔ دوسرے۔"

"تو کیا ہوا؟" عشرت خانم نے اگلی سیڑھی پر قدم رکھ دیا اور نورالنساء کا

بازو پکڑ کر کہا: "آیئے۔"

"نیچے ہما بیٹی اور وقار بیٹا کیا کہیں گے کہ ---" نور النساء نے احتجاج کیا۔

"کچھ نہیں کہیں گے۔" عشرت خانم نے نور النساء کو کھینچا۔ "میں ان سے کہہ آئی ہوں کہ میں اوپر جا رہی ہوں۔"

نور النساء چپ چاپ عشرت خانم کے ساتھ ہو لیں۔

آخری سیڑھی تک پہنچی تھیں کہ معصومہ کی کھنکتی ہوئی آواز گوش زد ہوئی۔

"اے کلثوم، اس زاہد کے بچے کو پکڑ۔ یہ چائے سے سنے ہوئے ہاتھ لیے میرے کپڑوں کی طرف بڑھا رہا ہے۔ میں نے تو اتنی دیر تک نیچے بیٹھ کر ان کی استری تک خراب نہیں ہونے دی اور یہ انھیں گنجلنے چلا ہے۔ سلیمہ کیا کہے گی کہ ----"

یکایک نور النساء نے اونچی آواز میں باتیں کرنا شروع کر دیں۔

"میری تو سمجھ میں نہیں آتا بہن کہ آپ کو کس کمرے میں لے جاؤں آج تو یہ یہاں سے وہاں تک بچوں کا گھر بنا ہوا ہے۔ وہ اُٹھا پٹخ مچائی ہے انھوں نے کہ اللہ میری توبہ ہے۔" پھر جس طرح انھوں نے یکایک بولنا شروع کیا تھا اسی طرح یکایک رک گئیں اور چہرے پر ایسی کیفیت طاری کر لی جیسے کان لگا کر کچھ سن رہی ہیں۔

عشرت خانم نے اپنی میزبان کو ایک لمحہ غور سے دیکھا۔ پھر بولیں: "ادھر بچوں کے پاس چلتے ہیں۔"

"ہائے بہن وہاں تو ---" نور النساء جیسے رونے کے قریب پہنچ گئیں، مگر عشرت خانم کو بڑھتا دیکھا تو ان کے ساتھ ہو لیں۔

"اے ہے بیٹی، کپڑے بدل لے!" عشرت خانم دروازے کے سامنے جا کر بولیں اور نورالنساء نے قدم روک لیے جیسے اپنی بیٹی سے ان کا پردہ ہے۔

میلی داغی دیواروں اور جالوں بھری چھت والے اس کمرے کے دروازے پر پرانے دوپٹے کا ایک ادھورا سا پردہ لٹک رہا تھا جس کا ایک سرا اٹھا کر کواڑ سے اٹکا دیا گیا تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں ٹوٹی ہوئی ادوائن کا ایک کھٹولا پڑا تھا۔ جس پر معصومہ کے ریشمی لباس کا ڈھیر رکھا تھا اور پائینتی کے پاس پانچ چھے برس کا ننگا زاہد کھڑا چائے سے سنی ہوئی انگلیاں چوس رہا تھا۔ اکھڑے ہوئے سیمنٹ کے فرش پر مختلف عمروں کے پانچ لڑکے لڑکیاں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ چائے ایک کالی بھجنگ پتیلی میں تھی، چائے پینے والوں میں سے کسی کے ہاتھ مٹی کا پیالہ تھا تو کسی کے سامنے مراد آبادی کٹورا رکھا تھا۔ ایک بچے کے ہاتھ میں چینی کی پیالی تھی، جس کی دستی ٹوٹ چکی تھی، ایک لڑکی نے ہاتھوں کو چائے کی تپش سے بچانے کے لیے ایلومونیم کے ایک ٹیڑھے میڑھے گلاس کو اپنی فراک میں لے کر اسے دونوں ہاتھوں میں یوں اٹھا رکھا تھا کہ اس کا ننھا سا پیٹ دکھائی دے رہا تھا۔ بڑی لڑکی کلثوم کے سامنے ایک پلیٹ میں لال شکر رکھی تھی جسے مکھیوں نے سیاہ کر ڈالا تھا۔ وہ کرے ہوئے کناروں والی ایک پرچ میں چائے پی رہی تھی۔ معصومہ میلی چیکٹ شلوار اور قمیض پر ایک چھلنی چھلنی دوپٹا اوڑھے ننگے پاؤں یوں کھڑی تھی جیسے اسے چھو لیا جائے تو گر پڑے گی۔ اس کی لمبی سیاہ آنکھوں میں خوف گھس گیا تھا اور اس کے گلابی ہونٹوں پر نیل پڑ رہے تھے۔

عشرت خانم دروازے میں کھڑی یہ منظر دیکھتی رہیں۔ پھر مسکرا کر نورالنساء کی طرف دیکھا تو وہ غائب تھیں۔ "اے بہن نورالنساء۔" وہ پکاریں، جواب نہ پا کر سنجیدہ ہو گئیں اور ادھر ادھر دیکھ کر آگے بڑھ گئیں۔ ساتھ والے کمرے سے برتنوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کے دروازے پر پہنچیں تو دیکھا کہ نورالنساء جلدی جلدی سے برتن سمیٹ رہی ہیں۔ "بہن" انھوں نے کہا اور نورالنساء سنانے

میں آ گئیں۔ پھر بولیں۔ "یہ باورچی خانہ ہے مگر بچوں نے آج اسے کباڑ خانہ بنا رکھا ہے۔ ہائے بہن، مجھے تو۔۔۔"

پھر وہ خاموش ہو گئیں۔ ان کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو خاموش ہو جاتا۔ وجہ یہ تھی کہ عشرت خانم ہنس رہی تھیں۔

معصومہ پرلے دروازے میں سے ڈری ڈری جھانک رہی تھی جیسے وہ ایک ایسی گاڑی میں سوار ہے جس کی ایک دو ہی لمحوں کے اندر مخالف سمت سے آتی ہوئی گاڑی کے ساتھ ٹکر ہونے والی ہے۔

عشرت خانم ہنسے جا رہی تھیں اور اب پیٹ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی تھیں۔ "ہائے میرے اللہ" وہ بڑی مشکل سے بولیں۔ "توبہ ہے۔" انھوں نے بڑی محنت سے ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا اور پھر سامنے دیکھا۔

نورالنساء کے ایک ہاتھ میں پتیلی اور دوسرے ہاتھ میں اپنا سر تھا اور وہ یوں بیٹھی تھیں جیسے بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی ہیں۔

عشرت خانم پر ہنسی کا ایک اور دورہ پڑا۔ "اے بہن معاف کرنا" وہ بولیں۔ "آپ نے مجھے یہ ٹوٹے ہوئے پیالے اور یہ پچکی ہوئی پتیلیاں پہلے کیوں نہیں دکھائیں؟ یہ کالی میلی دیواریں اور یہ پرانے دوپٹوں کے پردے آپ نے اوپر کیوں چھپا رکھے تھے؟ یہ ننگے اور اُدھ ننگے بے دُھلے بے نہائے بچے، وہ ٹوٹا ہوا کھٹولا اور یہ بے کُنڈے کا توا۔ اے بہن نورالنساء! آپ نے یہ سب کچھ مجھ سے کیوں چھپایا؟ اور ذرا ادھر تو ہٹیے بہن!" عشرت خانم اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "وہ کیا رکھا ہے؟ اچھا تو وہ تام چینی کی چوٹ لگی پلیٹیں ہیں جن کے کناروں پر چنے کی دال اب تک جمی ہوئی ہے۔ ادھر معصومہ بٹی کے کمرے میں جو چارپائی رکھی ہے اس کی ادوائن کو پورا کرنے کے لیے اس میں کسی کا کمربند بھی تو باندھ دیا گیا ہے۔" عشرت خانم نے یہاں رک کر دو تین قہقہے مارے۔ پھر آنکھیں پونچھنے کے لیے اپنے دوپٹے کا پلو پکڑا مگر

دوپٹے کو ابھی آنکھوں تک نہیں لے گئی تھیں کہ وہ نورالنساء کو یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگیں جیسے گھنی دھند میں راستہ ڈھونڈ رہی ہیں۔ "بہن" وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئیں۔

عشرت خانم باورچی خانے میں داخل ہو کر نورالنساء کے پاس بیٹھ گئیں۔ نورالنساء کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو رہے تھے اور ان کی آنکھوں میں سے بینائی جیسے چوس لی گئی تھی۔

"دیکھیے بہن۔ مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔" عشرت خانم نے کہا۔ "نیچے سیڑھیوں میں۔ الگ۔"

نورالنساء گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھیں تو ان کی ریڑھ کی ہڈی میں سے چٹاک پٹاک کی دو تین آوازیں آئیں جیسے تیز ہوا میں خشک ٹہنیاں ٹوٹ رہی ہوں۔

عشرت خانم منہ میں دوپٹے کا ایک پلو ٹھونسے اور ادھر ادھر دیکھے بغیر سیڑھیاں اتر گئیں۔ پھر رک کر اوپر دیکھا۔ نورالنساء برسوں کے مریضوں کی طرح سیڑھیوں کے جنگلے کے سہارے آہستہ آہستہ اتر رہی تھیں۔ جب وہ عشرت خانم کے قریب آئیں تو آنکھیں جھکا کر اترتی چلی گئیں۔ مگر عشرت خانم نے ان کا بازو پکڑ کر روک لیا۔ پھر انھیں اپنے مقابل کھڑا کر کے منہ سے دوپٹہ نکالا اور بجائے بولنے کے ہنسنے لگیں۔

"جوتیاں مار لیجیے بہن عشرت خانم۔" نورالنساء کی کہیں دور سے آواز آئی۔ "پر یہ جو آپ کی ہنسی----"

نورالنساء آگے کچھ نہ کہہ سکیں کیونکہ نیچے کسی نے دروازے پر دستک دے دی۔ نورالنساء بھڑک کر تیزی کے ساتھ نیچے اتریں مگر جب تک وہ سیڑھیاں اترتیں، ایک لڑکے نے دروازہ کھولتے ہی کڑک کر کہہ دیا۔ "بی بی جی سلام۔ آپا جی کہہ رہی ہیں کہ جب مہمان چلے جائیں تو ہمیں جلدی سے بتا دیجیے گا۔ کہتی ہیں

قالین اور صوفا اور پردے بے شک کل تک رکھے رہیں۔ برتن اور سجاوٹ کی چیزیں ہم آج ہی واپس منگا لیں گے۔ صبح سویرے ہمارے ہاں بھی مہمان آ رہے ہیں۔"

نور النساء آخری سیڑھی پر جنگلے کو مٹھی میں دبوچے کھڑی تھیں انھوں نے صرف گردن کی جنبش سے "اچھا" کہا۔ لڑکا دھڑ سے دروازہ بند کر کے چلا گیا اور نور النساء آخری سیڑھی پر جیسے گر پڑیں۔

"ڈرائیور" عشرت خانم زور سے پکاریں اور دیوان خانے کا پردہ ہٹا کر ہما نے جھانکتے ہوئے پوچھا۔ "کیوں اماں جی۔ کیا ہے؟"

"میں نے ڈرائیور کو بلایا ہے۔ تم اندر بیٹھو۔ عشرت خانم بولیں "اور دیکھو صوفے پر احتیاط سے بیٹھو۔ کپڑوں میں شکن نہ آئے۔ تمھاری سہیلی کیا کہے گی کہ مانگ کر پہننے کو لے گئیں اور گنجل کر اور جھنتے ڈال کر واپس کیے۔"

"اماں "ہما کے سینے پر عشرت خانم نے جیسے مُکا مار دیا۔ پھر وہ تیورا کر پیچھے ہٹ گئی۔

"بڑی بے لحاظ ہوتی ہیں۔ اس زمانے "کی لڑکیاں۔" عشرت خانم نے نور النساء کے پاس آخری سیڑھی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "مانگے کے کپڑے یوں پہنتی ہیں جیسے باپ نے خرید کر دیے ہیں۔" پھر وہ ہنسنے لگیں اور ادھر پہلی بار نور النساء کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ کا پرتو پڑا۔

"ڈرائیور" عشرت خانم نے اٹھ کر باہر کا دروازہ کھول دیا ڈرائیور سامنے آیا تو وہ بولیں۔ "بھئی دیکھو۔ تم کار واپس لے جاؤ۔ ہم لوگ ٹانگے سے آ جائیں گے بیگم صاحب کو سینما دیکھنے جانا ہے تو یہ مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا کہ کار کے مالک تو دوسروں سے کار مانگتے پھریں اور جو ایک گھنٹے کے لیے کار مانگ کر لائے ہیں وہ اس پر قبضہ جما کر بیٹھ جائیں۔ کہنا بہت بہت شکریہ۔" پھر پانچ روپے کا ایک نوٹ بڑھا کر بولیں: "یہ لو۔ تمھارا انعام ہے۔"

ڈرائیور سلام کر کے پلٹ گیا تو عشرت خانم دروازہ بند کر کے ہنسنے لگیں۔ پھر وہ اسی طرح ہنستی ہوئی بڑھیں اور نورالنساء سے لپٹ کر بولیں :"اے بہن نورالنساء خدا کے لیے ہنسیے - کیا یہ ہنسی کی بات نہیں ہے کہ انسان اپنے گھر سے نکل کر کسی دوسرے کے گھر جائے تو اپنے ہی گھر جا نکلے اور بہن۔ میری معصومہ بھی اپنے گھر سے چلے گی تو اپنے ہی گھر جائے گی۔"

اب نورالنساء کھل کر مسکرا رہی تھیں۔

باہر کار سٹارٹ ہوئی اور ڈرائیور نے رخصت کا ہارن دیا تو وقار جھپٹ کر دیوان خانے کے دروازے پر آیا۔ "اماں جی ۔ کار تو جا رہی ہے۔"

"جا رہی ہے تو جانے دو۔" عشرت خانم بولیں :"کیا یہ تمھارے باپ کی کار ہے؟"

وقار تیورا کر پیچھے ہٹ گیا اور نورالنساء پہلی بار قہقہہ مار کر عشرت خانم سے لپٹ گئیں۔ دونوں کی ہنسی وقار اور ہما کو ایک بار پھر دیوان خانے کے دروازے پر کھینچ لائی۔ جہاں وہ ریشمی پردہ ہٹا کر بلوں کی سی گول گول حیران حیران آنکھوں سے دونوں کو دیکھنے لگے اور سیڑھیوں کے پہلے موڑ پر معصومہ کھڑی نیچے یوں دیکھ رہی تھی جیسے مداری نے ٹوکری کے نیچے جلا ہوا کاغذ رکھنے کے بعد اس میں سے کبوتر نکال لیا ہے اور عشرت خانم کہ رہی تھیں "ہائے بہن نورالنساء میرے تو پیٹ میں بل پڑ گئے۔ قسم قرآنِ مجید کی پسینا سرخی پوڈر بہا لے جائے تو نیچے سے کیسے سچے اور کھرے چہرے نکل آتے ہیں۔ ہائے مجھے کتنا پیار آ رہا ہے آپ پر! آیئے ذرا دیر کو اوپر باورچی خانے کے ننگے فرش پر جا بیٹھیں۔"

(گھر سے گھر تک از احمد ندیم قاسمی)

سوالات

ا۔ عشرت خانم اور وقار کی آمد کا حال اپنے لفظوں میں بیان کیجیے۔

۲۔ حاجی مقتدا احمد کے کمرے کی سجاوٹ کا نقشہ کھینچیے۔

۳۔ عشرت خانم اور نورالنساء پر ایک دوسرے کی اصلیت کا بھانڈا کیسے پھوٹا؟

۴۔ اس کہانی میں ہمارے معاشرتی رویوں پر گہری طنز ہے۔ اس کی وضاحت کیجیے۔

۵۔ اس کہانی کو اختصار کے ساتھ اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔

۶۔ مندرجہ ذیل کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے :۔

ماشاء اللہ ۔ آناً" فاناً" ۔ کلیجہ دھک سے رہ جانا۔ اونے پونے بیچنا۔ دھما چوکڑی مچانا۔ پیٹ میں بل پڑنا۔

۷۔ مندرجہ ذیل میں صحیح بیانات کی صورت میں "ص" کے گرد دائرہ لگائیے اور غلط بیانات کی صورت میں "غ" کے گرد۔

(الف) نورالنساء اور عشرت بیگم دو سگی بہنیں تھیں۔ ص / غ

(ب) ہما کے باپ کا نام حاجی مقتدا احمد تھا۔ ص / غ

(ج) عشرت خانم، ہما اور وقار مانگے کی کار میں آئے تھے۔ ص / غ

(د) حاجی مقتدا احمد اپنے ڈرائنگ روم کا سامان عدن سے لے کر آئے تھے۔ ص / غ

(ہ) عشرت خانم نے نورالنساء کے باورچی خانے کا حال دیکھا تو اس پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ ص / غ

(و) ہما نے جو کپڑے پہنے تھے، وہ نئے سلوا کر لائی تھی۔ ص / غ

(ز) عشرت خانم باورچی خانے میں پہنچیں تو معصومہ باورچی خانے کے ننگے فرش پر کھڑی تھی۔ ص / غ

وہ اسم جو کسی اسم کی چھوٹائی کو ظاہر کرے، اسم مصغّر کہلاتا ہے جیسے ڈھول سے ڈھولک، مشک سے مشکیزہ وغیرہ۔ وہ اسم جو کسی اسم کی بڑائی ظاہر کرے اسم

مکبّر کہلاتا ہے مثلاً بات سے بتنگڑ۔ راجہ سے مہاراجہ۔

۸ مندرجہ ذیل الفاظ سے اسمائے مصغّر اور اسمائے مکبّر الگ کیجیے :۔

شہسوار۔ دکھڑا۔ پلنگڑی۔ گٹھڑ۔ کھٹولا۔ گھڑیال۔

۹۔ کالم I میں کچھ الفاظ درج ہیں۔ کالم II میں قواعد کی اصطلاحات دی گئی ہیں۔ جوابی کالم میں ہر لفظ کے سامنے درست اصطلاح کا حرفی نمبر تحریر کیجیے۔

I	II	جوابی کالم
۱۔ دیوان خانہ	(الف) کنیت	
۲۔ دوپہر	(ب) عرف	
۳۔ تمغائے شجاعت	(ج) مصدر	
۴۔ حالی	(د) اسمِ آلہ	
۵۔ اُمّ ایمن	(ہ) مَوصول	
۶۔ چھٹن	(و) ضمیر	
۷۔ بھجوانا	(ز) ظرفِ مکاں	
۸۔ توا	(ح) تخلص	
۹۔ ہمیں	(ط) خطاب	
۱۰۔ جس	(ی) ظرفِ زماں	

- - - - - - - - - - -

بیگم کی بلی

(ایک تمثیلچہ)

امیدوار : میاں یہ ہے وہ بلی۔

میاں : (غصے کی دبی ہوئی آواز میں) چپ احمق کہیں کا، اتنے زور سے بولتا ہے۔

امیدوار : زور سے بولا تھا میں ؟

میاں : پھر وہی۔ ارے نامعقول آہستہ بول آہستہ۔

امیدوار : (آہستہ سے) بات کیا ہے؟

میاں : تجھے بات سے کیا مطلب ؟ جو کچھ کہا ہے کر دے۔

امیدوار : بلی تو کالی سیاہ ہو رہی ہے۔ تھی کہاں یہ ؟

میاں : کوئلوں کی کوٹھری میں۔

امیدوار : دلالی کر رہی تھی وہاں ؟

میاں : نہیں مانے گا۔ ابے آہستہ آہستہ بول۔ کل رات ہم اسے بہت دور چھوڑ آئے تھے۔ لیکن واپس چلی آئی کمبخت ۔ اس کے واپس آنے کے بعد ہم چاہتے تھے، اسے بیگم صاحبہ سے چھپا کر رکھنا۔ اس لیے کوئلوں کی کوٹھری میں بند کر دی تھی۔

امیدوار : تو بیگم صاحبہ کی بلی ہے یہ ؟

میاں : بڑی چہیتی۔

امیدوار : بلی کو تو میاں کتنی ہی دور لے جا کر چھوڑو گھر واپس آ جاتی ہے۔

میاں : مگر اب کے تو نہ آئے گی۔ تو سمجھ گیا ہے نا اپنا کام۔

امیدوار : ہاں ہاں میاں سمجھتا کیوں نہ ؟

میاں : مگر دیکھو زیادہ دکھ نہ پہنچائیو اسے۔ بڑی نرمی سے کام تمام کیجو۔ مل سکے تو کوئی کلھاڑا حاصل کر لیجو۔

امیدوار : کلھاڑا ....اور اگر ....

میاں : اگر مگر کچھ نہیں۔ پسیج نہ جائیو کہیں۔ ہم چاہتے ہیں اب کے یہ قصہ ہی تمام ہو جائے۔

امیدوار : اور میاں کسی نے دیکھ لیا تو ؟

میاں : ابے دیکھ لیا کے بچے۔ تو اس وقت سن لیا کی فکر رکھ۔ کسی نے بلی کی جان لیتے دیکھ لیا تو کون سا تجھے سولی پر لٹکا دے گا۔ ایسا ہی خوف ہے تو چل رات کو سہی۔

امیدوار : اور میاں اس کام کا انعام۔

میاں : ---اٹھنّی---یہ---

امیدوار : اٹھنّی---اٹھنّی کے لیے یہ خون۔ نا میاں مجھے نہیں منظور۔

میاں : اور کیا اپنا سر لے گا۔ ایسی عام بلی کے لیے اٹھنّی تھوڑی رقم ہے۔

امیدوار : یہ بڑی عام بلی سہی۔ میرے سینے میں تو دل ہے۔ قیامت کے دن اللہ میاں کو منہ کیا دکھاؤں گا۔

میاں : ابے تو پھر بول بھی چک، لے گا کیا؟

امیدوار : میاں ایک تو میں ہوں انسان نرم دل۔ دوسرے قتل خون میرا پیشہ نہیں۔ میں تو آپ جانیے باورچی گیری کی امید میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ سنا تھا آپ کو باورچی کی ضرورت ہے۔ اس معاملے میں آپ نے دے دیا ٹکا سا جواب۔ اس لیے اب اس خدمت کے لیے تو----

میاں : ابے تو یہ بول کہ لے گا کیا؟

امیدوار : پانچ کا نوٹ دلوا دیجیے۔

میاں : پانچ کا نوٹ۔ سر پھر گیا ہے؟

امیدوار : تو آپ کی مرضی۔ نہ سہی۔

میاں : ابے تو بہت سے بہت ایک روپیہ لے لے۔

امیدوار : نا میاں بیگم صاحبہ کی بلی ہے۔ میں تو پانچ روپے سے کوڑی کم نہیں لینے کا۔

میاں : ارے مگر---- پانچ روپے----

بیگم : (دور سے) اجی کہاں گئے؟

میاں : (گھبرا کر) بیگم صاحبہ آگئیں۔ لے تو یہ پانچ ہی کا نوٹ لے لے اور بھاگ جا۔ بلی کو کپڑے کے نیچے چھپا لے۔ کسی کو اس کی

جھلک بھی نظر نہ آنے پائے اور دیکھ نشان تک نہ ملے بلی کا۔ ادھر سے جا پچھلے راستے سے ہمارے غسل خانے میں سے نکل جا۔

امیدوار : پر میاں بجائے کلھاڑے کے اگر زہر سے کام کروں تو-----

بیگم : (دور سے) کہاں ہو؟

میاں : (بیگم سے) یہ رہا (امیدوار سے) اب جا بھی مچک کہیں۔

امیدوار : بس میں گیا۔ وہ میں نے کہا تو میاں میرے لیے کہیں نوکری کی سفارش-----؟

میاں : ابے پانچ روپے لے کر بھی نوکری کی سفارش۔ بھاگ یہاں سے۔

(امیدوار جاتا ہے۔ میاں کھنکھارتا ہے۔ بیوی آتی ہے)

بیگم : (آتے ہوئے) کہاں ہو؟ چھپ کر بیٹھے ہو۔ ذرا خیال نہیں میرے صدمے کا۔

میاں : بس آہی رہا تھا۔ تمہاری طرف۔

بیگم : (آہ بھر کر) کیا کروں۔ میرا تو دل بیٹھا جاتا ہے۔

میاں : دل-----

بیگم : جس پرچ میں وہ دودھ پیا کرتی تھی، برآمدے میں اوندھی پڑی ہے۔ دیکھتی ہوں تو ہوکیں اٹھتی ہیں دل میں۔

میاں : واہ یہ بھی کوئی بات ہے صدمے کی؟

بیگم : جس ٹوکری کے اندر گدیلے پر آرام کیا کرتی تھی آج ویران پڑی ہے۔

میاں : تو معمولی بات ہے اس ٹوکری میں تم ---- میں ---- مثلاً آلو رکھنے شروع کر دو۔

بیگم : دل دکھانے کی بات نہ کرو مجھے اب تک امید ہے کہ وہ واپس آجائے گی۔

میاں : امید۔ جی تو نہیں چاہتا کہ تمھیں مایوس کروں۔ لیکن کیا کیا جا سکتا ہے (آہ بھر کر) اس کی واپسی کی امید خیال خام ہے۔

بیگم : کیا مطلب؟

میاں : ابھی ابھی بازار کا ایک آدمی میرے پاس ہو کر گیا ہے۔ اس نے ایک اطلاع دی ہے۔ تم اپنے آپ کو ایک افسوس ناک خبر سننے کے لیے تیار کر لو۔

بیگم : افسوس ناک خبر! میرا تو دل دھک دھک کرنے لگا۔ کیا خبر ہے وہ؟

میاں : (رقّت سے) ہماری غریب مسکین بلی ایک قصاب کی دکان کے سامنے کھڑی چھیچھڑوں کے خواب دیکھ رہی تھی، کہ بے رحم قصاب نے اسے عدم کا راستہ دکھا دیا۔

بیگم : ہے ہے ----!

میاں : (رقّت سے) ایک موٹر اس کا کام تمام کرتی ہوئی اس پر سے گزر گئی۔

بیگم : میرے اللہ -----

میاں : (آہ بھر کر) اطمینان کے لیے بس اتنی سی بات ہے کہ جس موٹر نے بلی کو کچلا وہ رولس رائس کار تھی۔

بیگم : (سسکیاں لیتے ہوئے) اور لاش کیا ہوئی دکھیا کی؟

میاں : لاش کہاں رہی بیگم اس کا قیمہ بن گیا۔ جو شخص خبر دینے آیا تھا اس بے چارے نے خبر پہنچانے سے پہلے اس قیمے کو سمیٹ کر اپنی دکان کے پچھواڑے دفن کر دیا۔

بیگم : (زور زور سے سسکیاں بھرنے لگتی ہے)

میاں : جو بے چارہ شخص خبر دینے آیا تھا وہ غریب جب واقعہ بیان کر رہا تھا تو اس کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کی لڑیاں جاری تھیں۔

بیگم : (اور زور سے رونے لگتی ہے)

میاں : ہائیں ہائیں بیگم - حوصلہ کرو۔ اس کی قضا آئی تھی مر گئی۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی تھی۔ مشیّتِ ایزدی میں کس کو دم مارنے کی مجال ہے۔ ہائیں ہائیں۔ کسی نوکر نے روتے دیکھ لیا، تو کیا جی میں کہے گا۔ نہ جانے دل میں کیا سمجھ بیٹھے۔ لو پونچھ ڈالو آنسو۔ کل تم کہ رہی تھیں کہ آج صبح خرید و فروخت کے لیے بازار جانا ہے۔ مجھے اس وقت بیٹھ کر مضمون لکھنا ہے، کار خالی ہے۔ جاؤ بازار ہو آؤ۔

بیگم : (سسکیاں لیتے ہوئے) میں کیوں کر بازار جاؤں جب جب - جب میری بلی کا- کا- کا تو قیمہ ----

میاں : ارے تو اب کیوں اسے یاد کیے چلی جا رہی ہو؟ ایک بات تھی ہو گئی۔ اب بھول جاؤ بات کو۔ بھلا دیکھیں تو مسکراتی کیونکر ہو۔ دیکھو یہ منہ چھپانا ٹھیک بات نہیں۔ اچھا اگر بازار میں خریداری کے لیے کچھ رقم بھی تمھاری نذر کر دیں تو۔ اے یہ لو نوٹ ارے دیکھو یہ تو دس روپے کا ہے۔ دس روپے کا۔ بولو تو بھلا ان دس روپوں کا لاؤ گی کیا؟ بھئی یہ بات ٹھیک نہیں۔ تم تو بولتی نہیں۔ اچھا ہم بتائیں ان روپوں میں سے جناب ایک تو آپ لے آئیے سینٹ اور جناب من -----

بیگم : تو پھو ---- پھو ---- پھو ----

میاں : پھکنی لاؤ گی؟ اچھی بات شوق سے لے آؤ۔

بیگم : (روتے میں ہنس پڑتی ہے) بڑے اچھے لگتے ہیں۔

میاں : ہنس پڑیں نا۔ یہ بات!

بیگم : بات ہی ایسی الٹی کرتے ہو۔ میں کہہ رہی تھی پھول لاؤں گی۔

میاں : پھول کیسے؟

بیگم : بلی کی قبر پر چڑھانے کو۔

میاں : پھر وہی بلی۔ ارے بھئی تھی۔ مر گئی۔ بھول جاؤ۔ اب اس کو۔

(دیور داخل ہوتا ہے)

دیور : آداب عرض ہے بھائی جان۔ مزاج شریف؟ کیوں بھابی ارے کیا ہوا انھیں؟

بیگم : بھئی میری بے چاری۔۔۔۔

میاں : تم جانے دو میں سنا دوں گا سارا قصہ۔ تمہاری بھابی اصل میں ایک واقعے سے بڑی مضطرب ہو گئی ہیں۔

دیور : کیا واقعہ ہو گیا؟

میاں : ابھی بتاتا ہوں۔ تو بیگم تم جاؤ بازار ہو آؤ۔ گھوم پھر کر آؤ گی تو طبیعت آپ سے آپ بحال ہو جائے گی۔ لو آؤ دروازہ تک چھوڑ آؤں۔

(دروازہ بند کرتا ہے)

دیور : قصہ کیا ہے؟

میاں : اماں کچھ نہ پوچھو۔ اس کمبخت بلی نے مصیبت ڈال رکھی ہے۔

دیور : بھابی کی بلی؟

میاں : ہاں!

دیور : تو کیا ہوا اسے؟

میاں : امید ہے اب تک وفات پا چکی ہو گی۔

دیور : وفات۔ اور یہ "امید ہے" کے کیا معنی؟

میاں : اندازہ ہے میرا۔

دیور : بے چاری بلی۔

میاں : اب جناب اپنی ہمدردی اس بلی پر صَرف نہ کیجیے۔ مجھ سے

ہمدردی کیجیے۔ اسے اس گھر میں آئے ایک مہینے کا عرصہ ہوا تھا۔ قسم لے لو جو اس سارے مہینے میں مجھے راحت کا ایک پل نصیب ہوا ہو۔

دیور : کیا باتیں کرتے ہیں بھائی جان!

میاں : باتیں؟ اماں اس کم بخت نے میرا جینا دوبھر کر دیا تھا۔

دیور : وہ کیوں کر؟

میاں : سب سے پہلے تو میری بیوی کو چھین کر اپنا بنا لیا۔ یعنی بخدا جب سے وہ سبز قدم گھر میں آئی تھی تمھاری بھابی کے لیے میں تو جیسے کوئی شے ہی نہیں رہا تھا۔

دیور : رہنے بھی دیجے بھائی جان۔

میاں : تم سمجھتے ہو میں مبالغہ کر رہا ہوں۔ دیکھتے تو پتا چلتا کہیں بلی کو دودھ پلایا جا رہا ہے، کہیں گوشت کے تکّے کھلائے جا رہے ہیں۔ اس وقت کیا ہو رہا ہے۔ بلی کو گیند سے کھیلتا دیکھ رہی ہیں۔

دیور : ہو جاتا ہو گا دن میں ایک آدھ گھنٹا یہ شغل۔

میاں : ارے مگر شغل کے لیے کوئی بھلی مانس خاندانی بلی ہو۔ وہ تو ایک چھٹی ہوئی بلی تھی۔ پچھلے مہینے کم بخت نے ایک چوہا پکڑ کر میرے تازہ ترین افسانے کے اَوراق پر اس کا ناشتہ کیا۔

دیور : تو آپ جانور سے بھی عقل کی توقع رکھتے ہیں؟

میاں : ارے بھئی عقل نہ ہو، تمیز تو ہو۔ کیچڑ میں سے گھوم کر آتی اور

نہایت بے تکلفی سے میرے اجلے بستر پر چڑھ جاتی۔ ہمسائے نے مرغی کے بچے نکلوا رکھے تھے۔ ان کے دو چوزوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ ان سے پیٹ کا جہنم ڈرائنگ روم میں بھرا۔ چنانچہ قالین پر خون آلودہ پروں کا ایک اور فرش بچھا ڈالا۔

دیور : تو پھر اب وہ ہے کہاں ؟

میاں : جہاں تک میری ناقص فہم تخمینہ لگا سکتی ہے، وہ مسماۃ اس وقت دوسری دنیا کی سیاحت کے لیے رختِ سفر باندھ رہی ہے۔

دیور : وہ کیسے ؟

میاں : بات یوں ہوئی کہ کل ہم نے دل میں طے کر لیا تھا کہ بھئی بہت عرصہ صبر سے کام لیا۔ اب ہرچہ بادا باد۔ بلی اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ جنابِ مَن کل رات ہم نے اس بلا کو چپکے سے اٹھایا اور موٹر میں بٹھا دریا کا راستہ پکڑا۔

دیور : اور بھابی جان کو پتا نہ لگا۔

میاں : یہ کارروائی اس وقت عمل میں لائی گئی تھی جب وہ سو گئی تھیں۔

دیور : پھر کیا ہوا ؟

میاں : اسے دریا پر چھوڑ کر میں گھر آگیا۔

دیور : چنانچہ اب آپ کا خیال ہے کہ وہیں دریا کے کنارے بلی غالباً مر کھپ چکی ہوگی۔

میاں : کہاں مر کھپ --- وہ کم بخت تو پھر نازل ہو گئی۔

دیور : سچ ؟

میاں : اور کیا جھوٹ بول رہا ہوں۔ صبح صبح اندھیرے منہ میاؤں میاؤں کی کریہہ آواز سن کر آنکھ کھل گئی۔ اٹھ کر دیکھتا ہوں تو دھری ہوئی ہیں۔ اب گھر کے دروازے تو بند تھے۔ غالباً کسی موری کے راستے گھس آئی تھی۔

دیور : پھر؟

میاں : پھر کیا، خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا صبح صبح سمجھ میں بھی تو نہ آتا تھا کہ کیا کروں۔ اور کچھ تو سوجھا نہیں۔ میں نے بلی کے منہ پر رومال باندھ اسے کوئلوں کی کوٹھری میں بند کر دیا۔ سوچا منہ پر رومال بندھا ہونے سے اس کی آواز سنائی نہ دے گی۔ دن میں آرام سے سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں گے کہ اس سے دائمی نجات کیوں کر پائی جائے ؟

دیور : تو بلی اب تک کوئلوں کی کوٹھری میں بند ہے ؟

میاں : جی بند ہی تو ہے۔ یہاں صبح سے سوائے اس فکر کے دوسرا کوئی فکر نہ تھا کہ جب بیگم صاحبہ کو صدمہ بھی پہنچا لیا تو اب ٹھکانے لگاؤں اس بلی کو۔ اتفاق کی بات تھوڑی دیر ہوئی ، ایک ملازمت کا امیدوار آ گیا میرے پاس ۔ شکل صورت سے سمجھدار اور چلتا ہوا آدمی نظر آتا تھا۔ اس سے باتیں کرتے کرتے اچانک خیال آیا کہ بلی کا کام اس کے ہاتھوں تمام کرانا چاہیے۔ چنانچہ جناب ابھی تھوڑی دیر ہوئی وہ بلی کو لے کر گیا ہے ، اور بیگم کو میں نے یہ کہہ کے ٹالا ہے ، کہ بلی موٹر تلے آ کر مر گئی۔

دیور : بھائی جان سچ تو یہ ہے کہ آپ نے کسی قدر زیادتی کی ہے۔

میاں : بلی سے زیادتی ؟ اور مجھ سے کیا ہو سکتا تھا بھلا ! اس ایک بلی کی بدولت میرا گھر غلیظ تھا۔ میرا اطمینان قلب غارت تھا۔ میرے تعلقات ہمسایوں اور کئی دوسرے لوگوں سے تو کیا، خود اپنی بیوی تک سے کشیدہ سے ہو گئے تھے۔ اور پھر کئی روپے بھی تو اٹھ گئے میرے۔ پانچ روپے----

دیور : اس شخص کو دیے جو بلی کو ٹھکانے لگانے لے گیا ہے،

میاں : اور کیا؟ کم بخت اس سے کم پر کسی طرح مانتا ہی نہ تھا۔ اور پھر یہی پانچ تھوڑا اٹھے۔ تمھاری بھابی کا غم بھلانے کے لیے دس روپے خود ان کی نذر بھی تو کرنے پڑ گئے۔ کل پندرہ اٹھ گئے۔ پر مجھے نہیں افسوس روپے کا۔ پندرہ روپے میں امن اور سکون کی زندگی سستی ہے میں پندرہ روپے میں اس سے اچھا سودا اور کوئی نہ کر سکتا تھا۔

(میاؤں میاؤں کی آواز۔ بیگم بھاگی اور خوشی کے جوش سے بے تاب آتی ہے)

بیگم : میں نے کہا کہاں گئے ؟ سنو تو۔ سنو تو۔ میں کار میں سوار ہو کر بنگلے سے نکل رہی تھی کہ دروازے پر ایک بھلا مانس ملا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر کار کو روک لیا ڈرائیور سے پوچھا۔ کار میں بیگم صاحبہ ہیں ؟ اس نے کہا ہاں۔ تو جھٹ کپڑے تلے سے ایک چیز نکال میرے لیے پیش کی۔ پوچھو بھلا کیا؟ بلی اور بلی بھی کیسی ہو بہو میری مرحوم بلی کی تصویر۔

بیگم : بس کسی کوئلے والے کے ہاں رہ کر کالی ضرور ہو گئی ہے۔ مگر نہا دھو کر بالکل مرحوم بلی جیسی ہو جائے گی۔

میاں : تو تم نے خدا نخواستہ لے تو نہیں لیا اسے ؟

بیگم : اور کیا (دیور کی دبی ہوئی ہنسی) جو دس روپے تم نے دیے تھے اس سے بلی تو خریدی ہے۔

میاں : دس روپے میں بلی۔

بیگم : اور ساتھ بیچنے والے کو ملازم رکھ لیا۔

میاں : ملازم----

(دیور کی ہنسی)

بیگم : بے چارہ بال بچے دار ہے۔ نوکری کی تلاش میں تھا۔ بے حد بھلا مانس ہے۔ ادھر کھڑا ہے۔

میاں : وہ بدمعاش !

امیدوار : سلام میاں ۔ آپ نے تو سفارش کے ایک پرزے سے بھی جواب دے دیا تھا۔ اللہ بیگم صاحبہ کو خوش رکھے۔ ان کی مہربانی سے آپ ہی کے قدموں میں جگہ مل گئی (میاؤں میاؤں ۔ دیور کی ہنسی)

بیگم : سنا۔ بلی آتے ہی گھر میں ایسی بے تکلّفی سے پھرنے لگی گویا عرصے سے یہیں رہی ہے۔ میں بلاتی ہوں۔ پسی پسی پسی !

(امتیاز علی تاج)

سوالات

۱۔ میاں اور امیدوار میں بلی کو ٹھکانے لگانے کا معاملہ کیسے طے ہوا؟

۲۔ میاں نے بیگم کو بلی کی موت کا جو واقعہ سنایا اس کا بیگم پر کیا اثر ہوا؟

۳۔ میاں نے بلی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے کون کون سے طریقے استعمال کیے؟

۴۔ مندرجہ ذیل محاورات کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:۔

قصہ تمام ہونا۔ ٹکا سا جواب دینا۔ ہوکیں اٹھنا۔ بلی کو چھیچھڑوں کے خواب۔ جینا دوبھر کرنا۔ خون کے گھونٹ پینا۔ رخت سفر باندھنا۔

۵۔ اعراب کی مدد سے مندرجہ ذیل الفاظ کا تلفظ واضح کیجیے:۔

بیگم ۔ قتل ۔ معاملہ۔ سفارش ۔ اطلاع ۔ مزاج ۔ شغل ۔ توقع ۔ ناقص ۔ نازل۔ اتفاق ۔ خیال ۔ تعلقات ۔ نذر ۔

فعلِ لازم اور متعدی :۔

فعلِ لازم وہ فعل ہے جس کا اثر صرف کام کرنے والے یعنی فاعل تک محدود رہے اور اسے مفعول کی ضرورت نہ ہو جیسے خرگوش دوڑا۔ سعیدہ آئی۔ وہ بولا۔ ہم بیٹھے ان مثالوں میں دوڑا ، آئی ، بولا اور بیٹھے فعلِ لازم ہیں۔

فعلِ متعدی وہ فعل ہے جس کا اثر فاعل سے گزر کر مفعول تک پہنچے جیسے میں نے خط لکھا، احمد نے اخبار پڑھا اور اس نے کتاب خریدی۔ ان مثالوں میں لکھا، پڑھا اور خریدی فعلِ متعدی ہیں۔

۶۔ اس سبق میں سے چھ چھ فعلِ لازم اور فعلِ متعدی تلاش کر کے لکھیے۔

ہجرت حبشہ

قریش کے ظلم و تعدّی کا بادل جب پیہم برس کر نہ کھلا تو رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جاں نثارانِ اسلام کو ہدایت کی کہ حبش کو ہجرت کر جائیں۔ حبش قریش کا قدیم تجارت گاہ تھا۔ وہاں کے حالات پہلے سے معلوم تھے۔ اہلِ عرب، حبش کے فرماں روا کو "نجاشی" کہتے تھے اور اس کے عدل و انصاف کی عام شہرت تھی۔

جان نثارانِ اسلام ہر قسم کی تکلیف جھیل سکتے تھے اور ان کا پیمانۂ صبر لبریز نہیں ہو سکتا تھا لیکن مکے میں رہ کر فرائضِ اسلام کا آزادی سے بجالانا ممکن نہ تھا۔ اس وقت تک حرمِ کعبہ میں کوئی شخص بلند آواز سے قرآن نہیں پڑھ سکتا تھا۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود جب اسلام لائے تو انھوں نے کہا کہ میں اس فرض کو ضرور ادا کروں گا۔ لوگوں نے منع کیا لیکن وہ باز نہ آئے، حرم میں گئے اور مقامِ ابراہیمؑ کے پاس کھڑے ہو کر سورہ رحمٰن پڑھنا شروع کیا، کفار ہر طرف سے ٹوٹ پڑے اور ان کے منہ پر طمانچے مارنے شروع کیے۔ اگرچہ انھوں نے جہاں تک پڑھنا تھا پڑھ کر دم لیا لیکن واپس گئے تو چہرے پر زخم کے نشان لے کر گئے۔ اس کے علاوہ ہجرت سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی تھا کہ جو شخص اسلام لے کر جہاں جاتا، وہاں اسلام کی شعاعیں خود بخود پھیلتی تھیں۔

غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ایما پر اول اول گیارہ مردوں اور چار عورتوں نے ہجرت کی۔ ان لوگوں نے سنہ ۵ نبوی ماہ رجب میں سفر کیا۔ حسن اتفاق یہ کہ جب یہ بندرگاہ پر پہنچے تو دو تجارتی جہاز حبشہ کو جا رہے تھے۔ جہاز والوں نے سستے کرائے پر ان کو بٹھا لیا۔ قریش کو جب خبر ہوئی تو بندرگاہ تک تعاقب میں آئے، لیکن موقع نکل چکا تھا۔

عام مورخوں کا خیال ہے کہ ہجرت ان ہی لوگوں نے کی جن کا کوئی حامی اور مددگار نہ تھا۔ لیکن فہرست مہاجرین میں ہر درجے کے لوگ نظر آتے ہیں۔ حضرت عثمانؓ بنو امیہ سے تھے جو سب سے زیادہ صاحب اقتدار خاندان تھا۔ متعدد بزرگ مثلاً زبیرؓ اور مصعبؓ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے خاندان سے تھے۔ عبدالرحمانؓ بن عوف اور ابوؓسبرۃ معمولی لوگ نہ تھے۔ اس بنا پر زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ قریش کا ظلم و ستم بے کسوں تک محدود نہ تھا۔ بلکہ بڑے بڑے خاندان والے بھی ان کے ظلم و ستم سے محفوظ نہ تھے۔

نجاشی کی بدولت مسلمان حبشہ میں امن و امان کی زندگی بسر کرنے لگے، لیکن قریش یہ خبریں سن سن کر پیچ و تاب کھاتے تھے۔ آخر یہ رائے ٹھہری کہ نجاشی کے پاس سفارت بھیجی جائے کہ ہمارے مجرموں کو اپنے ملک سے نکال دو۔ عبد اللہ بن ربیعہ اور عمرو بن العاص (فاتح مصر) اس کام کے لیے منتخب ہوئے۔ نجاشی اور اس کے درباریوں میں سے ایک ایک کے لیے گراں بہا تحفے مہیا کیے گئے اور نہایت سروسامان سے یہ سفارت حبش کو روانہ ہوئی۔ یہ سفیر نجاشی سے پہلے درباری پادریوں سے ملے اور ان کی خدمت میں نذریں پیش کیں اور کہا کہ ہمارے شہر کے چند نادانوں نے ایک نیا مذہب ایجاد کیا ہے۔ ہم نے ان کو نکال دیا تو آپ کے ملک میں بھاگ آئے۔ کل ہم بادشاہ کے دربار میں ان کے متعلق جو درخواست پیش کریں آپ بھی ہماری تائید فرمائیں۔ دوسرے دن سفراء دربار میں گئے اور نجاشی سے درخواست کی کہ ہمارے مجرم ہمارے حوالے کر دیے جائیں۔ درباریوں نے بھی تائید کی۔ نجاشی نے مسلمانوں کو بلا بھیجا اور کہا: ”تم نے یہ کون سا دین ایجاد کیا ہے جو نصرانیت اور بت پرستی دونوں کے مخالف ہے؟“

مسلمانوں نے اپنی طرف سے گفتگو کرنے کے لیے حضرت جعفرؓ (حضرت علیؓ کے بھائی) کا انتخاب کیا۔ انھوں نے اس طرح تقریر شروع کی:

”اے بادشاہ! ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے۔ بت پوجتے تھے، مردار کھاتے

تھے، بدکاریاں کرتے تھے، ہمسایوں کو ستاتے تھے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا، قوی لوگ کمزوروں کو کھا جاتے تھے۔ اس اثناء میں ہم میں ایک شخص پیدا ہوا جس کی شرافت اور صدق و دیانت سے ہم لوگ پہلے سے واقف تھے۔ اس نے ہم کو اسلام کی دعوت دی اور یہ سکھایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں، سچ بولیں، خون ریزی سے باز آئیں، یتیموں کا مال نہ کھائیں، ہمسایوں کو آرام دیں، عفیف عورتوں پر بدنامی کا داغ نہ لگائیں، نمازیں پڑھیں اور روزے رکھیں، زکوٰۃ دیں۔ ہم اس پر ایمان لائے، شرک اور بت پرستی چھوڑ دی اور تمام اعمالِ بد سے باز آئے۔ اس جرم پر ہماری قوم ہماری جان کی دشمن ہو گئی اور ہم کو مجبور کرتی ہے کہ اسی گمراہی پر واپس آجائیں۔"

نجاشی نے کہا: "جو کلام الٰہی تمہارے پیغمبرؐ پر اترا ہے کہیں سے پڑھو۔" حضرت جعفرؓ نے سورہ مریم کی چند آیتیں پڑھیں، نجاشی پر رقت طاری ہوئی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، پھر کہا: "خدا کی قسم یہ کلام اور انجیل دونوں ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں۔" یہ کہہ کر سفرائے قریش سے کہا "تم واپس جاؤ میں ان مظلوموں کو ہرگز واپس نہ دوں گا۔"

دوسرے دن عمرو ابن العاص نے پھر دربار میں رسائی حاصل کی اور نجاشی سے کہا: "کہ حضور! آپ کو یہ معلوم ہے یہ لوگ حضرت عیسیٰؑ کی نسبت کیا اعتقاد رکھتے ہیں؟" نجاشی نے مسلمانوں کو بلا بھیجا کہ اس سوال کا جواب دیں۔ ان لوگوں کو تردّد ہوا کہ اگر حضرت عیسیٰؑ کے ابن اللہ ہونے سے انکار کرتے ہیں تو نجاشی عیسائی ہے ناراض ہو جائے گا، حضرت جعفرؓ نے کہا "کچھ ہو، ہم کو سچ بولنا چاہیے۔"

غرض یہ لوگ دربار میں حاضر ہوئے۔ نجاشی نے کہا: "تم لوگ عیسیٰؑ بن مریم کے متعلق کیا اعتقاد رکھتے ہو؟" حضرت جعفرؓ نے کہا: "ہمارے پیغمبرؐ نے بتایا ہے کہ عیسیٰؑ خدا کا بندہ اور پیغمبر اور کلمۃ اللہ ہے۔" نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھالیا اور کہا: واللہ جو تم نے کہا عیسیٰؑ اس تنکے کے برابر بھی اس سے زیادہ نہیں ہیں۔"

بطریق جو دربار میں موجود تھے، نہایت برہم ہوئے۔ نتھنوں سے خرخراہٹ کی آواز آنے لگی، نجاشی۔ ان کے غصے کی کچھ پروا نہ کی اور قریش کے سفیر بالکل ناکامیاب واپس آئے۔

(سیرۃ النبیؐ از مولانا شبلی)

سوالات

۱۔ قریش کے ظلم و ستم سے بچانے کے لیے رسول کریم نے مسلمانوں کو کیا ہدایات کیں؟

۲۔ نجاشی نے مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟

۳۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کے ساتھ کفار مکہ نے کیا سلوک کیا؟

۴۔ مسلمانوں کے تحفظ کے علاوہ ہجرتِ حبشہ کا ایک اور فائدہ کیا ہوا؟

۵۔ مہاجرین حبشہ میں کس کس قسم کے لوگ شامل تھے؟

۶۔ نجاشی سے قریش کے سفیروں نے کیا مطالبہ کیا؟

۷۔ نجاشی کے دربار میں حضرت جعفرؓ طیار نے جو تقریر کی اس کو اپنے الفاظ میں لکھیے۔

۸۔ اس سبق کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

۹۔ خوش نما اور بدزیب میں "خوش" اور "بد" سابقے ہیں۔ یہی سابقے رکھنے والے پانچ پانچ الفاظ مزید لکھیے۔

۱۰۔ اعراب کی مدد سے مندرجہ ذیل الفاظ کا تَلَفُّظ واضح کیجیے:۔

تعدی۔ بلند۔ تعاقب۔ مورخ۔ اقتدار۔ متعدد۔ سفارت۔ مجرموں۔ منتخب۔ سفراء۔ عمروؓ ابن العاص۔ تردد۔ اعتقاد۔ بطریق۔

دستک

(ایک سینج ڈراما)

کردار　　O　ڈاکٹر زیدی

O　بیگم زیدی

O　ڈاکٹر برہان

منظر :

ڈاکٹر زیدی کا کمرہ۔

(ڈاکٹر صاحب پلنگ پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں۔

عمر پینتالیس کے لگ بھگ، فرنچ کٹ ڈاڑھی، چہرے پر نقاہت نمایاں، اس وقت انھوں نے کمبل لپیٹ رکھا ہے۔ پلنگ کے پاس چھوٹی میز پر مختلف شیشیاں پڑی ہیں۔

رات طوفانی، تیز و تند ہوا کا مستقل شور ہو رہا ہے۔ بیگم زیدی آرام کرسی پر بیٹھی کسی رسالے کا مطالعہ کر رہی ہیں۔ عمر پچاس کے قریب۔ سردی کی وجہ سے شال اوڑھ رکھی ہے۔

ڈاکٹر کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ یکایک ان کی نظر سامنے دروازے پر جا پڑتی ہے۔ جس پر نیلے رنگ کا پردہ پڑا ہوا ہے۔

بیگم انھیں دیکھتی ہیں اور پھر رسالے کی ورق گردانی کرنے لگتی

ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کچھ کہتے ہیں مگر بہت آہستہ۔ صرف ان کے ہونٹ حرکت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ پھر کمبل اپنے جسم سے ہٹانے لگتے ہیں۔ بیگم کی نظر پڑتی ہے۔)

بیگم : کیا ہے زیدی ؟

زیدی : دستک سنی ؟

بیگم : دستک !

زیدی : سنی نہیں تم نے ؟

(ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ رک جاتے ہیں)

بیگم : ہو تو سنوں بھی ! کہاں ہے دستک ؟

زیدی : کہاں ہے دستک ! یہ کیا کہ رہی ہو تم ؟ دیکھو تو جا کر۔ کوئی آیا ہے دروازے پر۔ کوئی کھٹکھٹا رہا ہے دروازہ !

بیگم : کوئی نہیں ہے۔

زیدی : صاف آواز آ رہی ہے۔ نہیں جانا چاہتیں تو میں خود ----

(ڈاکٹر صاحب کمبل ہٹانے لگتے ہیں)

(بیگم رسالہ کرسی پر رکھ کر اٹھتی ہیں اور ان کی طرف آتی ہیں)

بیگم : کیا کر رہے ہیں آپ ؟

زیدی : دیکھتا ہوں دروازے پر کون ہے۔ تم تو جاتی ہی نہیں!

بیگم : مہربانی کر کے بیٹھے رہیے! دروازے پر کوئی بھی نہیں ہے۔

زیدی : تو یہ دستک!

(بیگم ان کے گرد کمبل لپیٹنے لگتی ہے)

بیگم : تیز ہوا کا شور ہے۔

زیدی : تیز ہوا دروازے پر دستک دیا کرتی ہے! تم جا کے دیکھو تو ذرا۔

بیگم : میں کہتی ہوں کوئی نہیں ہے۔ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں!

زیدی : ذرا سنو تو۔ صاف۔ بالکل صاف۔ دستک نہیں تو اور کیا ہے؟

بیگم : آپ کا وہم ہے!

زیدی : دیکھو اب زیادہ زور سے ہونے لگی ہے۔ یہ وہم ہے کیا؟ (پھر اٹھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بیگم ان کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے)

بیگم : خدا کے لیے لیٹے رہیے! آپ تو خود ڈاکٹر ہیں۔ ڈاکٹر ہو کر ایسی حرکتیں کر رہے ہیں! اپنی حالت کا کچھ تو خیال کریں۔

زیدی : تم ایک مرتبہ جا کر دیکھ نہیں آتیں!

بیگم : میں جانتی ہوں دروازے پر کوئی نہیں۔ خیر دیکھ آتی ہوں۔ (یوں سر کو جنبش دیتی ہیں جیسے اس کام کو بے کار سمجھ رہی ہیں۔ دروازے کی طرف جاتی ہیں۔ زیدی انھیں ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہتے ہیں۔ بیگم پردے کے پیچھے چلی جاتی ہیں۔ دو تین لمحوں کے

بعد پردے سے باہر آتی ہیں)

زیدی : کون ہے؟

بیگم : کون ہو گا۔

(بیگم واپس آتی ہیں)

زیدی : زیدی تم نے دروازہ کھولا تھا؟

بیگم : (ذرا غصے سے) تو کیا دروازہ کھولے بغیر ہی کہہ رہی ہوں۔ نہ جانے بیٹھے بیٹھے کیا ہو جاتا ہے آپ کو۔ کوئی آئے گا تو کال بیل نہیں دیکھے گا۔ دروازے پر ہی دستک دے گا۔

(ڈاکٹر اور بیگم ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ ڈاکٹر کی نظروں میں بے اعتباری سی ہے اور بیگم کی نظروں میں شکایت)

زیدی : مگر یہ دستک!

بیگم : (الفاظ کاٹتے ہوئے) آپ آرام نہیں کریں گے -- ڈاکٹر ہو کر --

زیدی : (بیوی کے الفاظ کاٹ کر) بار بار مجھے کیوں بتا رہی ہو کہ میں ڈاکٹر ہوں۔

بیگم : وہ اس لیے کہ آپ کو عام لوگوں سے بالکل مختلف ہونا چاہیے۔ اگر ڈاکٹر بھی کسی واہمے کا شکار ہو جائے تو پھر اس کے علم سے کیا فائدہ۔

زیدی : شاید تم سچ ہی کہتی ہو۔

بیگم : (آواز میں نرمی) آپ خود ہی بتایئے ایک ڈاکٹر حقیقت پسند نہیں ہو گا تو اور کون ہو گا؟

زیدی : دروازے پر دستک کی آواز سننا حقیقت کے خلاف ہے؟

بیگم : جب دستک ہی نہ ہو اور اصرار کیا جائے کہ آواز سنی ہے، اس وقت آواز سننا کس طرح حقیقت ہوئی؟

(ڈاکٹر سر جھکا کر اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں۔ بیگم انھیں دیکھتی رہتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی نظریں بے اختیار سامنے پردے پر پڑتی ہیں۔ تیز و تند ہوا کا شور بڑھ گیا ہے۔ شاید بارش شروع ہو گئی ہے) لیٹ جائیں نا۔

(ڈاکٹر صاحب اپنے خیال میں غرق ہیں)

میں نے کیا کہا؟

زیدی : کیا کہا؟

بیگم : لیٹ جایئے!

زیدی : تم نے دروازہ کھول کر دیکھا تھا نا؟

بیگم : حد ہو گئی ہے۔ آپ لیٹ کیوں نہیں جاتے۔ آدھی رات ہو چکی ہے ابھی تک جاگ رہے ہیں۔ ڈاکٹر برہان نے کہا تھا آپ کو مکمل آرام کی ضرورت ہے!

زیدی : یہ بات میں خود نہیں جانتا؟

بیگم : کیوں نہیں جانتے۔ جانتے ہیں اور خوب جانتے ہیں۔ ڈاکٹر برہان

نے کہا تھا میں خود آ کر دوا پلاؤں گا۔ یاد نہیں رہا اسے۔ صبح آئے گا۔

زیدی اچھا لڑکا ہے۔

بیگم : میں نے اتنا ذمے دار اور فرض شناس نوجوان آج تک نہیں دیکھا۔ سوائے کام کے اور کچھ سوجھتا ہی نہیں اسے۔ ہر وقت کام۔ دن ہو یا رات۔ کام کے علاوہ اور کوئی غرض نہیں! یہ ہے فرض شناسی!

زیدی : ڈاکٹر کو فرض شناس ہی ہونا چاہیے!

(یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر صاحب پھر سامنے پردے کو دیکھنے لگتے ہیں)۔

بیگم : آپ پھر۔ توبہ ہے ـــ ڈاکٹر برہان آئیں گے تو کہوں گی!

زیدی : کیا کہو گی؟

بیگم : یہ بھی تو ایک بیماری ہے۔ دروازے پر کوئی ہے نہیں اور آپ ہیں کہ دستک کی آواز سن رہے ہیں۔ ایک بار نہیں کئی بار ایسا ہوا ہے۔

(دروازے کی گھنٹی بجتی ہے)

زیدی : اب تو آیا ہے کوئی!

بیگم : شاید ڈاکٹر برہان ہیں!

(بیگم دروازے کی طرف جاتی ہیں اور پردے کے پیچھے غائب ہو جاتی ہیں۔ چند لمحوں کے بعد جب باہر نکلتی ہیں تو ان کے ساتھ

ڈاکٹر برہان بھی آتے ہیں۔ڈاکٹر برہان عمر کے لحاظ سے بالکل نوجوان ہیں۔ ہاتھ میں ڈاکٹروں والا بیگ۔ برساتی پہن رکھی ہے)

برہان : (دور ہی سے)السلام علیکم ڈاکٹر صاحب۔

زیدی : وعلیکم السلام۔ بڑی تکلیف کی بیٹا! اس وقت آنے کی کیا ضرورت تھی۔ صبح دیکھا جاتا۔

برہان : کوئی بات نہیں۔

بیگم : ہاں بیٹا! اس وقت بھلا کیا ضرورت تھی آنے کی

برہان : آج شام سے پہلے دو کیس ایسے آگئے کہ فرصت ہی نہ ملی۔ بڑا مصروف رہا۔

(برہان آگے بڑھتے ہیں۔ بیگ چھوٹی میز پر رکھ دیتے ہیں) کیسے ٹمپریچر لیا؟

بیگم : تھوڑی دیر پہلے لیا تھا۔ سو (۱۰۰) ہے۔

برہان : سینے میں تو درد نہیں ؟

زیدی : نہیں۔

برہان : شکر ہے۔ اور کوئی بات ؟

بیگم : گھبراہٹ سی ہے۔

برہان : کوئی بات نہیں۔ میرا خیال ہے انجکشن میں ناغہ کر دیا جائے۔

زیدی : یہ ٹھیک ہے۔

(بیگم جلدی سے بائیں دروازے میں سے دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہیں۔ برہان ایک بوتل اٹھاتے ہیں)

برہان : سیرپ ختم ہو گیا ہے۔ کل آؤں گا تو لے آؤں گا۔

زیدی : تو آپ چلے

برہان : جی ہاں۔

بیگم : (دوسرے کمرے سے) ڈاکٹر صاحب!

برہان : جی!

بیگم : ذرا ٹھہریے۔

برہان : مجھے جلدی ہے ذرا۔

بیگم : بس ایک دو منٹ۔ چائے لا رہی ہوں۔

برہان : او ہو آپ نے کیوں تکلیف کی؟

(بیگم آتی ہیں)

بیگم : آپ بھی تو سردی میں آئے ہیں۔ برساتی اتار دیجیے۔

(برہان برساتی اتار کر کرسی کے بازو پر پھیلا دیتے ہیں۔ بیگم چلی جاتی ہیں)

زیدی : بیٹھ جایئے۔

(برہان کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں)

برہان : اور تو کوئی تکلیف نہیں ؟

(بیگم ٹرے میں چائے کی تین پیالیاں لے کر آتی ہیں)

بیگم : میں بتاتی ہوں ڈاکٹر صاحب :

(ٹرے برہان کی طرف بڑھاتی ہیں۔ وہ ایک پیالی اٹھا لیتے ہیں، بیگم دوسری پیالی شوہر کو، اور تیسری پیالی اپنے دائیں ہاتھ میں لے کر خالی ٹرے جھک کر میز کے ساتھ لگا دیتی ہیں)

برہان : (گھونٹ لے کر) آپ کیا بتا رہی تھیں ؟

بیگم : ڈاکٹر صاحب ! یہ بات بتاتے ہوئے مجھے کچھ عجیب سا احساس ہوتا ہے، شاید آپ اس پر یقین نہ کریں گے مگر۔ (شوہر کی طرف دیکھتی ہیں جو نگاہیں جھکائے چائے پینے میں مصروف ہیں)

برہان : فرمایئے تو۔

بیگم : انھیں ایک وہم ہو گیا ہے۔

برہان : وہم !

بیگم : (مسکرا کر) آپ کہیں گے ڈاکٹر اور وہم —— یہ کیا بات ہوئی !

برہان : جی میں نہیں کہوں گا۔ میں جانتا ہوں انسانی فطرت بڑی پُر اَسرار ہوتی ہے اور ڈاکٹر بھی تو ایک انسان ہی ہوتا ہے۔ (بیگم ایک بار پھر شوہر کو دیکھتی ہیں۔ وہ بدستور چائے پینے میں مصروف ہیں)

بیگم : چائے پیجیے نا۔

برہان : بہتر۔

(برہان پیالی ہونٹوں سے لگا لیتے ہیں۔ بیگم بھی چائے پیتی ہیں)

بیگم : پتا نہیں کیا بات ہے۔ بیٹھے بیٹھے خیال کرنے لگتے ہیں کہ دروازے پر دستک ہو رہی ہے۔ حالانکہ دروازے پر کوئی بھی نہیں ہوتا۔

برہان : ہو سکتا ہے کسی نے دروازے پر دستک دی ہو اور آپ نے نہ سنی ہو!

بیگم : دستک ہوتی ہی نہیں میں کیسے مان لوں۔

برہان : یعنی دستک نہیں ہوتی اور ڈاکٹر صاحب محسوس کرتے ہیں کہ دستک ہو رہی ہے۔

بیگم : جی ہاں!

(برہان چائے کے دو گھونٹ لے کر زیدی کی طرف دیکھتے ہیں۔ زیدی نے پیالی خالی کر دی ہے۔ بیگم ہاتھ بڑھا کر پیالی لے لیتی ہیں اور میز پر رکھ دیتی ہیں۔ زیدی نے اپنا سر دیوار سے لگا دیا ہے اور آنکھیں بند کیے لیٹے ہیں)۔

برہان : نیند آ رہی ہے ڈاکٹر صاحب!

زیدی : (آنکھیں کھولے بغیر) جی نہیں۔

بیگم : آج انھیں بار بار یہی خیال آتا ہے۔ میں نے کہا بھی کہ باہر تیز ہوا چل رہی ہے اس کی وجہ سے یہ شور ہو رہا ہے مگر مانتے ہی نہیں۔ دو مرتبہ مجھے دروازے پر بھیجا ہے۔

زیدی : اور وہاں کوئی نہیں تھا۔

بیگم : کوئی بھی نہیں۔

برہان : اچھا۔

بیگم : آپ ان سے پوچھیے۔

(زیدی آنکھیں کھول دیتے ہیں)

زیدی : برہان بیٹا!

برہان : کہیے!

زیدی : یہ آج سے اٹھارہ بیس برس پہلے کا واقعہ ہے۔ اس زمانے میں میری پریکٹس خوب چلتی تھی۔ سر کھُجانے کی بھی فرصت نہیں ملتی تھی۔ ڈسپنسری اور گھر پر مریضوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ ایک رات میں دیر سے گھر پہنچا اور پہنچتے ہی بستر پر گر پڑا —— بری طرح تھک چکا تھا۔

(برہان پیالی میز پر رکھ دیتے ہیں۔ بیگم پیالی ہاتھ میں لیے غور سے دیکھ رہی ہے) کچھ دیر بعد میرے نوکر نے آکر بتایا کہ کوئی بڑے میاں آئے ہیں اور آپ کو ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ میں نے انکار کر دیا اور نوکر سے کہا کہ بڑے میاں کو واپس بھیج دو مگر اس کے روکنے کے باوجود وہ بوڑھا میرے کمرے میں آ گیا اور منت سماجت کرنے لگا کہ میرا بیٹا سخت بیمار ہے پہلے بھی آپ کی دوا سے شفا ہوئی تھی۔ چل کر دیکھ لیں۔ مگر میری آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔

(زیدی دو تین لمحوں کے لیے خاموش رہتے ہیں۔ پھر کہنے لگتے ہیں)

گرم بستر چھوڑنا مشکل محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے سختی سے انکار کر دیا۔ وہ بولتا رہا اور جب نوکر نے اسے زبردستی باہر نکال دیا تو دروازے پر دستک دینے لگا۔ نہ جانے کب تک دستک دیتا رہا۔ میں سو گیا۔

(زیدی پھر خاموش ہو جاتے ہیں۔ بیگم کی نگاہیں اپنے شوہر پر جمی ہیں اور برہان میز سے دوائی کی ایک شیشی اٹھا کر اسے دیکھ رہے ہیں)

صبح اٹھا تو طبیعت پر بڑا بوجھ تھا۔ افسوس کر رہا تھا کہ میں نے بوڑھے کو کیوں مایوس کیا۔

برہان : اس وقت آپ کا ضمیر بیدار ہو گیا تھا۔

زیدی : بس یہی بات تھی ۔ میں نے اس بوڑھے کو ڈھونڈھنے کی کوشش بھی کی مگر کہیں پتا نہ چلا نہ جانے وہ کون تھا۔

برہان : وہ بوڑھا تو چلا گیا۔ مگر اب کبھی کبھی آپ کا ضمیر دروازے پر دستک دیتا رہتا ہے۔

(برہان بوتل میز پر رکھ دیتا ہے)

یہ دوا آج ختم ہو جانی چاہیے تھی ۔

(زیدی خاموش رہتے ہیں۔ برہان برساتی اٹھا کر پہن لیتے ہیں اور بیگ اٹھا کر زیدی کی طرف دیکھتے ہیں)

ڈاکٹر صاحب!

زیدی : کہو بیٹا!

برہان : اس واقعے میں ایک بات کا اضافہ کر لیجیے۔ میں انھیں بڑے میاں کا پوتا ہوں جس کا بیٹا اس رات ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہا تھا۔

زیدی : تم!

بیگم : برہان بیٹا!

برہان : اچھا خدا حافظ! ڈاکٹر صاحب اطمینان کے ساتھ سو جائیے! اب دروازے پر دستک نہیں ہونی چاہیے - آرام کیجیے۔ شب بخیر۔ کل حاضر ہوں گا۔

(برہان دروازے کی طرف بڑھتا ہے اور جلدی سے پردے کے پیچھے غائب ہو جاتا ہے زیدی اور بیگم خاموشی سے دیکھتے رہتے ہیں برہان کے پردے کے پیچھے جاتے ہی پردہ گرتا ہے)

(پسِ پردہ از میرزا ادیب)

سوالات

۱۔ ڈاکٹر زیدی دروازے پر جو دستک سنتے تھے، اس کی اصل وجہ کیا تھی؟

۲۔ "دستک" کے سلسلے میں ڈاکٹر زیدی اور بیگم زیدی کے درمیان جو مکالمے ہوئے ان کا خلاصہ تحریر کیجیے۔

۳۔ اس ڈرامے سے آپ کون سا اخلاقی سبق اخذ کرتے ہیں؟

۴۔ اس ڈرامے سے وہ فقرہ تلاش کیجیے جس میں اس کا مرکزی خیال پوشیدہ ہے۔

۵۔ مندرجہ ذیل الفاظ کے متضاد لکھیے :۔

تیز۔ مستقل ۔ سردی۔ وہم ۔ مصروف آرام ۔ اطمینان

۶۔ پُر اَسرار ، بے کار ، حقیقت پسند اور فرض شناس سے سابقے اور لاحقے الگ کیجیے۔

۷۔ مندرجہ ذیل الفاظ کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

فرض شناس ۔ نقاہت ۔ دستک۔ تاہم ۔ جنبش ۔ چوں کہ ۔ البتہ

- - - - - - - - - - -

حضرت لقمان

جو معزز محترم اور واجب التعظیم نام مسلمانوں کے اثر سے اردو کی دنیا میں آئے ہیں ان میں بہت ہی باوقعت نام حضرت لقمان کا ہے۔ یہ نام علمی دنیا ہی تک محدود نہیں رہا بلکہ زبان زدِ خاص و عام ہو گیا۔ ہر شخص جب کسی کو بہت ہی بڑا عقل مند تسلیم کرتا ہے تو اسے لقمانِ زمانہ کہتا ہے اور جب کوئی کسی کے علمی دعووں پر تعریض کرتا ہے تو کہتا ہے کہ "آپ ہی تو اپنے وقت کے بڑے لقمان ہیں"۔

حضرت لقمان کو دیگر عقلاء کے مقابلے میں یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ ان کا نامِ نامی قرآنِ پاک میں آگیا ہے اور خود جَلّ وَعلا نے بھی لقمان کی حکمت و دانائی کا ذکر کیا ہے۔ اسی وجہ سے اسلام کے علمائے سلف میں اختلاف پڑا کہ لقمان پیغمبر تھے یا صرف ایک عابد و زاہد حکیم۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ پیغمبر نہ تھے، کیونکہ نہ خدائے تعالیٰ ہی نے ان کو پیغمبر بنایا ہے اور نہ کسی ایسی قوم کا پتا چلتا ہے جس کی ہدایت اور اس میں توحید کی تبلیغ کرنے کے لیے مبعوث ہوئے ہوں۔ چنانچہ انھیں امور کے خیال سے علماء کا غالب گروہ انھیں ایک حکیم و دانا اور سلف کا مردِ صالح ہی بتاتا ہے۔

مگر یہ تھوڑی حیرت کی بات نہیں کہ ایسا نامی گرامی شخص جو دینی و دنیوی دونوں حیثیتوں سے محترم مانا جاتا ہو، جس کی دانائی و حکمت کی چار دانگِ عالم میں دھوم ہو، جس کا نام ہر ادنیٰ و اعلیٰ کی زبان پر ہو، اس کے حالات سے بہت ہی کم لوگ واقف ہیں اور یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ کون تھے؟ کب تھے؟ کہاں تھے؟ اور کیا کرتے تھے؟

ان کا نام و نسب لقمان بن فاغور بن ناخور بن تارخ بتایا گیا ہے۔ تارخ حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام تھا۔ جس سے گمان ہوتا ہے کہ وہ حضرت ابراہیم کے ہم نسب ہوں گے مگر یہ غلط ہے۔

جس طرح حبشی غلام عموماً سرزمین نوبیہ اور سوڈان سے لائے جاتے تھے وہ بھی لائے گئے تھے۔ ناک حبشیوں کی طرح بیٹھی ہوئی اور چپٹی تھی۔ ہونٹ موٹے اور بڑے بڑے تھے۔ پاؤں کے تلوے سپاٹ تھے یعنی نشیب و فراز نہ ہونے کے باعث پورا پاؤں زمین پر بیٹھ جاتا تھا۔ جیسے پاؤں عموماً حبشیوں کے ہوتے ہیں۔ بڑھئی کا کام کرتے تھے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ درزی کا کام کرتے تھے اور بعض انھیں چرواہا بتاتے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ مختلف اوقات میں انھوں نے یہ سب کام کیے ہوں۔

ان کے زمانے کے متعلق صرف اس قدر پتا چلتا ہے کہ حضرت داؤد کے عہد میں موجود تھے ۔ جنابِ داؤد کے ہاتھ عنانِ حکومت کے آنے سے پہلے بنی اسرائیل میں فتویٰ دیا کرتے تھے، اس لیے کہ باوجود غلام حبشی ہونے کے علم و فضل نے ان کو قوم بنی اسرائیل کا مفتی بنا دیا تھا۔ بعض علمائے سلف کہتے ہیں کہ انھوں نے علم و فضل حضرت ایوبؑ نبی سے حاصل کیا تھا اور انھیں کے بھانجے تھے۔ چونکہ ان کا حبشی نژاد ہونا پایہ اعتبار کو پہنچا ہوا ہے اس لیے حضرت ایوبؑ کی شاگردی میں تو شبہہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں مگر ان کا بھانجا ہونا ہرگز قابل اعتبار نہیں۔

حبشی غلاموں کو دنیا کی ہر قوم ذلیل و حقیر خیال کرتی ہے۔ اسلام سے پہلے جب کہ غلاموں کے ساتھ بہت ہی بے رحمی اور بہیمیت کا سلوک کیا جاتا تھا، ان غریبوں کی ہر ملک میں نہایت بے قدری تھی۔ مگر ان غلاموں میں لقمان ایسے حکیم و دانا کا ہونا ایسی بات تھی جس سے ان سیاہ فام غلاموں کی عزت اور قدر و منزلت بڑھ گئی۔ چنانچہ حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم پیروانِ دین اسلام کو ہدایت و نصیحت فرماتے ہیں "حبشیوں کو تم اپنی سوسائٹی میں لو۔ اس لیے کہ تین حبشی لقمان، نجاشی اور بلالؓ جنت کے سرداروں میں ہیں"۔

لقمان اگرچہ اعلیٰ ترین حکماء اور داناؤں میں تھے ، مگر اس قدر گمنامی کے زمانے میں تھے کہ ان کی تعلیم و تربیت کے حالات بالکل معلوم نہیں ہو سکے۔ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے حضرت ایوبؑ کی درسگاہِ نبوت سے بہت علمی فائدہ اٹھایا تھا مگر واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی فطری دانائی کی مدد سے انھوں نے اپنے آپ کو خود حکیم بنایا اور جتنا کہ فائدہ کوئی اور شخص کسی استاذ سے اٹھایا کرتا ہے انھوں نے خود اپنی روشن ضمیری اور اپنے قریحۂ صالحہ سے اٹھایا۔

چنانچہ ایک دن اپنے تلامذہ اور خوشہ چینانِ صحبتِ فیض کو حکمت و دانائی کا درس دے رہے تھے کہ ایک شخص سامنے آکے کھڑا ہو گیا۔ دیر تک ان کی صورت پر غور کرتا رہا اور آخر پہچان کے بولا "تم وہی ہو نا جو فلاں مقام پر میرے ساتھ بکریاں چرایا کرتے تھے"۔؟ لقمان نے جواب دیا "ہاں میں وہی شخص ہوں"۔ تب اس نے متحیر ہو کر کہا "تو یہ مرتبہ تمھیں کیونکر حاصل ہوا"؟ فرمایا "صرف دو باتوں سے۔ ایک تو سچ بولنا اور دوسرے بے ضرورت بات نہ کرنا"۔ اس واقعے سے اشارتاً یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ لقمان پہلے غلام تھے اور اپنے آقا کی بکریاں چراتے تھے بعد میں اس کی مہربانی سے آزاد ہو گئے اور لوگوں کو علم و حکمت کی تعلیم دینے لگے۔

ابوالدرداءؓ نے ایک بار لقمان کے حالات و فضائل بیان کرتے ہوئے کہا "ان میں جتنی خوبیاں تھیں وہ نہ ان کو گھر والوں سے ملی تھیں نہ حسب و نسب سے۔ بلکہ وہ ایک شمشیرِ برّاں ، دُھن کے پورے ، خاموش ، ہر امر میں غور و فکر کرنے والے ، ہر معاملے پر گہری نظر ڈالنے والے بزرگ تھے۔ دن کو کبھی نہ سوتے تھے اور شرم کی یہ حالت تھی کہ کبھی کسی شخص نے انھیں تھوکتے، کھنگھارتے ، پیشاب کرتے ، نہاتے ، ہنستے اور بات کو دہراتے نہیں دیکھا۔ یہ اور بات تھی کہ کسی حکمت کی بات کو کوئی شخص دوبارہ پوچھے اور انھیں اس کی تقریر دوبارہ کرنی پڑے۔"

غلامی کے زمانے ہی میں انھیں یہ کمالات حاصل ہو گئے تھے اور خود ان کا مالک بھی اپنے غلام کے ان باطنی کمالات سے واقف ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک

بار ایک بکری کی طرف اشارہ کر کے ان سے کہا "جاؤ اسے ذبح کرو اور گوشت کا بہترین حصہ نکال لاؤ" یہ گئے، بکری کو ذبح کیا اور اس کی زبان اور اس کا دل لے جا کے مالک کے سامنے رکھ دیا۔ دو چار روز بعد اس نے دوسری بکری دی اور کہا "اب کی گوشت کا بدترین حصہ نکال لاؤ"۔ انھوں نے بکری ذبح کی اور پھر وہی زبان و دل اس کے سامنے لا کے رکھ دیے۔ مالک ان کا یہ فعل دیکھ کے نہایت متحیر ہوا اور کہا "یہ کیا؟ میں نے گوشت کے بہترین حصے مانگے تب بھی تم دل و زبان کو لائے اور بدترین حصے مانگے تو اب بھی تم وہی دونوں چیزیں لے آئے ہو"؟ انھوں نے عرض کیا "حضور میرے نزدیک تو ایسا ہی ہے۔ یہی دل و زبان اگر پاک ہوں تو ان سے بہتر کوئی چیز نہیں اور اگر ناپاک ہوں تو ان سے بری بھی کوئی چیز نہیں"۔

حضرت لقمان کی شادی بھی ہوئی تھی اور ایک صاجزادے تھے جن کا نام ثاران تھا۔ ایک اور بیٹا بھی ہوا تھا جو ان کے سامنے دنیا سے رخصت ہو گیا۔ بیٹے کی موت سے کہاں تک دل کو چوٹ نہ لگی ہو گی مگر آنکھیں تر نہیں ہونے پائیں اور نہ کسی نے اس کے غم میں کبھی روتے دیکھا۔ اپنے عہد کے امراء و سلاطین کے درباروں میں بھی کبھی کبھی چلے جاتے تھے مگر وہاں کبھی کوئی غرض لے کے نہیں گئے بلکہ صرف عبرت حاصل کرنے کے لیے اور حکمت و دانائی کی باتوں کی تلاش میں جایا کرتے تھے۔

لقمان کی کل نصیحتیں اپنے بیٹے کے سمجھانے کے لیے ہیں۔ چنانچہ یہ نصیحتیں بھی ان کی جانب منسوب کی جاتی ہیں جو وصایائے لقمان سے ماخوذ ہیں۔

اپنے فرزند کی طرف مخاطب ہو کے فرماتے ہیں "بیٹا! جب کسی صحبت میں جاؤ تو لوگوں کو سلام کر کے بیٹھ جاؤ۔ اگر وہ لوگ خدا کے ذکر میں مشغول ہوں تو ٹھہرو اور اگر کسی اور کے ذکر میں مصروف ہوں تو ان کی صحبت چھوڑ دو اور دامن جھاڑ کے اٹھ کھڑے ہو۔ بیٹا! برے لوگوں سے پناہ مانگتے رہو اور جو اچھے ہیں ان سے بھی ڈرتے رہو۔ دنیا میں نہ پھنسو اور اپنے دل کو اس میں نہ لگاؤ کیونکہ تم دنیا کے

لیے نہیں پیدا کیے گئے ہو اور خدا کی ساری مخلوق میں اس کے نزدیک اس دنیا سے زیادہ ذلیل اور کوئی چیز نہیں ہے۔ اس لیے کہ نہ اس کی نعمتیں فرماں برداروں کے حق میں جزائے خیر ہیں اور نہ اس کی مصیبتیں گنہگاروں کے لیے سزا ہیں۔ بیٹا! کسی بات پر جب تک مجبور نہ ہو جاؤ نہ ہنسو۔ نہ بے مطلب کسی طرف قدم اٹھاؤ اور نہ اس بات کو پوچھو جس سے تمھیں واسطہ نہیں۔ بیٹا! اپنا مال ضائع نہ کرو اور دوسرے کے مال کی اصلاح نہ کرو۔ تمہارا مال وہ ہے جو تم نے خدا کی راہ میں دیا اور دوسروں کا وہ ہے جو تم نے اوروں کے لیے چھوڑ دیا۔ بیٹا! جو کوئی اوروں پر رحم کرتا ہے خود اس پر بھی رحم کیا جاتا ہے۔ جو خاموش رہتا ہے، امن میں رہتا ہے، جو اچھی بات کہتا ہے اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ جو جھوٹ بولتا ہے گنہگار ہوتا ہے اور جو زبان اپنے قابو میں نہیں رکھتا ندامت اٹھاتا ہے۔ بیٹا! علماء کی صحبت میں گھٹنوں کے بَل جاؤ اور ان کے سامنے خاموش بیٹھ کے کان لگاؤ۔ اس لیے کہ علماء کے نور سے دل اسی طرح زندہ ہوتا ہے جس طرح مردہ زمین آسمان کے مینہ سے زندہ ہو جاتی ہے۔"

حضرت لقمان کی یہ نصیحتیں آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں اور سچ یہ ہے کہ اخلاقی اور دیندارانہ زندگی کے لیے ان سے بہتر نصیحتیں نہیں مل سکتیں۔

(مضامینِ شرر از عبدالحلیم شرر)

سوالات

۱۔ حضرت لقمان کون تھے؟

مندرجہ ذیل جوابات میں سے صرف غلط جواب کے نمبر کے گرد دائرہ لگایئے:۔

(الف) بنی اسرائیل کے ایک پیغمبر تھے

(ب) جنوبی افریقہ کے ایک حبشی تھے۔

(ج) حضرت ایوبؑ کے ہم عصر تھے۔

(د) بنی اسرائیل کے زمانے کے ایک دانا اور حکیم انسان تھے۔

۲۔ قرآن میں حضرت لقمان کا ذکر کس حیثیت سے آیا ہے؟

۳۔ حضرت لقمان کا حلیہ اور ان کی سیرت کی خوبیاں قلمبند کیجیے۔

۴۔ حضرت لقمان کی دانائی کا کوئی واقعہ بیان کیجیے۔

۵۔ حضرت لقمان کے کچھ حکمت آموز اُقوال اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔

۶۔ مندرجہ ذیل الفاظ میں جمع کے واحد لکھیے:۔

عقلاء ۔ تلامذہ۔ امراء۔ وصایا۔ فضائل ۔ سلاطین ۔

۷۔ اعراب لگائیے۔

واجب التعظیم ۔ تعریض ۔ مبعوث ۔ تلامذہ ۔ متحیر۔ اصلاح ۔

فعلِ ناقص وہ فعل ہے جو کسی کام کے کرنے کی بجائے کسی کام کے ہونے کو ظاہر کرے با الفاظ دیگر "جس سے کسی کام کا کرنا نہیں بلکہ ہونا ظاہر ہو" مثلاً "اکرم کامیاب ہو گیا" فعلِ ناقص ہے ۔ فعلِ ناقص یہ ہیں۔

ہے ، ہیں ، ہوا ، ہوئے ، ہو گا ' تھا ' تھی ، رہا ، بنا ، نکلا وغیرہ ۔

۸۔ اس سبق میں سے پانچ ایسے جملے منتخب کیجیے جن میں فعل ناقص استعمال ہوئے ہیں۔

شیخ سعدیؒ

شیخ سعدیؒ[۱] کے بچپن کا حال اس سے زیادہ معلوم نہیں کہ ان کو نماز روزے کے مسائل بہت تھوڑی عمر میں یاد کرائے گئے تھے اور بچپن ہی میں ان کو عبادت، شب بیداری اور تلاوتِ کلام مجید کا کمال شوق تھا۔ عید اور تہواروں میں ہمیشہ اپنے باپ کے ہمراہ رہتے اور کہیں آوارہ پھرنے نہ پاتے تھے۔ باپ ان کے اَفعال و اَقوال کی نگرانی عام باپوں کی نسبت زیادہ کرتا تھا۔ شیخ نے اپنی تربیت کا بہت بڑا سبب اسی باپ کی تادیب اور زَجر و توبیخ کو قرار دیا ہے۔ اس زمانے میں مسلمانوں کے بے شمار مدرسے بلادِ اسلام میں جا بجا کھلے ہوئے تھے، لیکن سب سے زیادہ شہرت نظامیہ بغداد نے حاصل کی تھی، جس کو خواجہ نظام الملک طوسی نے ۴۵۹ھ میں بنوایا تھا۔

اس مدرسے سے ہزاروں جلیل القدر عالم اور حکیم تعلیم پا کر نکلے ہیں، جن کی تصنیفات اب تک مسلمانوں میں موجود ہیں۔ یہ مدرسہ اس قدر نامور تھا کہ جو علماء یہاں کے پڑھے ہوتے مشہور ہو جاتے تھے، پھر ان کے مستند اور ذی اعتبار ہونے کا کسی کو شبہ نہ رہتا تھا۔

شیخ نے مدرسہ نظامیہ میں جا کر تحصیلِ علم شروع کی اور جیسا کہ بوستان میں آپ نے تصریح کی ہے، یہاں سے ان کے لیے کچھ وظیفہ بھی مقرر ہو گیا تھا۔ بغداد میں جن لوگوں سے شیخ نے پڑھا تھا ان میں سب سے زیادہ مشہور اور نامور شخص

۱۔ شیخ سعدی کا شمار ہمارے نامور اسلاف میں ہوتا ہے۔ وہ فارسی زبان کے بہت بڑے شاعر اور اخلاقیات کے عظیم معلم تھے۔ عام روایات کے مطابق ۶۰۶ھ میں ایران کے مشہور شہر شیراز میں پیدا ہوئے اور یہیں ۶۹۱ھ میں وفات پائی۔ نثر میں "گلستان" اور نظم میں "بوستان" ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ جن کے اقتباسات آج تک ہماری درسی کتابوں میں شامل چلے آرہے ہیں۔

علّامہ ابوالفرج عبدالرحمان ابنِ جوزی ہیں جن کالقب جمال الدین ہے۔

شیخ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں ان کے ہم عمر اور ہمسر لوگ انکی خوش بیانی اور حسنِ تقریر پر رشک کرتے تھے۔ چنانچہ ایک بار شیخ نے استاد سے شکایت کی کہ فلاں طالب علم مجھ کو رشک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ جب میں آپس میں بیٹھ کر مسائلِ علمیہ بیان کرتا ہوں تو وہ حسد سے جل جاتا ہے۔ استاد یہ سن کر شیخ پر غصے ہوئے اور یہ کہا کہ اوروں کے رشک وحسد کی تو شکایت کرتے ہو اور اپنی بدگوئی اور غیبت کو برا نہیں سمجھتے۔

شیخ کا مُیلان بچپن سے فقر اور درویشی کی طرف زیادہ تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں بھی وہ برابر وجد وسماع کی مجلس میں شریک ہوتے تھے اور علامہ ابن جوزی ہمیشہ ان کو سماع سے منع کرتے تھے، مگر شیخ کو سماع کا ایسا چسکا تھا کہ اس باب میں کسی کی نصیحت کارگر نہ ہوتی تھی لیکن علماء کی سوسائٹی بھی آہستہ آہستہ آپ کے دل میں گھر کرتی جاتی تھی۔ آخر ایک روز کسی مجلس میں انھیں ایک بدآواز قوال سے پالا پڑا اور بہ ضرورت ساری رات اس مکروہ صحبت میں بسر ہوگئی۔ صحبت کے ختم ہونے پر آپ نے سر سے منڈاسا اتارا اور جیب میں سے ایک دینار نکالا اور یہ دونوں چیزیں قوال کے نذر کیں۔ اصحابِ مجلس کو اس حرکت سے تعجُبّ ہوا۔ شیخ نے یاروں سے کہا کہ میں نے آج اس شخص کی کرامت مشاہدہ کی ہے۔ میرا مربّی استاد ہمیشہ سماع سے منع کرتا تھا مگر میں نے ان کے حکم کی تعمیل نہ کی اور برابر سماع میں شریک ہوتا رہا۔ آج خوش قسمتی سے اس مبارک جلسے میں آنا ہوا اور اس بزرگوار قوال کے تصرّف سے میں نے ہمیشہ کے لیے سماع سے توبہ کی۔

شیخ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ مدرسے کی صحبت سے عالمِ طالب علمی میں تصوّف اور درویشی کے خیالات ان کے دل سے اتر گئے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک شخص خانقاہ کو چھوڑ کر مدرسے میں چلا آیا۔ میں نے پوچھا کہ عالم اور درویش میں کیا فرق دیکھا جو اس طریقے کو چھوڑ کر اس کوچے میں قدم رکھا؟ کہا: ”درویش

،صرف اپنی جان بچانے میں کوشش کرتے ہیں اور علماء یہ چاہتے ہیں کہ اپنے ساتھ ڈوبتوں کو بھی بچائیں۔"

شیخ مدرسہ نظامیہ سے نکل کر مدتِ دراز تک ایشیا اور افریقہ میں برابر سیروسیاحت کرتے رہے۔ جب کتاب کے مطالعے سے ان کا جی سیر ہو گیا تو نسخہٗ کائنات کا مطالعہ شروع کیا۔ بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ آپ نے تیس برس کی عمر تک تحصیلِ علم کی ہے اور تیس برس سیروسفر میں اور تیس برس تالیف و تصنیف میں اور تیس برس عُزلت نشینی میں بسر کیے ہیں۔ اگرچہ تیس تیس برس کے چار مساوی حصے مقرر کرنے تکلف سے خالی نہیں مگر اس میں شک نہیں کہ شیخ کی عمر کا بڑا حصہ تحصیلِ علم اور سیروسفر میں بسر ہوا۔

اگرچہ شیخ کی شہرت طبقہ علماء میں اس قدر نہیں ہوئی جس قدر زمرۂ شعراء میں ہوئی مگر آپ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک مُحقِق اور سلجھے ہوئے عالم تھے۔ بعض موقعوں پر فقہاء اور زُہاد کے مجمعوں میں آپ کو بحث و مناظرہ کا اتفاق ہوا ہے اور اخیر کو ان کی رائے سب پر غالب رہی ہے۔ ایک بار غالباً شام یا عراق کے کسی شہر میں جہاں ان کی جان پہچان کم تھی، کسی تقریب سے قاضی شہر کی مجلس میں ان کا گزر ہوا۔ اس وقت شیخ نہایت شکستہ حال تھے اور مجلس میں تمام علماء وفقہاء تُزک واحتشام سے بیٹھے تھے۔ شیخ سادگی سے سب کے برابر جا بیٹھے۔ خدام نے جھڑک کر وہاں سے اٹھا دیا اور مشکل سے پائینِ مجلس جگہ ملی۔ اس وقت کسی مسئلے پر گفتگو ہو رہی تھی اور کسی سے وہ عقدہ حل نہ ہوتا تھا۔ شیخ نے دور ہی سے باآوازِ بلند کہا کہ اگر مجھ کو اجازت ہو تو اس باب میں میں بھی کچھ کہوں۔ سب شیخ کی طرف متوجہ ہو گئے اور ایک کم حیثیت آدمی کی ایسی جرأت پر سب کو تعجُّب ہوا۔ شیخ نے اس مسئلے کو بہت خوبی اور فصاحت سے بیان کیا۔ چاروں طرف تحسین و آفرین ہونے لگی۔ قاضی نے مسند چھوڑ دی اور عمامہ سر سے اتار کر شیخ کے سامنے رکھ دیا۔ شیخ نے کہا "یہ غرور کا اوزار مجھے نہیں چاہیے۔ جب لوگ مجھ کو حقیر اور ذلیل معلوم

ہوں گے تو پھٹے پرانے کپڑے والوں سے میں بھی تمہاری طرح ناک چڑھاؤں گا"۔

اکثر تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ شیخ نے چودہ حج پیادہ پا کیے ہیں اور خود شیخ کے کلام سے بھی ایسا ہی ثابت ہوتا ہے۔ شیخ کے کلام سے جا بجا یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ بے سروسامان اور متوکّل درویشوں کی طرح سفر کرتے رہے ہیں اور بعض موقعوں پر ان کو حالتِ سفر میں نہایت سخت تکلیفیں اور ایذائیں پہنچی ہیں۔

وہ "گلستان" میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔ کہ میں نے کبھی زمانے کی سختی اور آسمان کی گردش کا شکوہ نہیں کیا، مگر ایک موقع پر دامنِ استقلال ہاتھ سے چھوٹ گیا، نہ میرے پاؤں میں جوتی تھی اور نہ جوتی خریدنے کا مقدور تھا۔ اسی حالت میں غمگین اور تنگ دل، کوفے کی جامع مسجد میں جا پہنچا۔ وہاں ایک شخص کو دیکھا جس کے پاؤں ہی سرے سے نہ تھے۔ اس وقت میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور اپنے ننگے پاؤں ہی غنیمت سمجھے۔

عالمِ غربت میں کبھی کبھی عُسرت اور تنگی کا ہونا ایک لازمی امر تھا، مگر شیخ ایسے موقعوں پر خودداری کو ہاتھ سے نہ دیتے تھے۔ ایک سال اسکندریہ میں جب کہ شیخ وہاں موجود تھے، نہایت سخت قحط پڑا اور درویشوں پر بہت سختی گزرنے لگی۔ اس زمانے میں وہاں ایک ہیجڑا نہایت دولت مند تھا۔ غریبوں اور پردیسیوں کو اس کے ہاں سے کھانا یا نقدی ملتی تھی۔ کچھ درویش جو غالباً شیخ کے رفقا میں سے تھے، شیخ کے پاس آئے اور اس ہیجڑے کے ہاں دعوت میں چلنے کی تحریک کی۔ شیخ نے ان کے ساتھ دعوت میں چلنے سے انکار کیا اور یہ کہا کہ شیر بھوک کے مارے مر بھی جائے تو بھی کتے کا جھوٹا نہیں کھاتا۔

خود مختار سلطنتوں میں کوئی شے رائے کی آزادی اور خاص کر بادشاہوں کے چال چلن پر آزادانہ رائے دینے سے زیادہ خطرناک نہیں ہوتی، مگر شیخ نے جن کے وقت میں ہر بادشاہ حاکم عَلَی الاِطلاق تھا، اس فرض کو پورا پورا ادا کیا۔ سلاطینِ عہد

کے اخلاقی عیب اور ان کی بد خصلتیں جس طرح آپ نے بیان کی ہیں، آزاد سلطنتوں میں بھی اس سے زیادہ لکھنی مشکل ہیں، مگر آپ نے ایسے لطیف پیرایوں میں ان پر چوٹیں کی ہیں کہ کسی کو اس پر گرفت کرنے کا موقع نہیں ملا۔

اتابک ابو بکر جو علماء کا مخالف اور مشائخ و زہاد کا حد سے زیادہ معتقد تھا۔ اس کی تنبیہہ کے واسطے اس نے "گلستان" اور "بوستان" میں بہت سی حکایتیں لکھی ہیں۔ مثلاً گلستان کی ایک حکایت میں کسی درویش کا حال لکھا ہے جو کہ جنگل میں رہتا تھا اور درختوں کے پتے کھاتا تھا۔ ایک بادشاہ اس کی زیارت کو گیا اور اسے شہر میں لے آیا اور ایک عمدہ بستان سرا میں اتارا۔ چند روز جو اچھے اچھے کھانے کھانے کو، نفیس کپڑے پہننے کو اور لونڈیاں خدمت کرنے کو ملیں اور ہر طرح کا آرام و آسائش پایا، شاہ صاحب نے خوب رنگ و روغن نکلا، ہیئت اور صورت بالکل بدل گئی۔ ایک دن بادشاہ قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا، درویش کو اچھی حالت میں دیکھ کر بہت خوش ہوا اور کہا کہ جس قدر مجھ کو علماء اور زہاد سے محبت ہے، ایسی کسی اور گروہ سے نہیں، فیلسوف وزیر نے عرض کیا۔ "حضور! شرطِ دوستی یہ ہے کہ دونوں کے ساتھ بھلائی کی جائے اور اس لیے علماء کو روپیہ دینا چاہیے تاکہ اطمینان سے درس اور تصنیف میں مصروف رہیں اور زاہدوں کو کچھ نہ دینا چاہیے تاکہ وہ اپنے زُہد پر قائم رہیں۔"

شیخ کی عقیدت و ارادت ممالک ایران کے سوا شام وغیرہ میں بھی ایسی ہی تھی جیسی فارس اور عراق عجم میں، چنانچہ ایک دفعہ شیخ دمشق کی جامع مسجد میں حضرت یحیٰی کی تُربت پر مُعتکف تھے۔ عرب کا بادشاہ جو ظلم اور بے انصافی میں مشہور تھا مسجد میں آیا اور نماز و دعا سے فارغ ہو کر شیخ کے پاس گیا اور کہا: "مجھ کو ایک سخت دشمن کے حملے کا اندیشہ ہے، آپ میرے لیے دعا کریں" شیخ نے کہا: "کمزور رعیت پر رحم کر تاکہ زبردست دشمن سے محفوظ رہے۔ جس نے بدی کا بیج بویا اور نیکی کی

امید رکھی، اس نے ایک لغو خیال پکایا اور بیہودہ امید باندھی"۔

(حیاتِ سعدیؒ از الطاف حسین حالی)

سوالات

۱۔ شیخ سعدیؒ کے زمانہ طالب علمی کا حال اپنے الفاظ میں لکھیے۔

۲۔ اس سبق میں سعدیؒ کی خودداری اور حق گوئی کے دو واقعات آئے ہیں ان میں سے کوئی ایک واقعہ اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۳۔ حکمرانوں کو طبقہ علماء کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے؟

۴۔ قوسین میں دیے ہوئے ہم آواز الفاظ کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کیجیے کہ ان کے معنوں کا فرق واضح ہو جائے:۔

(نذر ۔ نظر) (معمور ۔ مامور) (مِنّت ۔ مَنّت)

۵۔ مندرجہ ذیل الفاظ کے سابقے اور لاحقے الگ الگ کیجیے اور ان کی مدد سے دو دو نئے الفاظ بنائیے:۔

ہم عمر ۔ نامور ۔ ذی اعتبار ۔ کارگر ۔ تنگ دل ۔ خطرناک ۔

۶۔ مندرجہ ذیل میں سے مرکبِ اضافی، مرکبِ توصیفی اور مرکبِ عطفی الگ الگ کیجیے۔

طبقہ علماء ۔ تصوف اور درویش ۔ تزک و احتشام ۔ دامن استقلال ۔ ننگے پاؤں ۔ گلستان اور بوستان ۔ قاضی شہر ۔ عمدہ بستاں سرا ۔ سیر و سفر ۔ لغو خیال ۔ تحصیل علم ۔ زبردست دشمن ۔ نسخہ کائنات ۔ زجرو توبیخ ۔ کمزور رعیت ۔ طالب علم ۔

۷۔ کالم ۱ میں چند الفاظ درج ہیں ۔ کالم ۲ میں ان کے متضاد بے ترتیبی سے دیے

گئے ہیں جوابی کالم میں ہر لفظ کے سامنے اس کے صحیح متضاد کا حرفی نمبر درج کیجیے:۔

کالم ۱	کالم ۲	جوابی کالم
۱۔ فعل	(الف) رند	
۲۔ عالم	(ب) منحوس	
۳۔ مشہور	(ج) دوست	
۴۔ مبارک	(د) گم نام	
۵۔ دشمن	(ہ) جاہل	
۶۔ زاہد	(و) عشرت	
۷۔ بلند	(ز) صغیر	
۸۔ کبیر	(ح) پست	
۹۔ عسرت	(ط) قول	

~~~~~~~~~~
~~~~~~~~~~

خوشِ خُلقی

جس طرح ہمارے رسول صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کو تمام رسولوں پر فوقیت اور فضیلت ہے، اسی طرح ان کے اوصاف و خصائل سب پیغمبروں سے اعلیٰ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خود اپنے کلام قرآن شریف میں اس کا ذکر فرمایا ہے۔ مگر وصف بھی وہ بیان کیا گیا جو تمام اوصاف کی جان ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا۔ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْم تمہاری پیدائش (اے محمد) بہت بڑے خُلق پر ہوئی ہے اس سے معلوم ہوا کہ حسن خلق ایسی شاندار چیز ہے کہ حضور رسولِ مقبولؐ کے اعلیٰ اوصاف میں اس کا شمار ہوا۔ خود حضور رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم نے اپنے حُسنِ خلق کی فضیلت میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس کو ذیل میں قلمبند کر کے بد خلقی کی برائی کو لکھا جائے گا اور اس کے بعد بتایا جائے گا کہ حُسنِ اَخلاق کیا چیز ہے۔

احمدؒ [1]، حاکمؒ [2] اور بیہقیؒ [3] نے حضرت ابی ہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے فرمایا کہ میں اس واسطے بھیجا گیا ہوں کہ عمدہ اخلاق کی تکمیل کروں۔ ابو داؤدؒ [4] اور ترمذیؒ [5] نے ابوالدرداءؓ [6] سے روایت کی ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم نے فرمایا کہ سب سے بھاری چیز جو

۱۔ امام احمد بن حنبلؒ (۱۶۴-۲۴۱ھ) محدث اور فقیہ مسند احمد کے مؤلف۔
۲۔ حاکم نیشا پوریؒ (۳۲۱-۴۰۵ھ) المستدرک کے مؤلف
۳۔ البیہقیؒ: کتاب السنن الکبریٰ کے مؤلف۔
۴۔ ابوداؤدؒ: سنن ابی داؤد کے مؤلف (۱۳۳-۲۰۴ھ)
۵۔ امام ترمذیؒ: صحاح ستہ میں سے ایک کتاب کے مؤلف۔
۶۔ ابوالدرداءؓ: صحابیِ رسولؐ، مدینے کے رہنے والے تھے۔ ۳۲ ہجری میں دمشق میں وفات پائی۔

میزانِ عمل میں رکھی جائے گی وہ خدا سے ڈرنا اور خوش خلقی ہوگی۔ ایک دفعہ کسی نے حضورؐ سے دریافت کیا، دین کیا چیز ہے؟ حضورؐ نے فرمایا خوش خلقی۔ اس شخص نے حضورؐ کے داہنی طرف آ کر یہی سوال کیا اور یہی جواب پایا۔ یہاں تک کہ چاروں رخ سے پوچھا اور ایک ہی جواب پایا۔

ایک اور آدمی نے دریافت کیا۔ اعمال میں افضل کیا چیز ہے؟ فرمایا حسن خلق۔ کسی نے دریافت کیا بہ اعتبار ایمان کون افضل ہے؟ ارشاد ہوا جو خلق میں سب سے اچھا ہے۔ طبرانیؒ[1] نے "مکارم الاخلاق" میں بروایت حضرت ابی ہریرہؓ بیان کیا ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا اگر تم لوگوں سے دولت میں نہیں بڑھ سکتے تو خندہ پیشانی اور خلقِ حُسن میں بڑھ جاؤ۔

حضرت جریرؓ بن عبداللہ سے ایک دفعہ ارشاد ہوا تجھ کو اللہ نے خوب صورت بنایا ہے، اپنے خلق کو بھی خوب صورت بنا۔ حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اکثر یوں دعا فرماتے تھے۔ اَللّٰھُمَّ اَحْسَنْتَ خَلْقِیْ فَحَسِّنْ خُلُقِیْ۔ (الٰہی تو نے میری صورت اچھی بنائی ہے تو میرا خُلق بھی اچھا بنا۔)

دریافت کیا گیا، بندے کو سب سے اچھی چیز کیا دی گئی ہے؟ فرمایا "خلق حسن"۔ دوسری جگہ فرمایا، "قیامت کے دن زیادہ محبوب اور میرے قریب بیٹھنے والے وہ لوگ ہوں گے جن کے اخلاق اچھے ہوں گے"۔ فرمایا "خوش خلقی گناہ کو اس طرح گھلا دیتی ہے جس طرح دھوپ برف کو"۔ فرمایا "کوئی تدبیر عقل کی موافق نہیں ہوتی مگر خوش خلقی۔"

حضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم سے کسی نے دریافت کیا نحوست کیا چیز ہے؟ فرمایا، "بد خلقی"۔ بد خلقی اعمالِ نیک کو اس طرح خراب کر دیتی ہے جس طرح

۱۔ ابو القاسم سلیمان بن احمد الطبرانی، حافظ اور محدث۔ المعجم الکبیر کے مولف (۲۶۰ - ۳۲۰ھ)

ہر کہ شہد کو بدمزہ کر دیتا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے ۔ بد خلقی ایسا گناہ ہے جو کبھی بخشا نہیں جائے گا۔ نیز حضورؐ نے فرمایا، "بد خُلق آدمی دوزخ کی تہ میں ڈالا جائے گا۔" حضرت خواجہ حسن بصریؒ نے فرمایا ، "بد خُلق انسان اپنی جان کو آفت میں خود پھنساتا ہے"۔ وہب بن منبہ فرماتے ہیں ، "بد خلق ٹوٹا ہوا برتن ہے ، نہ جُڑ سکتا ہے نہ مٹی بن سکتا ہے۔" حضرت فضیلؒ نے فرمایا ، "بد کار خوش خلق کو بد خُلق عابد پر ترجیح ہے۔"

حضرت خواجہ حسن بصریؒ فرماتے ہیں ، "کہ خوش خُلقی یہ ہے کہ کشادہ پیشانی رہے اور دولت کو خرچ کرے اور کسی کو ایذا نہ دے۔" واسطیؒ فرماتے ہیں کہ "خوش خلقی کی یہ علامت ہے کہ نہ آدمی خود کسی سے دشمنی کرے اور نہ کوئی اس سے خصومت رکھے اور مفلسی اور تونگری میں خلقت اس سے راضی رہے۔" شاہ کرمانیؒ کے خیال میں ایذا سے باز رہنا اور مشقتوں کا سہنا خوش خلقی ہے۔ ایک اور بزرگ فرماتے ہیں "غربت کی شان سے لوگوں کے قریب رہنا خوش خلقی ہے۔" حضرت مولا علیؓ فرماتے ہیں ، "خوش خلقی تین چیزوں میں ہے۔ محرّمات سے بچنا ، حلال روزی تلاش کرنا اور عیال پر زیادہ خرچ کرنا۔" امام غزالیؒ کی رائے میں خلق کی تعریف یہ ہے کہ "انسان سے افعال بآسانی و بلافکر و تأمّل صادر ہوں۔ اگر وہ افعال عقلاً" و شرعاً" عمدہ ہیں تو خوش خلقی ہے ، ورنہ بد خلقی" نیز فرمایا خلق فعل کا نام نہیں ہے ، کیونکہ بہت سے آدمی طبیعت کے اعتبار سے سخی ہوتے ہیں مگر مفلسی کے سبب سخاوت نہیں کر سکتے یا بعض آدمیوں کی طبیعت بخیل ہوتی ہے لیکن ریا کاری سے خرچ کرتے ہیں اور فرمایا جس طرح ظاہری جسم محض آنکھوں یا صرف رخساروں کی موزونیت سے مکمل نہیں کہلاتا جب تک کہ کل جسم کے اعضاء موزوں نہ ہوں ، اسی طرح خوش خلقی ، جو انسان کا باطنی حسن ہے ، چار چیزوں سے مکمل ہوتی ہے۔ ایک قوت علم ، دوسرے قوت غضب تیسرے قوت خواہش چوتھے قوت عدل یعنی ان چاروں طاقتوں کو درجۂ اعتدال پر رکھنا۔ علمی طاقت کی ضرورت اس لیے ہے کہ

آدمی اس کے سبب اپنے اعمال اور عقائد میں راست رُو رہتا ہے۔ اسی طرح سے غُضَبْ اور شہوانی طاقت پر قابو ہونا محاسنِ اخلاق کے لیے لازمی ہے اور یہ قابو قوتِ عَدْل کے بغیر نہیں ہو سکتا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ جس طرح انسان سے ظاہری جسم کی اصلاح ناممکن ہے اسی طرح باطنی درستی بھی دشوار ہے۔ بونا آدمی کوشش سے دراز قد نہیں بن سکتا، کالا رنگ گورا نہیں ہو سکتا، بدصورتی خوبصورتی سے نہیں بدل سکتی ایسے ہی جس کی سرشت میں کج اخلاقی ہے ، وہ تدبیر سے خوش اخلاق نہیں بن سکتا۔ مگر یہ خیال بالکل غلط ہے۔ اول تو یہ بعض جسمانی مثالیں اس مسئلے پر کماحقہٗ صادق نہیں آتیں۔ دوسرے یورپ کے محققین نے اس کلیے کو بھی غلط ثابت کر دیا ہے اور جسم کے وہ عارضے ، جن کی صحت ناممکن مانی گئی تھی، ان کی تدبیروں سے کم ہوتے جاتے ہیں۔

بدخلقی کا بدل جانا فطرت سے ثابت ہے۔ درندے جانور انسان کی تربیت سے اپنی خونخوار خصلت کو بھول جاتے ہیں تو خود انسان دوسرے انسانوں کی تربیت سے اصلاح پزیر کیوں نہ ہو سکے گا۔ بعض آدمی تو پیدائشی نیک اور خوش خلق ہوتے ہیں لیکن جن کی عادت ابتداء سے بدخوئی اور تنک مزاجی کی ہوتی ہے وہ بھی خوش خلق بن سکتے ہیں۔ جس کی سب سے آسان ترکیب خوش اخلاق لوگوں کی صحبت ہے۔ زمانہ قدیم سے لے کر اس نئے زمانہ تک (جو پرانے عہد کی باتوں پر خندہ زنی کرتا ہے) یہ امر مسلم ہے کہ صحبت کا اثر تمام تعلیمات سے بڑھ کر ہے۔ ملنے جلنے کی تاثیر سے آدمی میں انسانیت پیدا ہوتی ہے۔ اسی واسطے مشائخ عظام نے حسن صحبت کو تُصَوُّف کی درسگاہ مانا ہے۔

جس کو خوش خلقی سیکھنی ہو یا کسی دوسرے کو خوش خلق بنانا ہو تو چاہیے کہ ایک ایسے شخص کی صحبت اختیار کرے جو خوش اخلاقی کا مکمل نمونہ ہو۔

خوش خلقی کی ذہن نشین تعلیم ایک انسانِ کامل کی اخلاقی مثالوں کے بغیر دشوار ہے۔ اس واسطے حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے اخلاق کی چند مثالیں معتبر و مستند کتب سے اخذ کر کے لکھی جاتی ہیں۔ مشائخ صوفیہ ان مثالوں کو توجہ اور غور سے ملاحظہ فرمائیں اور اپنے متکبرانہ اخلاق کی تبدیلی میں متوجہ ہوں۔

حضرت رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کا قاعدہ تھا کہ بیمار کی عیادت کو خود تشریف لے جاتے۔ غلام کی دعوت منظور کر لیتے۔ پاپوش مبارک کی خود مرمت کر لیتے، کپڑوں میں پیوند لگا لیتے، اپنے گھر والوں کے کام میں شریک ہو کر خود کام کرنے لگتے۔ اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرتے، صحابہ کو تکلیف نہ دیتے بلکہ جو کام خود نہ کر سکتے تھے اس کو بھی دوسرے سے کرانا برا تصوّر فرماتے تھے۔ جب حضورؐ کا گزر لڑکوں پر ہوتا ان کو سلام کرتے۔

ایک شخص حضورؐ کے پاس آیا۔ وہ حضورؐ کی ہیبت سے کانپنے لگا۔ حضورؐ نے فرمایا کیوں ڈرتا ہے؟ میں بادشاہ نہیں ہوں۔ میں تو قریش کی ایک عورت کا لڑکا ہوں جو خشک گوشت کھایا کرتی تھی۔ حضورؐ کا دستور تھا کہ آپؐ اپنے اصحاب میں اس طرح سے مل جل کر بیٹھتے تھے کہ اجنبی آدمی حضور کو پہچان نہ سکتا تھا۔ آخر صحابہ نے بار بار عرض کر کے مٹی کا ایک چبوترہ بنا دیا جس پر حضورؐ تشریف رکھنے لگے اور لوگوں کو اس امتیاز کے سبب شناخت کی دقت جاتی رہی۔

ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے حضورؐ سے عرض کیا کہ میں آپؐ پر قربان جاؤں، تکیہ لگا کر کھانا نوش فرمایا کیجیے تاکہ تکلیف نہ ہو۔ حضورؐ نے ارشاد کیا میں اس طرح کھاؤں گا جس طرح بندہ کھاتا ہے اور ویسا ہی بیٹھوں گا جیسا کہ بندہ بیٹھتا ہے۔ حضورؐ کے اصحاب میں سے یا اور کوئی آدمی حضورؐ کو پکارتا تو حضورؐ جواب میں لبیک فرماتے۔ جس قسم کی بات کا حضورؐ کے اصحاب میں پہلے سے ذکر ہوتا تو حضورؐ بھی اسی کے متعلق باتیں کرتے۔ اگر وہ اشعار خوانی کرتے ہوئے ہوتے تو حضورؐ بھی شعر پڑھتے۔ اگر اصحاب ہنستے تو حضورؐ بھی تبسم فرماتے اور سوائے حرام اور ناجائز امور کے اور

کسی بات میں اصحابؓ کو زُجرو توبیخ نہ فرماتے تھے۔ فقیروں میں بیٹھتے، مساکین کو اپنے ساتھ کھانا کھلاتے، جو لوگ اخلاق میں افضل ہوتے، ان کا احترام فرماتے تھے، جو حضورؐ کے سامنے عذر کرتا، اس عذر کو قبول کر لیتے۔ خوش طبعی فرماتے مگر جھوٹ کو نہ آنے دیتے تھے، مباح کھیل کو دیکھتے اور منع نہ فرماتے۔ حضورؐ بچوں کے ساتھ دوڑتے کہ دیکھیں کون آگے نکلے۔ لوگ حضور کے سامنے بلند آواز سے بولتے تھے جس سے حضورؐ کو اذیت ہوتی تھی مگر حضورؐ صبر فرماتے۔ کسی کو مفلسی وبیماری کے سبب حقیر نہ جانتے تھے۔ کسی بادشاہ سے اس کی دنیاوی شوکت کے سبب خوف نہ کرتے تھے۔

حضورؐ نے کبھی کسی عورت یا نوکر کو لعنت نہیں کی۔ اگر حضورؐ سے کہا جاتا کہ کسی کے لیے بددعا کیجیے تو حضورؐ اس کو دعا دیتے۔ سوائے جہاد کے حضور نے کسی پر وار نہیں کیا۔ اگر حضورؐ کے واسطے بچھونا بچھا دیا جاتا تو حضورؐ اس پر لیٹ رہتے اور اگر بچھونا نہ بچھایا جاتا تو حضور زمین پر لیٹ جاتے۔ جب کوئی حضورؐ سے ملتا سلام میں سبقت فرماتے اور جب تک وہ چلا نہ جاتا وہاں کھڑے رہتے۔ اگر کوئی حضورؐ کا ہاتھ پکڑ لیتا تو حضورؐ چھڑانے کی کوشش نہ کرتے۔ یہاں تک کہ وہ خود ہی چھوڑ دیتا۔ حضورؐ کے پاس کوئی آتا اور حضورؐ نماز میں مصروف ہوتے تو نماز کو مختصر کر دیتے اور پوچھتے کہ تم کو مجھ سے کچھ کام ہو تو کہو۔ کسی مجمع میں تشریف لے جاتے تو جہاں جگہ ملتی وہیں بیٹھ جاتے کسی کو اٹھنے کی تکلیف نہ دیتے۔ مجمع میں اس طرح پھیل کر نہ بیٹھتے ہاں گھر میں کبھی کبھی پاؤں پھیلا کر بیٹھتے تھے۔ جو لوگ حضورؐ کے پاس آتے تھے ان کی خاطر اور تعظیم فرماتے۔ قرابت داروں کے لیے اپنی چادر بچھا دیتے تھے۔ جس تکیے کے سہارے حضورؐ تشریف رکھتے تھے آنے والے کو وہ تکیہ عنایت فرماتے کہ اس کے سہارے بیٹھو۔ اگر وہ عذر کرتا تو قسم دے کر تکیے کے سہارے آرام سے بٹھاتے۔ ہر شخص سے ایسا برتاوا کرتے کہ وہ یہ سمجھتا کہ مجھ سے زیادہ اور کسی پر مہربانی نہیں ہے۔

قصہ مختصر یہ حضورؐ کے حسنِ اخلاق کا مجمل سا بیان ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مسلمان خاص کر صوفیائے کرام جو حضورؐ کی پیروی و تقلید کو مقصود تصور کرتے ہیں ، آیا واقعی اس قسم کے اخلاق رکھتے ہیں یا کچھ فرق و تفاوت ہے۔ اب تو مشائخ کی صحبتیں متکبر امراء کے درباروں سے بڑھ کر پائی جاتی ہیں۔ جہاں غرباء اور کم حیثیت لوگوں کو کوئی نہیں پوچھتا اور جو معمولی بات چیت ایسی درشتی سے کرتے ہیں کہ سننے والا خواہ مخواہ مکدر ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اب فقراء میں اگلے وقت کے بزرگوں کی سی تاثیریں نہیں پائی جاتیں۔ نہ پہلا سا قال ہے نہ حال۔ ہر چیز میں آسمان و زمین کا فرق پڑ گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عنایت فرمائے کہ آقائے نامدار مرشدِ حقیقی حضرت رسول العرب والعجم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے اخلاق سے سبق حاصل کریں اور یورپ کی خود غرضانہ زندگی میں اسلامی صداقت کے اخلاق کا زندہ نمونہ بن کر نمودار ہوں تاکہ روحانیت کی پیاسی دنیا اسلامی چشمہ حیات سے سیراب ہونے کو آگے بڑھے۔

(سی پارہ دل از خواجہ حسن نظامی)

سوالات

۱۔ قیامت کے دن کسی شخص کے نامہ اعمال میں سب سے وزنی چیز کون سی ہو گی؟

۲۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایمان کے اعتبار سے ، کس شخص کو سب سے افضل قرار دیا ہے ؟

۳۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کو کیا نصیحت فرمائی ؟

۴۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم نے بد خلقی کی مذمت میں کیا ارشاد فرمایا؟

۵۔ اس سبق میں حضور صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کے اخلاق کے بارے میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے، اسے اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔

۶۔ خوش خلقی سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں حضرت علیؓ اور امام غزالیؒ نے خوش خلقی کی جو تعریف کی اسے بیان کریں۔

۷۔ کیا خوش خلقی پیدا کرنا ممکن ہے؟ اس بارے میں مضمون نگار نے کیا ترکیب بتائی ہے؟

۸۔ مندرجہ ذیل الفاظ کا تلفظ اعراب کی مدد سے واضح کیجیے:۔

فوقیت ۔ حسن خلق ۔ خلق حسن ۔ وصف ۔ مکارم الاخلاق ۔ عذر ۔ مباح ۔ عقل ۔ نحوست ۔ عیادت ۔ تصور ۔ اذیت ۔ زجر و توبیخ ۔ مختصر ۔ مجمل ۔ سبقت ۔ اتباع ۔ مکدر ۔ فقراء ۔ مرشد ۔

۹۔ مندرجہ ذیل میں سے واحد کے جمع اور جمع کے واحد تحریر کیجیے:۔

وصف ۔ خصائل ۔ روایت ۔ اعمال ۔ سوال ۔ تصور ۔ اشعار ۔ مساکین ۔ مشائخ ۔ تکلیف ۔ قصہ ۔ صوفیہ ۔ امراء ۔ غرباء ۔ سبق ۔ حال ۔ امور ۔ دستور ۔ قسم ۔ نصیحت ۔

۱۰۔ مندرجہ ذیل الفاظ کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کیجیے کہ ان کی تذکیر و تانیث کا فرق واضح ہو جائے۔

اخلاق ۔ روایت ۔ برف ۔ دوزخ ۔ ہیبت ۔ میزان ۔ چبوترہ ۔ صداقت ۔

۱۱۔ نیچے کالم نمبر I میں کچھ الفاظ دیے گئے ہیں۔ کالم نمبر II میں ان کے متضاد بے ترتیبی سے لکھے گئے ہیں۔ جوابی کالم میں کالم نمبر I کے الفاظ کے صحیح متضاد تلاش کر کے تحریر کیجیے۔۔

نمبر شمار	کالم نمبر I	کالم نمبر II	جوابی کالم
۱۔	سوال	کاذب	
۲۔	دوزخ	نرمی	
۳۔	غرباء	قبح	
۴۔	حرام	مفصل	
۵۔	درشتی	متواضع	
۶۔	مُجمل	بد خُلق	
۷۔	حسن	حلال	
۸۔	خوش خلق	جنت	
۹۔	مُتکبّر	امراء	
۱۰۔	صادِق	جواب	

۱۲۔ کالم I میں کچھ الفاظ درج ہیں اور کالم II میں قواعد کی کچھ اصطلاحات ۔ جوابی کالم میں ہر لفظ کے سامنے قواعد کی صحیح اصطلاح چن کر لکھیے۔

نمبر شمار	کالم نمبر I	کالم نمبر II	جوابی کالم
۱۔	طبرانیؒ	فعلِ ماضی استمراری	
۲۔	ابو ہریرہؓ	مرکبِ عطفی	
۳۔	محبوب	مرکبِ توصیفی	
۴۔	فرق وتفاوت	مرکبِ اضافی	
۵۔	میزان	فعلِ ماضی بعید	
۶۔	محفل	کنیت	
۷۔	میزانِ عمل	اسمِ آلہ	
۸۔	نیک اعمال	اسمِ ظرف مکاں	
۹۔	جانتے تھے	اسمِ مفعول	
۱۰۔	لے گئے تھے	صفتِ نسبتی	

~ ~ ~ ~ ~ ~ ~ ~ ~ ~ ~

چلتے ہو تو چین کو چلیے

اپریل کے مہینے کی چوبیسویں تھی اور اتوار کا روز کہ ہم علی الصبح دیوار چین کی زیارت کو روانہ ہوئے۔ یہ پیکنگ سے کوئی پچیس تیس میل کی دوری پر ہے اور چین کا لاکھوں مربع میل علاقہ اس کے شمال میں پھیلا ہے۔ اب سے بائیس تئیس سو برس پہلے جب یہ بنی تھی تو اس کا مقصد شمال سے تاتاریوں کے حملے کو روکنا تھا۔ تحقیق کہتی ہے کہ جہاں تہاں دیواریں تو مختلف حکمرانوں نے پہلے ہی کھڑی کر رکھی تھیں۔ ہاں شہنشاہ اول چن شہ ہوانگ تی نے ۲۱۴ ق م میں ان کو مربوط کیا۔ ان پر برج بنائے اور دھوئیں کے سگنل دینے کا طریقہ رائج کیا جو اس کے پایہ تخت سیان سے نظر آ سکیں، چین والے اپنی زبان میں اس کو دس ہزار میل لمبی دیوار کہتے ہیں، لیکن فی الحقیقت یہ ڈیڑھ ہزار میل کے لگ بھگ ہے کہیں یہ پندرہ فٹ اونچی ہے کہیں پچاس فٹ۔ کچھ حصہ بڑی بڑی اینٹوں سے بنا ہے کچھ پتھروں سے۔ دیوار کے زیادہ تر حصے کے ساتھ ایک بیرونی خندق بھی کھدی دکھائی دے گی۔ یہ ڈیڑھ ہزار میل کا تسلسل بھی ٹوٹ گیا ہے کہیں سے ریل دراتی گزرتی گئی ہے کہیں سڑک بن گئی ہے۔ کہیں امتداد زمانہ نے شکست وریخت کا عمل کیا ہے لیکن جہاں سے ہم نے اسے دیکھا اور اس پر چڑھے وہاں سڑک اسے کاٹ کر نہیں بلکہ اس کے نیچے سے گزرتی ہے۔ سیڑھیاں چڑھ کے آپ ایک برج پر پہنچتے ہیں جس پر چھت بھی ہے وہاں سے چڑھائی شروع ہوتی ہے اور فرش اینٹوں کا ہے۔ یہ اینٹوں کا فرش بعد کا معلوم ہوتا ہے کیونکہ چودھویں اور سولھویں صدی میں بھی اس کی مرمت ہو چکی ہے۔ بایں ہمہ نیچے کے آثار ضرور دو ہزار برس سے زیادہ پرانے ہوں گے۔

یہاں سیر کو آنے والوں کا ہمیشہ ہجوم رہتا ہے اور اتوار کو بالخصوص زیادہ تر لوگ ریل سے آتے ہیں اور ریل کے سٹیشن سے جو غالباً میل بھر دور ہے، پیدل۔

اس کے بعد میلوں تک چڑھتے چلے جاتے ہیں۔ آخری دو برجوں کے درمیان چڑھائی اتنی سیدھی ہے کہ ستر پچھتر درجے کا زاویہ بنتا ہوگا۔ اترنے میں گرنے کا اندیشہ زیادہ تھا۔ جوتا پتھروں سے رپٹ رپٹ جاتا تھا اس لیے ہم نے نعلین کو در بغلین کیا یعنی اپنے جوتے اتار کر ہاتھ میں لے لیے۔ جس نے دیکھا، تماشا سمجھا اور بچوں نے تو تالیاں بھی بجائیں۔

نیچے اس کے چھوٹا سا چائے خانہ ہے۔ وہاں چائے پی گئی اور پھر دیوارِ عظیم کے سائے میں تصویر کھنچوائی گئی۔

مسافر کو پرانی تہذیبوں اور گزرے زمانوں کے آثار ہر جگہ ہر ملک میں نظر آتے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں کہ دل کو فوراً گداز کرتے ہیں۔ ہم پر جو اثر شیراز میں مزارِ سعدیؒ کی زیارت پر ہوا ویسی کیفیت تو پھر یا اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی لیکن دیوارِ عظیم نے کہ اس کا احوال دنیا کے سات، اعجوبوں کے ضمن میں ہم نے بہت صغر سنی میں پڑھا تھا، ایک عجیب اثر جی پر چھوڑا۔ یا پھر دل گداختگی کی یہ کیفیت کینٹن میں رسولؐ اللہ کے صحابی ابی وقاصؓ کے مقبرے اور نواحی قبرستان کے گل بوٹوں کو دیکھ کر طاری ہوئی۔

تو صاحبو! اب واپسی، لیکن راستے میں منگ بادشاہوں کے زیرِ زمین مقابر بھی دیکھتے چلو۔ یہ مقبرے کہ زمین کی سطح سے چالیس پچاس گز نیچے ہوں گے، غالباً اس لیے زیرِ زمین بنائے گئے کہ بعد کے آنے والوں کی تاخت و تاراج سے محفوظ رہیں۔ منگ وہ چینی خاندان تھا جس نے چنگیز خان کے وارثوں سے سلطنت چھینی اور عہد اس کا ۱۳۶۸ء سے ۱۶۴۴ء تک ہے۔ یوں کہیے کہ مقبروں والے یہ بادشاہ اکبر اعظم کے ہم زمانہ تھے۔ صدیوں یہ مقبرے دنیا کی نظروں سے پنہاں رہے۔ یہ غالباً پچھلی صدی کی بات ہے کہ تجسّس کرنے والوں کو ایک لوح ملی جس میں ان کے راستے کی سمت مرموز تھی۔ برسوں کی کھدائی کے بعد ایک دروازہ تیغا کیا ملا۔ اندر اترے تو بند ایوانوں میں مقبروں کے علاوہ بڑے بڑے چینی کے ظروف میں اُنواع

واقسام کی نعمتیں موجود پائیں۔ سونے، چاندی اور جواہر کے ڈھیر لگے تھے۔ چوبی تابوت تو سیلن اور موسمی اثرات سے خستہ و خراب ہو کر مٹی ہو چلے تھے اور بعد میں دوبارہ انھی نقشوں پر بنوائے گئے لیکن باقی چیزیں سلامت تھیں۔ سیڑھیاں اترنے کے بعد دروازوں کو کھولنا آسان نہ تھا۔ جن لوگوں نے دروازے بند کیے انھوں نے اندر کی بلیاں گرا کر ایسا انتظام کیا تھا کہ کوئی باہر سے نہ کھول سکے، لیکن دانشمندوں نے یہ گرہ بھی کھول ہی لی۔ عجیب آسیبی ماحول ہے۔ اوپر ستّر اسّی فٹ اونچی چھت ہے۔ نیچے غلام گردشیں اور طاقچے۔ ایک بڑے ظرف میں قربان گاہ کی بتیوں کے لیے تیل بھرا تھا، اب بھی موجود ہے لیکن بہت گاڑھا ہو گیا ہے۔ اتنے میں ہمارے چینی دوستوں نے کہا ایک چیز اور رہ گئی ہے۔ ادھر آؤ۔

ایک بہت بوسیدہ چار پانچ سو برس پہلے کا چوبی دروازہ جھک کر پار کیا تو اندر پہنچ کر سب آنکھیں جھپکنے لگے۔ تو کیا منگ زمانے میں ہماری طرح کے صوفے کرسیاں اور میز بھی ہوتے تھے میزبان مسکرائے۔ اس دَور کے اس بغلی کمرے کو مہمانوں کی نشست کے لیے درست کر لیا گیا تھا فقط دروازہ عہدِ قدیم کا باقی رکھا تھا۔ سب بیٹھے، چائے آئی اور سب اپنی حیرانی پر ہنسے۔

معلوم ہوا کہ ابھی ایک دو مقبرے کھولے گئے ہیں نشاندہی سترہ اٹھارہ کی ہو چکی ہے۔ جو ان نواحات میں میلوں تک نصف دائرے کی شکل میں پھیلے ہوئے ہیں۔

باہر آئے تو میزبانوں نے سب کو ٹھنڈا پلوایا۔ ٹھنڈا سے یہاں مطلب اورنج ہی لیجیے۔ ستّر کروڑ کا یہ ملک دَورِ جدید کے ان تمام لذائذ کو کاکولا، پیپسی کولا، سیون اپ، کناڈا ڈرائی اور فانٹا کو جانتا بھی نہیں۔ ان کے بغیر ہی ترقی کر رہا ہے۔ تعجّب ہوتا ہے کہ کیسے کر رہا ہے۔ جب یہ بیرونی نعمتیں اس کے دروازے، ہانگ کانگ اور پڑوسی جاپان تک میں موجود ہیں تو اپنے ہی سنگترے نچوڑنے پر اتنا اِصرار کیوں؟

کھانے کی باتیں پھر کبھی سہی اب ذرا پینے کی بات سن لیجیے۔ عام آدمی کا مشروب گرم پانی ہے۔ آج سے نہیں صدیوں سے ۔ یا تو گھر میں پتیلا چڑھا رہے گا ورنہ بازار میں دیگ ابل رہی ہے وہاں سے دو پیسے میں بالٹی بھروا لائیے۔ طالب علم سکول جاتا ہے یا باہر تفریح کو تو اس کے بستے کے ساتھ ایک مگ لٹکا رہتا ہے۔ اس سے زیادہ عیاشی مطلوب ہے تو چند پتیاں چائے کی ڈال لیجیے اور چسکی لیتے رہیے۔ جہاں گئے اسی مشروب سے خاطر ہوئی۔

وزیر خارجہ چن ژی نے بھی اسی سے تواضع کی اور فیکٹری مزدوروں نے بھی۔ بازار میں یہ چیز ایک پیسے کی ہے۔ گھر میں تو مفت ہی سمجھیے۔ اسی ایک مد میں دیکھا جائے تو ہم جو شکر اور دودھ کا جوشاندہ پیتے ہیں، اس کے مقابلے میں چینی لوگ سال بھر میں کروڑوں روپے بچاتے ہوں گے۔ ہم کالی چائے کے رسیا لوگوں کے لیے البتہ ہوٹلوں میں انتظام ہے۔ آپ بلیک ٹی مع دودھ اور شکر مانگیے چینی میں اسے "خونچا" کہتے ہیں۔ اس ایک لفظ میں ملباری ہوٹل کی چائے کا مزہ مٹھاس اور گاڑھا پن سبھی آجاتے ہیں۔

ریل میں ہر نشست کے ساتھ چائے کے گلاس رکھنے کی جگہ ہے۔ اکثر سینماؤں اور تھیٹروں میں کرسی کے دہنے ہتھے کے اندر گلاس رکھنے کے لیے سوراخ بنا ہے، کام کرتے جائیے اور ایک ایک گھونٹ سُسکتے رہیے۔ تھوڑی دیر میں کوئی آئے گا اور اس میں مزید گرم پانی ڈال جائے گا۔ معلوم ہوا کہ اس سے معدے کا نظام درست رہتا ہے۔ جراثیم کا دفعیہ بھی ہو جاتا ہے۔ کم خرچ بلکہ بے خرچ بالا نشین۔ ہم نے بھی کچھ دن گرم پانی پیا پھر چھوڑ دیا۔

کھانے سے پہلے اور بعد۔ بلکہ آپ یوں بھی باہر سے آئیں تو آپ کو گرم پانی میں بھیگا ایک تولیہ یا رومال پیش کیا جائے گا کہ اس سے منہ ہاتھ پونچھیے اور تروتازہ ہو جائیے۔ یہ رواج ہم لوگوں کو بہت اچھا لگا۔ واقعی خستگی اور ماندگی اس سے دور ہو جاتی تھی۔ ہمارے پیر سائیں حسام الدین راشدی صاحب نے تو کچھ تولیے

وہاں سے خریدے بھی کہ وطنِ عزیز جا کر میں بھی یہی کیا کروں گا۔ لیکن وطنِ عزیز آکر تو اور بھی بہت کچھ کرنے کا عزم ہمارے سارے ساتھیوں نے کیا تھا۔ کسی سے ایسے آثار ابھی ظاہر نہیں ہوئے۔ شاید کانِ نمک میں آکر پھر سب نمک ہو گئے۔ پیر صاحب تولیے استعمال کرنے کی حد تک ثابت قدم رہے ہوں تو شاید رہے ہوں۔

صحت کا خیال چینیوں کو اس حد تک رہتا ہے کہ وحشت ہوتی ہے۔ ہم ایسے آرام طلبوں کا تو وہاں جینا حرام ہو جائے۔ ورزش ہر کوئی ہر روز کرتا ہے۔ ہمارے ایک دوست ڈھاکے کے رہنے والے سڑکوں پر اتنا تھوکتے ہیں کہ ڈھاکہ میونسپلٹی کو ایک الگ داروغہ صفائی رکھنا پڑا ہے، جہاں یہ جاتے ہیں وہ سی آئی ڈی کی طرح ان کے پیچھے پیچھے رہتا ہے ان کو وہاں بڑی تکلیف ہوئی کہ وہاں یہ رواج نہیں۔ نہ اجازت ہے۔ پانی ابال کر پیتے ہیں۔ موبل آئل وہاں گاڑیوں میں ڈالا جاتا ہے، اصلی یا بناسپتی گھی کہہ کر فروخت نہیں کیا جاتا۔ بھٹے کی اینٹیں بھی مکان بنانے میں استعمال ہوتی ہیں، ہلدی اور مرچ میں ملا کر ان سے تعمیرِ معدہ کا کام نہیں لیا جاتا۔ وہاں دودھ بھی گائیوں بھینسوں کا ہوتا ہے، تالابوں یا کمیٹی کے نلکوں سے حاصل نہیں کیا جاتا۔ پھر محنت ہر کوئی کرتا ہے۔ لہٰذا سارے چین میں ہم ایسے کسی شخص کی تلاش میں رہے جو بڑی نہ سہی چھوٹی موٹی توند ہی کا مالک ہو۔ "سوچو" کے ہوٹل میں ہم نے کچھ چینی توندوں والے دیکھے تو خوش ہوئے اور وطنِ عزیز کی یاد آئی۔ لیکن معلوم ہوا وہ یہاں کے نہیں۔ سنگاپور سے بغرض تفریح آئے ہوئے ہیں۔ لاغر آدمی بھی چین میں کوئی نظر نہ آیا۔ واپسی پر ہمارے ایک امریکن دوست نے اس کی یہ توجیہ کی کہ جب کوئی غیر ملکی آتا ہے تو ڈھنڈورا پٹ جاتا ہے کہ لاغر لوگ اپنے اپنے گھروں میں بند ہو جائیں اور اندر سے کنڈیاں چڑھا لیں تاکہ غیر ملکی لوگ متاثر ہو جائیں۔

ہم نے کہا وہاں تو کوئی ایسا وقت نہیں آتا کہ غیر ملکیوں کے غول کے غول نہ گھومتے پھریں اور کئی بار تو وہ بلا اطلاع بھی دیہات، کھیتوں، کارخانوں اور گلیوں

میں جا نکلتے ہیں۔ چینیوں کو بہت تکلیف ہوتی ہوگی۔ وہ صاحب بولے۔ "خیر آپ یقین نہیں کرتے نہ سہی۔ میں نے ایک کتاب میں پڑھا ہے۔"

دوہان میں ہمارے ہسپتال جانے کی تقریب یہ تھی کہ وہاں کچھ فلو کا اثر معلوم ہوا۔ کم از کم زکام ضرور تھا۔ دیکھا کہ ڈاکٹر پر ڈاکٹر چلا آ رہا ہے۔ پھر اطلاع ملی کہ ہسپتال کا سربراہ ہم سے ملاقات کا متمنی ہے۔ آخر ہم نے کہا بابا ہم خود چلے جاتے ہیں ہسپتال۔ وہاں گئے تو انھوں نے ہمارے اعضائے رئیسہ و غیر رئیسہ، آنکھ، کان، ٹانگ وغیرہ سب دیکھ ڈالے۔ دراصل اسی باعث ہم وہاں جانے سے کتراتے تھے اور خود کو قتلِ عاشقاں سے منع کرتے تھے کہ باقی سب لوگ وطن سدھاریں گے اور ہم یہاں داخلِ دفتر ہو جائیں گے کیونکہ یہ ہم جانتے ہیں کہ فارماکوپیا میں شاید ہی کوئی مرض ہو گا، جو ہم میں نہ ہو گا۔ خیر ہسپتال تو ہم داخل ہو کر نہ دیے، دوا ضرور لے آئے اور ابھی استعمال بھی نہ کی تھی کہ تندرست ہو گئے۔

یہ ہسپتال ساڑھے سات سو بیڈ کا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے جرمن زبان میں سات سال تک ڈاکٹری پڑھی تھی اور بیس سال سے پریکٹس کر رہے تھے۔ ہمارے جی میں آئی کہ ان سے پوچھیں کہ آپ کینیڈا کیوں نہیں چلے جاتے۔ وہاں ڈاکٹروں کو زیادہ تنخواہ ملتی ہے۔ یہ سوال پوچھا تو نہیں لیکن جی اس لیے چاہا کہ ہم خود کتنے ڈاکٹروں کو جانتے ہیں جو تنخواہ اور آمدنی کے لیے وطنِ عزیز چھوڑ کر کینیڈا، امریکہ اور برطانیہ میں پریکٹس کر رہے ہیں اور ہمارے ہاں آدھی موتیں بر وقت ڈاکٹر میسر نہ آنے سے ہوتی ہیں۔ ان سے پوچھیے تو کہتے ہیں کہ ہاں وطن کی خدمت کرنے میں اعتراض نہیں لیکن یہاں ہماری قدر نہیں۔ ہمیں سر آنکھوں پر نہیں بٹھایا جاتا۔ اس پر ہمیں اس چینی ادیب کی یہ بات یاد آئی کہ تنخواہ اور آمدنی کے علاوہ بھی کچھ قدریں ہیں، جن کے لیے آدمی کام کرتا ہے اور جاں سوزی برتتا ہے۔ ایسے ڈاکٹروں، انجینئروں اور دوسرے ماہروں کی تعداد سیکڑوں بلکہ ہزاروں تک پہنچتی ہے جو امریکہ اور یورپ کے ملکوں سے آرام اور تموّل کی زندگی چھوڑ کر واپس آئے

اور اب معمولی کپڑوں میں معمولی تنخواہ لے کر معمولی مکانوں میں رہتے ہیں لیکن خوش ہیں۔ یہاں [1] ڈاکٹروں کے لیے چند سال سرکاری خدمت لازم قرار دی گئی تھی تو کہرام مچ گیا تھا اور دیہات میں جانے کے نام سے تو ہر کوئی کان پر ہاتھ رکھتا تھا۔ وہاں دیہات کو بھی ملک کا حصہ سمجھا جاتا ہے اور دیہاتی انسانوں میں شمار ہوتے ہیں جن کا پانی، بجلی، تعلیم، صحت، تفریح، تہذیب سب پر حق ہے۔ انٹلکچول کہلانے والے طبقے کے لوگوں، ادیبوں، پروفیسروں، ڈاکٹروں وغیرہ کو سال میں دو مہینے دیہات میں جا کر دیہاتیوں کے ساتھ انھی کے مکانوں میں رہنا پڑتا ہے اور انھی کے ساتھ کھیتوں کھلیانوں اور کارخانوں میں کام کرنا پڑتا ہے۔ اسی کا اثر ہے کہ یہ لوگ خود کو کوئی علیحدہ آسمانی مخلوق نہیں گردانتے اور اس قاعدے سے صدر ماؤزے تنگ تک مستثنیٰ نہیں ہیں۔

صحت میں علاج کی سہولتیں اور ورزش و محنت کے علاوہ کچھ دخل خوراک کا بھی ہے۔ چینی روغن جوش نہیں کھاتے، سادہ خوراک کھاتے ہیں۔ یہ رواج ہمارے ہاں کا ہے کہ جب تک کسی چیز کے تمام اجزاء کو جن میں وٹامن یا دوسری غذائیتیں ہونے کا خطرہ ہو، پوری طرح ضائع نہ کر دیا جائے مزا نہیں آتا۔ خیر اس مسئلے پر ہم زیادہ زور نہیں دینا چاہتے کیونکہ بہت سے ڈاکٹر، حکیم ہمارے حلقہ احباب میں ہیں ان کی خوشحالی پر آنچ آنے سے ہم خوش نہ ہوں گے تاہم گھروں کی اور کوچہ و بازار کی صفائی ہمیں بھی پسند ہے۔ وہاں کسی کو اپنے گھر یا گلی میں جھاڑو دینے میں عذر نہیں۔ ریل گاڑی تک کی دُھلائی ہر روز ہوتی ہے۔ یہ حال تو مادی اور ظاہری صفائی کا ہے۔ ان کی اخلاقی صفائی اور پاکیزگی کا کچھ ذکر ہم گزشتہ باب میں کر چکے ہیں جو مغرب کی تمام آلائشوں اور جنس کے مظاہر سے دور رہنے سے پیدا ہوئی ہے معلوم ہوا ہے کہ سب خرابیوں کی جڑ زر کی فراوانی یا اسباب تموّل کی ہوس ہے اور یہ ہوس تب پیدا ہوتی ہے جب اپنے ہمسائے کو دیکھتے ہیں کہ اس کے ہاں کار اور

---

[1] ۔ یعنی پاکستان میں

ریفریجریٹر آگئے ہیں، میرے پاس کیوں نہ ہوں خواہ مجھے اس کے لیے رشوت یا بے ایمانی کیوں نہ کرنی پڑے۔ چین میں شاید ہی کسی گھر کو تالا لگتا ہو۔ چوری ہونا ایک طرف وہاں کسی چیز کا گم ہو کر گم رہنا محال ہے۔

(چلتے ہو تو چین کو چلیے از ابن انشاء)

سوالات

۱۔ مندرجہ ذیل الفاظ کے معانی لکھیے :۔

امتدادِ زمانہ ۔ نعلین در بغلین ۔ صغر سنی ۔ مرموز ۔ اسبابِ تموّل ۔ نواحات ۔ تیغا کرنا۔ دل گداختگی ۔ لاغر ۔ اعضائے رئیسہ ۔ مشروب

۲۔ دیوار چین کی تعمیر کا مقصد کیا تھا؟ (صحیح جواب کے حرف کے گرد دائرہ لگائیے)

(الف) بے روزگار لوگوں کو روزگار مہیا کرنا۔

(ب) چین کے فن تعمیر کو ترقی دینا۔

(ج) تاتاری حملوں کی روک تھام کرنا۔

(د) شہنشاہ اول چن شہ ہوانگ کے نام کو زندہ رکھنا۔

۳۔ چین میں عام آدمی کا مشروب کیا ہے؟ (صحیح جواب کے حرف کے گرد دائرہ لگائیے)

(الف) کوکاکولا

(ب) بلیک ٹی

(ج) سنگترے کا رس

(د) گرم پانی

۴۔ چینی اپنی صحت کا کس طرح خیال رکھتے ہیں؟ اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔

اور اب معمولی کپڑوں میں معمولی تنخواہ لے کر معمولی مکانوں میں رہتے ہیں لیکن خوش ہیں۔ یہاں[1] ڈاکٹروں کے لیے چند سال سرکاری خدمت لازم قرار دی گئی تھی تو کہرام مچ گیا تھا اور دیہات میں جانے کے نام سے تو ہر کوئی کان پر ہاتھ رکھتا تھا۔ وہاں دیہات کو بھی ملک کا حصہ سمجھا جاتا ہے اور دیہاتی انسانوں میں شمار ہوتے ہیں جن کا پانی، بجلی، تعلیم، صحت، تفریح، تہذیب سب پر حق ہے۔ انٹلکچول کہلانے والے طبقے کے لوگوں، ادیبوں، پروفیسروں، ڈاکٹروں وغیرہ کو سال میں دو مہینے دیہات میں جا کر دیہاتیوں کے ساتھ انھی کے مکانوں میں رہنا پڑتا ہے اور انھی کے ساتھ کھیتوں کھلیانوں اور کارخانوں میں کام کرنا پڑتا ہے۔ اسی کا اثر ہے کہ یہ لوگ خود کو کوئی علیٰحدہ آسمانی مخلوق نہیں گردانتے اور اس قاعدے سے صدر ماؤزے تنگ تک مستثنیٰ نہیں ہیں۔

صحت میں علاج کی سہولتیں اور ورزش و محنت کے علاوہ کچھ دخل خوراک کا بھی ہے۔ چینی روغن جوش نہیں کھاتے، سادہ خوراک کھاتے ہیں۔ یہ رواج ہمارے ہاں کا ہے کہ جب تک کسی چیز کے تمام اجزاء کو جن میں وٹامن یا دوسری غذائیتیں ہونے کا خطرہ ہو، پوری طرح ضائع نہ کر دیا جائے مزا نہیں آتا۔ خیر اس مسئلے پر ہم زیادہ زور نہیں دینا چاہتے کیونکہ بہت سے ڈاکٹر، حکیم ہمارے حلقہ احباب میں ہیں ان کی خوشحالی پر آنچ آنے سے ہم خوش نہ ہوں گے تاہم گھروں کی اور کوچہ و بازار کی صفائی ہمیں بھی پسند ہے۔ وہاں کسی کو اپنے گھر یا گلی میں جھاڑو دینے میں عذر نہیں۔ ریل گاڑی تک کی دُھلائی ہر روز ہوتی ہے۔ یہ حال تو مادی اور ظاہری صفائی کا ہے۔ ان کی اخلاقی صفائی اور پاکیزگی کا کچھ ذکر ہم گزشتہ باب میں کر چکے ہیں جو مغرب کی تمام آلائشوں اور جنس کے مظاہر سے دور رہنے سے پیدا ہوئی ہے معلوم ہوا ہے کہ سب خرابیوں کی جڑ زر کی فراوانی یا اسبابِ تموّل کی ہوس ہے اور یہ ہوس تب پیدا ہوتی ہے جب اپنے ہمسائے کو دیکھتے ہیں کہ اس کے ہاں کار اور

۱۔ یعنی پاکستان میں

ریفریجریٹر آگئے ہیں، میرے پاس کیوں نہ ہوں خواہ مجھے اس کے لیے رشوت یا بے ایمانی کیوں نہ کرنی پڑے۔ چین میں شاید ہی کسی گھر کو تالا لگتا ہو۔ چوری ہونا ایک طرف وہاں کسی چیز کا گم ہو کر گم رہنا محال ہے۔

(چلتے ہو تو چین کو چلیے از ابنِ انشاء)

سوالات

۱۔ مندرجہ ذیل الفاظ کے معانی لکھیے:۔

امتدادِ زمانہ۔ مُعلّین در مُعلّین۔ صغر سنی۔ مرموز۔ اسبابِ تموّل۔ نواحات۔ تیفا کرنا۔ دل گداختگی۔ لاغر۔ اعضائے رئیسہ۔ مُشروب

۲۔ دیوارِ چین کی تعمیر کا مقصد کیا تھا؟ (صحیح جواب کے حرف کے گرد دائرہ لگائیے)

(الف) بے روزگار لوگوں کو روزگار مہیا کرنا۔

(ب) چین کے فنِ تعمیر کو ترقی دینا۔

(ج) تاتاری حملوں کی روک تھام کرنا۔

(د) شہنشاہ اول چن شہ ہوانگ کے نام کو زندہ رکھنا۔

۳۔ چین میں عام آدمی کا مشروب کیا ہے؟ (صحیح جواب کے حرف کے گرد دائرہ لگائیے)

(الف) کوکاکولا

(ب) بلیک ٹی

(ج) سنگترے کا رس

(د) گرم پانی

۴۔ چینی اپنی صحت کا کس طرح خیال رکھتے ہیں؟ اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔

۵۔ پاکستانی وفد کو چین میں تلاش کے باوجود کوئی کمزور آدمی کیوں نہ مل سکا؟

۶۔ مصنف کی رائے میں پاکستانی ڈاکٹر اپنے وطن میں، طبّی خدمات کیوں انجام نہیں دیتے؟

۷۔ اعراب کی مدد سے مندرجہ ذیل الفاظ کا تلفُّظ واضح کیجیے۔

امتداد زمانہ ۔ علی الصبح۔ شکست و ریخت۔ مغربی ۔ تجسّس ۔ تمول ۔ مقصد ۔ نعلین ۔ اعجوبہ۔ فقط ۔ دفعیہ ۔ ثابت ۔

۸۔ مندرجہ ذیل کے واحد لکھیے۔

ظروف ۔ لذائذ ۔ اعضا۔ نواحات ۔ مقابر ۔ جراثیم ۔ آثار ۔ فعلین ۔ اجزا۔ احباب۔ جواہر۔

۹۔ کالم I میں چند الفاظ درج ہیں اور کالم II میں قواعد کی اصطلاحات۔ ہر لفظ کے سامنے جوابی کالم میں درست جواب کا حرفی نمبر لکھیے۔

I		II	جوابی کالم
۱۔ کا	(الف)	اسمِ ظرف مکاں	
۲۔ صبح	(ب)	کنیت	
۳۔ دیوار چین	(ج)	مصدر	
۴۔ روکنا	(د)	اسمِ ظرف زماں	
۵۔ ابی وقاص ؓ	(ہ)	مرکبِ اضافی	
۶۔ قبرستان	(و)	فعلِ امر	
۷۔ تو	(ز)	فعلِ مستقبل مجہول	
۸۔ اوپر	(ح)	حرفِ جزا	
۹۔ آؤ	(ط)	حرفِ اضافت	
۱۰۔ کیا جائے گا	(ی)	حرفِ جار	

- - - -

شعراء کے ادبی لطیفے

ایک دن لکھنؤ میں میر اور میرزا کے کلام پر دو شخصوں نے تکرار میں طول کھینچا۔ دونوں خواجہ باسط کے مرید تھے۔ انھی کے پاس گئے اور عرض کی کہ آپ فرمائیں۔ انھوں نے کہا: "دونوں صاحبِ کمال ہیں، مگر فرق اتنا ہے کہ میر صاحب کا کلام "آہ" ہے اور مرزا صاحب کا کلام "واہ" ہے۔ مثال میں میر صاحب کا شعر پڑھا۔"

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

پھر مرزا کا شعر پڑھا

سودا کے جو بالیں پہ ہوا شور قیامت
خدّامِ ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

ان میں ایک شخص جو مرزا کے طرف دار تھے، وہ مرزا کے پاس بھی آئے اور سارا ماجرا بیان کیا۔ مرزا بھی میر صاحب کا شعر سن کر مسکرائے اور کہا کہ شعر تو میر صاحب کا ہے مگر درد خواہی ان کی دوا معلوم ہوتی ہے۔

(۲)

ایک دن میر، انشاء اللہ خان جرات کی ملاقات کو آئے۔ دیکھا تو سر جھکائے بیٹھے کچھ سوچ رہے ہیں۔ انھوں نے پوچھا کہ کس فکر میں بیٹھے ہو؟ جرات نے کہا کہ ایک مصرع خیال میں آیا ہے، چاہتا ہوں کہ مطلع ہو جائے۔ انھوں نے

۵۔ پاکستانی وفد کو چین میں تلاش کے باوجود کوئی کمزور آدمی کیوں نہ مل سکا؟

۶۔ مصنف کی رائے میں پاکستانی ڈاکٹر اپنے وطن میں، طبّی خدمات کیوں انجام نہیں دیتے؟

۷۔ اعراب کی مدد سے مندرجہ ذیل الفاظ کا تلفُّظ واضح کیجیے۔

امتداد زمانہ ۔ علی الصبح۔ شکست و ریخت۔ مغز بنی ۔ تجسّس ۔ تمول ۔ مقصد ۔ نعلین ۔ اعجوبہ۔ فقط ۔ دفعیہ ۔ ثابت ۔

۸۔ مندرجہ ذیل کے واحد لکھیے۔

ظروف ۔ لذائذ ۔ اعضا۔ نواحات ۔ مقابر ۔ جراثیم۔ آثار ۔ **نعلین** ۔ اجزا۔ احباب۔ جواہر۔

۹۔ کالم I میں چند الفاظ درج ہیں اور کالم II میں قواعد کی اصطلاحات۔ ہر لفظ کے سامنے جوابی کالم میں درست جواب کا حرفی نمبر لکھیے۔

I		II	جوابی کالم
۱۔ کا	(الف)	اسمِ ظرف مکاں	
۲۔ صبح	(ب)	کنیت	
۳۔ دیوار چین	(ج)	مصدر	
۴۔ روکنا	(د)	اسمِ ظرف زماں	
۵۔ ابی وقاص ؓ	(ہ)	مرکبِ اضافی	
۶۔ قبرستان	(و)	فعلِ امر	
۷۔ تو	(ز)	فعلِ مستقبل مجہول	
۸۔ اوپر	(ح)	حرفِ جزا	
۹۔ آؤ	(ط)	حرفِ اضافت	
۱۰۔ کیا جائے گا	(ی)	حرفِ جار	

شعراء کے ادبی لطیفے

ایک دن لکھنؤ میں میر اور میرزا کے کلام پر دو شخصوں نے تکرار میں طول کھینچا۔ دونوں خواجہ باسط کے مرید تھے۔ انھی کے پاس گئے اور عرض کی کہ آپ فرمائیں۔ انھوں نے کہا: "دونوں صاحبِ کمال ہیں، مگر فرق اتنا ہے کہ میر صاحب کا کلام "آہ" ہے اور مرزا صاحب کا کلام "واہ" ہے۔ مثال میں میر صاحب کا شعر پڑھا۔"

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

پھر مرزا کا شعر پڑھا

سودا کے جو بالیں پہ ہوا شور قیامت
خدّامِ ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

ان میں ایک شخص جو مرزا کے طرف دار تھے، وہ مرزا کے پاس بھی آئے اور سارا ماجرا بیان کیا۔ مرزا بھی میر صاحب کا شعر سن کر مسکرائے اور کہا کہ شعر تو میر صاحب کا ہے مگر درد خواہی ان کی دوا معلوم ہوتی ہے۔

(۲)

ایک دن میر، انشاء اللہ خان جرات کی ملاقات کو آئے۔ دیکھا تو سر جھکائے بیٹھے کچھ سوچ رہے ہیں۔ انھوں نے پوچھا کہ کس فکر میں بیٹھے ہو؟ جرات نے کہا کہ ایک مصرع خیال میں آیا ہے، چاہتا ہوں کہ مطلع ہو جائے۔ انھوں نے

پوچھا کہ کیا ہے ؟ جرأت نے کہا کہ خوب مصرع ہے ، مگر جب تک دوسرا مصرع نہ ہو گا تب تک نہ سناؤں گا، نہیں تو تم مصرع لگا کر اسے بھی چھین لو گے۔ سید انشاء نے بہت اصرار کیا۔ آخر جرأت نے پڑھ دیا۔ ع :

اس زلف پہ پھبتی شبِ دیجور کی سوجھی

سید انشاء نے فوراً کہا کہ : ع

اندھے[1] کو اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی

جرأت ہنس پڑے اور اپنی لکڑی اٹھا کر مارنے کو دوڑے۔

(۲)

ایک دن راجا صاحب کے دربار میں انشاء نے غزل پڑھی جس کا قافیہ تھا "لالیاں اور جالیاں"۔ سب سخن فہموں نے بہت تعریف کی۔ راجا کی صحبت میں جگنو میاں ایک مسخرے تھے۔ ان کی زبان سے نکلا کہ نواب صاحب سب قافیے آپ نے باندھے مگر "تالیاں" رہ گئیں۔ انھوں نے ٹال دیا اور کچھ جواب نہ دیا۔ راجا صاحب نے خود فرمایا کہ نواب صاحب سنتے ہو ؟ جگنو میاں کیا کہتے ہیں ؟ انھوں نے کہا کہ مہاراج ! اس قافیے کو مبتذل سمجھ کر چھوڑ دیا تھا اور حضور فرمائیں تو اب بھی ہو سکتا ہے۔ مہاراج نے کہا کہ ہاں کچھ کہنا تو چاہیے۔ انھوں نے اسی وقت پڑھا :

جگنو میاں کی دُم جو چمکتی ہے رات کو
سب دیکھ دیکھ اس کو بجاتے ہیں تالیاں

تمام دربار چہک اٹھا اور میاں جگنو مدھم ہو کر رہ گئے۔

۱۔ جرأت نابینا تھے۔

(۴)

ایک دن انشاء نواب صاحب[1] کے ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے اور گرمی سے گھبرا کر دستار سر سے رکھ دی تھی۔ منڈا ہوا سر دیکھ کر نواب کی طبیعت میں چہل آئی۔ ہاتھ بڑھا کر پیچھے سے ایک دھول ماری۔ آپ نے جلدی سے ٹوپی سر پر رکھ لی اور کہا۔ سبحان اللہ! بچپن میں بزرگ سمجھایا کرتے تھے۔ وہ بات سچ ہے کہ ننگے سر کھانا کھاتے ہیں تو شیطان دھولیں مارا کرتا ہے۔

(۵)

ایک مشاعرے میں شیخ ناسخ ایسے وقت پہنچے کہ جلسہ ختم ہو چکا تھا، مگر خواجہ حیدر علی آتش اور چند شعراء ابھی موجود تھے۔ یہ جا کر بیٹھے۔ تعظیمِ رسمی اور مزاج پرسی کے بعد کہا کہ جناب خواجہ صاحب مشاعرہ ہو چکا؟ انھوں نے کہا کہ سب کو آپ کا اشتیاق رہا۔ شیخ امام بخش ناسخ نے یہ مطلع پڑھا:

جو خاص ہیں وہ شریکِ گروہِ عام نہیں
شمار دانہ تسبیح میں امام[2] نہیں

(۶)

مرزا کی "قاطع برہان" کے بہت شخصوں نے جواب لکھے ہیں اور زبان درازیاں کی ہیں۔ کسی نے کہا حضرت! آپ نے فلاں شخص کی کتاب کا جواب نہ

۱۔ لکھنؤ (سلطنت اودھ) کا ایک نواب جس کا نام سعادت علی خان تھا۔
۲۔ ناسخ کا اصل نام امام بخش تھا نام کی رعایت سے یہ لفظ کیا خوب استعمال ہوا ہے۔ تسبیح کے دانوں میں ایک بڑا دانہ ہوتا ہے جو شمار میں نہیں آتا، اسے امام کہتے ہیں۔

لکھا۔ فرمایا بھائی! اگر کوئی گدھا تمھارے لات مارے تو تم اس کا کیا جواب دو گے؟

(آبِ حیات از مولانا محمد حسین آزاد)

سوالات

۱۔ "واہ" اور "آہ" سے کیا مراد ہے۔ وضاحت سے لکھیے۔

۲۔ جرأت کے مصرع پر جو مصرع انشاء نے لگایا اس میں مزاح کا پہلو کیا ہے؟ نیز بتایئے کہ زلف اور شبِ دیجور میں کیا مناسبت ہے؟

۳۔ یہ شعر پڑھیے۔

جگنو میاں کی دم جو چمکتی ہے رات کو
سب دیکھ دیکھ اس کو بجاتے ہیں تالیاں

اس شعر میں "جگنو" کے استعمال میں کیا خوبی ہے۔ انشاء کے اس شعر سے ان کی طبیعت کا کون سا رخ ہمارے سامنے آتا ہے؟

۴۔ پانچویں لطیفے میں ناسخ نے مشاعرے میں شرکت نہ کرنے کی کیا وجہ بتائی؟ اور اسے مثال کے ذریعے کس طرح واضح کیا؟

۵۔ مندرجہ ذیل الفاظ و محاورات کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:۔
دور کی سوجھنا۔ مبتذل۔ شہرہ ہونا۔ فصاحت وبلاغت۔ چودہ طبق روشن ہونا۔ قناعت۔ آن بان۔

۶۔ اس سبق میں سے فعلِ حال، مستقبل، ماضیِ مطلق، ماضیِ قریب اور ماضیِ استمراری چن کر اپنی کاپی میں لکھیے۔

۷۔ مندرجہ ذیل اسموں سے اسمِ مکبّر بنایئے:۔
کاج۔ راہ۔ پگڑی۔ گھڑی۔ سوار۔ پاپ۔ بات۔

۸۔ اِعْراب لگایئے :۔

قاطع برہان ۔ مطلع ۔ مصرع۔ شب دیجور ۔ مبتذل ۔ مصرع ۔ خدام ۔ محبت ۔ اشتیاق ۔

۹۔ کالم نمبر ا میں چند الفاظ درج ہیں۔ کالم نمبر ۲ میں ان کے مترادف بے ترتیبی سے دیے گئے ہیں۔ جوابی کالم میں ہر لفظ کے سامنے اس کے صحیح مترادف کا حرفی نمبر درج کیجیے۔

کالم نمبرI	کالم نمبرII	جوابی کالم
۱۔ فعل	(الف) رند	
۲۔ عالم	(ب) منحوس	
۳۔ مشہور	(ج) دوست	
۴۔ مبارک	(د) گمنام	
۵۔ دشمن	(ہ) جاہل	
۶۔ زاہد	(و) عشرت	
۷۔ بلند	(ز) صغیر	
۸۔ کبیر	(ح) پست	
۹۔ عسرت	(ط) قول	

~ ~ ~ ~ ~ ~ ~ ~ ~ ~

بحث و تکرار

جب کتے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو بری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں، پھر تھوڑی تھوڑی گونجیلی آواز ان کے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہے، پھر تھوڑا سا جبڑا کھلتا ہے اور دانت دکھائی دینے لگتے ہیں اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے، پھر باچھیں چر کر کانوں سے جا لگتی ہیں اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے، ڈاڑھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں، منہ سے جھاگ نکل پڑتے ہیں اور عنیف آواز کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں۔ اس کا ہاتھ اس کے گلے میں اور اس کی ٹانگ اس کی کمر میں، اس کا کان اس کے منہ میں اور اس کا ٹینٹوا اس کے جبڑے میں۔ اس نے اس کو کاٹا اور اس نے اس کو پچھاڑ کر بھنبوڑا، جو کمزور ہوا دم دبا کر بھاگ نکلا۔

نامہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح پر تکرار ہوتی ہے۔ پہلے صاحب سلامت کر کر آپس میں مل بیٹھتے ہیں، پھر دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہوتی ہے۔ ایک کوئی بات کہتا ہے، دوسرا بولتا ہے واہ یوں نہیں یوں ہے۔ وہ کہتا ہے "واہ تم کیا جانو۔" وہ بولتا ہے: "تم کیا جانو۔" دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے، تیوری چڑھ جاتی ہے، رخ بدل جاتا ہے، آنکھیں ڈراؤنی ہو جاتی ہیں، باچھیں چر جاتی ہیں، دانت نکل پڑتے ہیں، تھوک اڑنے لگتا ہے، باچھوں تک کف بھر آتے ہیں، سانس جلدی چلتا ہے، رگیں تن جاتی ہیں۔ آنکھ، ناک، بھوں، ہاتھ عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ عنیف عنیف آوازیں نکلنے لگتی ہیں، آستین چڑھا، ہاتھ پھیلا، اس

کی گردن اس کے ہاتھ میں اور اس کی ڈاڑھی اس کی مٹھی میں، لپاڈگی ہونے لگتی ہے۔ کسی نے بیچ بچاؤ کر کر چھڑا دیا تو غراتے ہوئے ایک ادھر چلا گیا اور ایک ادھر اور اگر کوئی بیچ بچاؤ کرنے والا نہ ہوا تو کمزور نے پٹ کر کپڑے جھاڑتے سر سہلاتے اپنی راہ لی۔

جس قدر تہذیب میں ترقی ہوتی ہے، اسی قدر اس تکرار میں کمی ہوتی ہے۔ کہیں غرفش ہو کر رہ جاتی ہے، کہیں توں تکار تک نوبت آجاتی ہے، کہیں آنکھیں بدلنے اور ناک چڑھانے اور جلدی جلدی سانس چلنے ہی پر خیر گزر جاتی ہے، مگر ان سب میں کسی نہ کسی قدر کتوں کی مجلس کا اثر پایا جاتا ہے۔ پس انسان کو لازم ہے کہ اپنے دوستوں سے کتوں کی طرح بحث و تکرار کرنے سے پرہیز کرے۔

انسانوں میں اختلاف رائے ضرور ہوتا ہے اور اس کے پرکھنے کے لیے بحث و مباحثہ ہی کسوٹی ہے اور اگر سچ پوچھو تو بے مباحثہ اور دل لگی کے آپس میں دوستوں کی مجلس بھی پھیکی ہے، مگر ہمیشہ مباحثہ اور تکرار میں تہذیب و شائستگی، محبت اور دوستی کو ہاتھ سے دینا نہ چاہیے۔

پس اے میرے عزیز ہم وطنو! جب تم کسی کے برخلاف کوئی بات کہنی چاہو یا کسی کی بات کی تردید کا ارادہ کرو تو خوش اخلاقی اور تہذیب کو ہاتھ سے مت دو۔ اگر ایک ہی مجلس میں دو بدو بات چیت کرتے ہو تو اور بھی زیادہ نرمی اختیار کرو۔ چہرہ، لہجہ، آواز، وضع، لفظ اس طرح رکھو جس سے تہذیب اور شرافت ظاہر ہو، مگر بناوٹ بھی نہ پائی جاوے۔ تردیدی گفتگو کے ساتھ ہمیشہ سادگی سے معذرت کے لفظ استعمال کرو، مثلاً یہ کہ میری سمجھ میں نہیں آیا یا شاید مجھے دھوکا ہوا یا میں غلط سمجھا، گو بات تو عجیب ہے، مگر آپ کے فرمانے سے باور کرتا ہوں۔ جب دو تین دفعہ بات کا الٹ پھیر ہو اور کوئی اپنی رائے کو نہ بدلے تو زیادہ تکرار مت بڑھاؤ۔ یہ کہہ کر کہ میں اس بات کو پھر سوچوں گا یا اس پر پھر خیال کروں گا، جھگڑے کو کچھ ہنسی خوشی دوستی کی باتیں کہہ کر ختم کرو۔ دوستی کی باتوں میں اپنے دوست کو یقین دلاؤ کہ

اس دو تین دفعہ کی الٹ پھیر سے تمہارے دل میں کچھ کدورت نہیں آئی ہے اور نہ تمہارا مطلب باتوں کی اس الٹ پھیر سے اپنے دوست کو کچھ تکلیف دینے کا تھا، کیونکہ جھگڑا یا شبہہ زیادہ دنوں تک رہنے سے دونوں کی محبت میں کمی ہو جاتی ہے اور رفتہ رفتہ دوستی ٹوٹ جاتی ہے اور ایسی عزیز چیز (جیسے کہ دوستی) ہاتھ سے جاتی رہتی ہے۔

جبکہ تم مجلس میں ہو جہاں مختلف رائے کے آدمی ملے ہوئے ہیں تو جہاں تک ممکن ہو جھگڑے اور تکرار اور مباحثے کو آنے مت دو، کیونکہ جب تقریر بڑھ جاتی ہے تو دونوں کو ناراض کر دیتی ہے۔ جب دیکھو کہ تقریر لمبی ہوتی جاتی ہے اور تیزی اور زور سے تقریر ہونے لگی ہے تو جس قدر جلد ممکن ہو اس کو ختم کرو اور آپس میں ہنسی خوشی مذاق کی باتوں سے دل کو ٹھنڈا کر لو۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے ہم وطن اس بات پر غور کریں کہ ان کی مجلسوں میں آپس کے مباحثے اور تکرار کا انجام کیا ہوتا ہے۔

(مضامینِ سرسید از سرسید احمد خان)

سوالات

۱۔ کتوں کے لڑنے کا نقشہ اپنے الفاظ میں کھینچیے۔

۲۔ کتوں کے لڑنے اور نامہذب آدمیوں کی تکرار کا موازنہ کیجیے۔

۳۔ تہذیب میں ترقی سے بحث و تکرار کی صورت کس طرح بدلتی ہے؟

۴۔ بحث و تکرار میں کون سا رویہ بہتر ہے اور کیوں ؟

۵۔ اس سبق کے آخری پیرے کی تشریح کیجیے۔

۶۔ نیچے کالم نمبرI میں چند الفاظ دیے گئے ہیں۔ کالم نمبرII میں ان کے مترادف بے ترتیبی سے درج ہیں۔ آپ جوابی کالم میں صحیح مترادف کی حرفی علامت

لکھیے۔

کالم نمبرI	کالم نمبرII	جوابی کالم
۱۔ بحث	(الف) رفاقت	
۲۔ جھاگ	(ب) شک	
۳۔ خیر	(ج) تکرار	
۴۔ دوستی	(د) ناتواں	
۵۔ شبہہ	(س) بھلائی	
۶۔ کمزور	(ع) کف	

۷۔ مندرجہ ذیل محاورات کو جملوں میں استعمال کیجیے۔

تیوری چڑھانا۔ لپاڈگی ہونا۔ ہاتھ سے نہ دینا۔ دم دبا کر بھاگ نکلنا۔ بیچ بچاؤ کرنا۔

۸۔ نیچے دیے ہوئے جوابات میں سے سبق کے مطابق صحیح جواب منتخب کیجیے اور اس کا حرفی نمبر جوابی کالم میں لکھیے۔

(i) نامہذب آدمیوں کی مجلس میں تکرار کی صورت میں پہلے لوگ:

(الف) لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو کر آتے ہیں۔

(ب) صاحب سلامت کر کے آپس میں بیٹھتے ہیں۔

(ج) آتے ہی غصے میں کلام شروع کرتے ہیں۔

(د) ایک دوسرے کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیتے ہیں۔

(ii) جب تہذیب میں ترقی ہوتی ہے تو

(الف) بحث و تکرار بڑھ جاتی ہے۔

(ب) کتوں کی مجلس کا اثر مطلقاً ختم ہو جاتا ہے۔

جوابی کالم

(ج) لپاڈگی نہیں ہوتی۔

(د) تکرار میں کمی ہوتی ہے۔

(iii) مہذب انسانوں کی مجلس میں

(الف) بحث و مباحثہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

(ب) اختلاف رائے قطعاً نہیں ہوتا۔

(ج) اختلاف رائے ضرور ہوتا ہے۔

(د) تہذیب و شائستگی برقرار نہیں رہتی۔

"حرف" وہ کلمہ ہے جو نہ تو کسی شخص یا چیز کا نام ہو، نہ کسی کام کے کرنے اور ہونے کو ظاہر کرے اور نہ اپنے الگ کوئی معانی رکھتا ہو بلکہ یہ مختلف کلموں کو آپس میں ملاتا اور ان کے ساتھ مل کر بامعنی بنتا ہے مثلاً۔

"اگر سچ پوچھو تو بے مباحثہ اور دل لگی آپس میں دوستوں کی مجلس بھی پھیکی ہے" اس جملے میں اگر، تو، اور، میں حروف ہیں۔

۹۔ آپ اس سبق کے آخری پیراگراف سے پانچ حروف چن کر کاپی پر لکھیے۔

۱۰۔ لفظ "**مجلس**" اسمِ ظرف مکاں ہے۔ اسی وزن پر تین مزید اسمائے ظرف مکاں تحریر کیجیے۔

مرحوم کی یاد میں

برآمدے میں آیا تو برآمدے کے ساتھ ہی ایک عجیب و غریب مشین پر نظر پڑی۔ ٹھیک طرح پہچان نہ سکا کہ کیا چیز ہے۔ نوکر سے دریافت کیا "کیوں بے یہ کیا چیز ہے؟"

نوکر بولا "حضور یہ بائیسکل ہے۔"

میں نے کہا، "بائیسکل ؟ کس کی بائیسکل ؟"

کہنے لگا، "مرزا صاحب نے آپ کے لیے بھجوائی ہے۔

میں نے کہا، "اور جو بائیسکل رات کو انھوں نے بھجوائی تھی وہ کہاں گئی؟"

کہنے لگا، "یہی تو ہے۔"

میں نے کہا، "کیا بکتا ہے۔ جو بائیسکل مرزا صاحب نے کل رات کو بھیجی تھی، وہ بائیسکل یہی ہے؟"

کہنے لگا، "جی ہاں"۔

میں نے کہا، "اچھا! اور پھر اسے دیکھنے لگا۔

"اس کو صاف کیوں نہیں کیا؟"

"حضور دو تین دفعہ صاف کیا ہے؟"

"تو یہ مُیلی کیوں ہے؟"

نوکر نے اس کا جواب دینا شاید مناسب نہ سمجھا۔

"اور تیل لایا؟"

"ہاں حضور لایا ہوں۔"

"دیا؟"

"نہیں"

"کیا وجہ؟"

"حضور وہ جو تیل دینے کے چھید ہوتے ہیں۔ وہ نہیں ملتے۔"

"حضور دُھروں پہ مَیل اور زنگ جما ہے۔ وہ سوراخ کہیں بیچ میں ہی دب دبا گئے ہیں۔"

رفتہ رفتہ میں اس چیز کے قریب آیا۔ جس کو میرا نوکر بائیسکل بتا رہا تھا۔ اس کے مختلف پرزوں پر غور کیا۔ اتنا تو ثابت ہو گیا کہ بائیسکل ہے۔ لیکن مجمل ہیئت سے یہ صاف ظاہر تھا کہ ہل اور رہٹ اور چرخہ اور اسی طرح کی اور جدید ایجادات سے پہلے کی بنی ہوئی ہے۔ پہیے کو گھما گھما کر وہ سوراخ تلاش کیا جہاں کسی زمانے میں تیل دیا جاتا تھا۔ لیکن اب اس سوراخ میں سے آمد و رفت کا سلسلہ بند تھا۔ چنانچہ نوکر بولا، "حضور وہ تیل تو سب ادھر ادھر بہ جاتا ہے۔ بیچ میں تو جاتا ہی نہیں۔"

میں نے کہا "اچھا اوپر ہی ڈال دو۔ یہ بھی مفید ہوتا ہے۔"

آخر کار بائیسکل پر سوار ہوا۔ پہلا ہی پاؤں چلایا تو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی مردہ اپنی ہڈیاں چٹخا چٹخا کر، اپنی مرضی کے خلاف زندہ ہو رہا ہو۔ گھر سے نکلتے ہی کچھ تھوڑی سی اترائی تھی۔ اس پر بائیسکل خود بخود چلنے لگی۔ لیکن اس رفتار سے جیسے تارکول زمین پر بہتا ہے، اور ساتھ ہی مختلف حصوں سے طرح طرح کی آوازیں برآمد ہونا شروع ہوئیں۔ ان آوازوں کے مختلف گروہ تھے، "چیں، چاں، چوں" کی قسم کی آوازیں تو زیادہ تر گدی کے نیچے اور پچھلے پہیے سے نکلتی تھیں۔ "کھٹ، کھڑ،

کھڑ، کھڑڑ" کے قبیل کی آوازیں مڈ گارڈوں سے آتی تھیں، "چرچرخ، چرچرخ" کی قسم کے سر زنجیر اور پیڈل سے نکلتے تھے۔ زنجیر ڈھیلی ڈھیلی تھی۔ میں جب کبھی پیڈل پر زور ڈالتا تھا، زنجیر میں ایک انگڑائی سی پیدا ہوتی تھی جس سے وہ تن جاتی تھی اور چڑچڑا کر بولنے لگتی تھی اور پھر ڈھیلی ہو جاتی تھی۔ پچھلا پہیا گھومنے کے علاوہ جھومتا بھی تھا، یعنی ایک تو آگے کو چلتا تھا اور اس کے علاوہ داہنے سے بائیں اور بائیں سے داہنے کو بھی حرکت کرتا تھا۔ چنانچہ سڑک پر جو نشان پڑتا جاتا تھا اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مخمور سانپ لہرا کر نکل گیا ہے۔ مڈ گارڈ تھے تو سہی، لیکن پہیوں کے عین اوپر نہ تھے۔ ان کا فائدہ صرف یہ معلوم ہوتا تھا کہ انسان شمال کی سمت سیر کو نکلے اور آفتاب مغرب میں غروب ہو رہا ہو تو مڈ گارڈوں کی بدولت ٹائر دھوپ سے بچے رہیں گے۔ اگلے پہیے کے ٹائر میں ایک بڑا سا پیوند لگا تھا، جس کی وجہ سے پہیا ہر چکر میں ایک دفعہ لحہ بھر کو زور سے اوپر اٹھ جاتا تھا اور سر پیچھے کو یوں جھٹکے کھا رہا تھا جیسے کوئی متواتر ٹھوڑی کے نیچے مکے مارے جا رہا ہو۔ پچھے اور اگلے پہیوں کو ملا کر "چوں چوں پھٹ، چوں چوں پھٹ" کی صدا نکل رہی تھی۔ جب اتار پر سائیکل ذرا تیز ہوئی تو فضا میں ایک بھونچال سا آگیا اور بائیسکل کے کئی پرزے جو اب تک سو رہے تھے، بیدار ہو کر گویا ہوئے۔ ادھر ادھر کے لوگ چونکے، ماؤں نے اپنے بچوں کو سینوں سے لگا لیا۔ کھڑڑ کھڑڑ کے بیچ میں پہیوں کی آواز جدا سنائی دے رہی تھی لیکن چونکہ اب بائیسکل پہلے سے تیز تھی، اس لیے "چوں چوں پھٹ، چوں چوں پھٹ" کی آواز نے اب "چچوں پھٹ" "چچوں پھٹ" کی صورت اختیار کر لی۔ تمام بائیسکل کسی ادق افریقی زبان کی گردانیں دہرا رہی تھی۔

اس قدر تیز رفتاری بائیسکل کی طبع نازک پر گراں گزری۔ چنانچہ اس میں یک لخت دو تبدیلیاں واقع ہو گئیں۔ ایک تو ہینڈل ایک طرف کو مڑ گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں جا تو سامنے کو رہا تھا، لیکن میرا تمام جسم دائیں طرف کو مڑا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بائیسکل کی گدی دفعتہً چھے انچ کے قریب نیچے بیٹھ گئی۔ چنانچہ

پیڈل چلانے کے لیے ٹانگیں اوپر نیچے کرتا تھا تو میرے گھٹنے میری ٹھوڑی تک پہنچ جاتے تھے۔ کمر دوہری ہو کر باہر کو نکلی ہوئی تھی اور ساتھ ہی اگلے پہیے کی اٹکھیلیوں کی وجہ سے سر برابر جھٹکے کھا رہا تھا۔

گدی کا نیچا ہو جانا از حد تکلیف دہ ثابت ہوا، اس لیے میں نے مناسب یہی سمجھا کہ اس کو ٹھیک کر لوں، چنانچہ میں نے بائیسکل کو ٹھہرا لیا اور نیچے اترا۔ بائیسکل کے ٹھہر جانے سے یک لخت جیسے دنیا میں ایک خاموشی سی چھا گئی، ایسا معلوم ہوا جیسے میں کسی ریل کے سٹیشن سے نکل کر باہر آ گیا ہوں۔ جیب سے میں نے اوزار نکالا، گدی کو اونچا کیا، ہینڈل کو کچھ ٹھیک کیا اور دوبارہ سوار ہو گیا۔

دس قدم بھی نہ چلنے پایا تھا کہ اب کے ہینڈل یک لخت نیچا ہو گیا، اتنا کہ گدی اب ہینڈل سے کوئی فٹ بھر اونچی تھی۔ میرا تمام جسم آگے کو جھکا ہوا تھا، تمام بوجھ دونوں ہاتھوں پر تھا، جو ہینڈل پر رکھے تھے اور برابر جھٹکے کھا رہے تھے۔ آپ میری حالت کا تصور کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ دور سے میں ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی عورت آٹا گوندھ رہی ہو۔ مجھے اس مشابہت کا احساس بہت تیز تھا، جس کی وجہ سے میرے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ میں دائیں بائیں لوگوں کو کنکھیوں سے دیکھتا جاتا تھا۔ یوں تو ہر شخص میل بھر پہلے ہی سے مڑ مڑ کر دیکھنے لگتا تھا۔ لیکن ان میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کے لیے میری حالت ضیافتِ طبع کا باعث نہ ہو۔ ہینڈل تو نیچا ہو ہی گیا تھا لیکن تھوڑی دیر کے بعد گدی بھی نیچی ہو گئی اور میں ہمہ تن زمین کے قریب پہنچ گیا۔ ایک لڑکے نے کہا: "دیکھو یہ آدمی کیا کر رہا ہے؟" گویا اس بدتمیز کے نزدیک میں کوئی کرتب دکھا رہا تھا۔ میں نے اتر کر پھر ہینڈل اور گدی کو اونچا کیا، لیکن تھوڑی دیر کے بعد ان میں سے ایک نہ ایک پھر نیچا ہو جاتا وہ لمحے جن کے دوران میں، میرے ہاتھ اور میرا جسم دونوں برابر ایک ہی بلندی پر واقع ہوں، بہت ہی کم تھے اور ان میں بھی میں یہی سوچتا رہتا تھا کہ اب گدی پہلے بیٹھے گی یا ہینڈل۔ چنانچہ نڈر ہو کر نہ بیٹھتا بلکہ جسم کو گدی سے قدرے اوپر ہی رکھتا، لیکن اس

سے ہینڈل پر اتنا بوجھ پڑ جاتا کہ وہ نیچا ہو جاتا۔

جب دو میل گزر گئے اور بائیسکل کی اٹھک بیٹھک نے ایک مقررہ باقاعدگی اختیار کر لی تو فیصلہ کیا کہ کسی مستری سے پیچ کسوا لینے چاہییں۔ چنانچہ بائیسکل کو ایک دکان پر لے گیا۔ بائیسکل کی کھڑ کھڑ سے جتنے لوگ کام کر رہے تھے، سب کے سب سر اٹھا کر میری طرف دیکھنے لگے، لیکن میں نے جی کڑا کر کے کہا: "ذرا اس کی مرمت کر دیجیے۔"

ایک مستری آگے بڑھا۔ لوہے کی ایک سلاخ اس کے ہاتھ میں تھی، جس سے اس نے مختلف حصوں کو بڑی بے دردی کے ساتھ ٹھونک بجا کر دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا اس نے بڑی تیزی کے ساتھ سب حالات کا اندازہ لگا لیا ہے، لیکن پھر بھی مجھ سے پوچھنے لگا: "کس کس پرزے کی مرمت کرائیے گا؟"

میں نے کہا: "بڑے گستاخ ہو تم! دیکھتے نہیں کہ صرف ہینڈل اور گدی کو ذرا اونچا کروا کے کسوانا ہے۔ بس اور کیا! ان کو مہربانی کر کے فوراً ٹھیک کر دو اور کتنے پیسے ہوئے؟"

مستری کہنے لگا: "مڈ گارڈ بھی ٹھیک کر دوں؟"

میں نے کہا: "ہاں وہ بھی ٹھیک کر دو۔"

کہنے لگا: "اگر آپ باقی چیزیں بھی ٹھیک کروا لیں تو اچھا ہو۔"

میں نے کہا: "اچھا کر دو۔"

بولا: "یوں تھوڑی ہو سکتا ہے، دس پندرہ دن کا کام ہے۔ آپ اسے ہمارے پاس چھوڑ جائیے۔"

"اور پیسے کتنے لو گے؟"

کہنے لگا: "بس تیس چالیس روپے لیں گے۔"

میں نے کہا: "بس جی، جو کام تم سے کہا ہے، کر دو اور باقی ہمارے معاملات میں دخل مت دو۔"

تھوڑی دیر میں ہینڈل اور گدی پھر اونچی کر کے کس دی گئی۔ میں چلنے لگا تو مستری نے کہا: "میں نے کس تو دیا ہے، لیکن پیچ سب گھسے ہوئے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں پھر ڈھیلے ہو جائیں گے۔"

میں نے کہا: "ہیں! بدتمیز کہیں کا! تو دو آنے مفت میں لے لیے؟

بولا: "جناب! آپ کو بائیسکل بھی تو مفت میں ملی ہو گی! یہ آپ کے دوست مرزا صاحب کی ہے نا؟ لو! یہ وہی بائیسکل ہے، جو پچھلے سال مرزا صاحب یہاں بیچنے کو لائے تھے۔ پہچانی تم نے؟ بھئی صدیاں گزر گئیں لیکن اس بائیسکل کی خطا معاف ہونے میں نہیں آتی۔"

میں نے کہا: "واہ! مرزا صاحب کے لڑکے اس پر کالج آیا جایا کرتے تھے اور ان کو ابھی کالج چھوڑے دو سال بھی نہیں ہوئے۔"

مستری نے کہا: "ہاں وہ ٹھیک ہے، لیکن مرزا صاحب جب خود کالج میں پڑھتے تھے تو ان کے پاس بھی تو یہی بائیسکل تھی۔"

میری طبیعت یہ سن کر کچھ مردہ سی ہو گئی۔ میں بائیسکل کو ساتھ لیے آہستہ آہستہ پیدل چل پڑا، لیکن پیدل چلنا بھی مشکل تھا۔ اس بائیسکل کے چلانے میں ایسے ایسے پٹھوں پر زور پڑتا تھا جو عام بائیسکلوں کے چلانے میں استعمال نہیں ہوتے، اس لیے ٹانگوں، کندھوں، کمر اور بازوؤں میں جا بجا درد ہو رہا تھا جو برداشت کے قابل نہ تھا۔ مرزا کا خیال رہ رہ کر آتا تھا، لیکن میں ہر بار کوشش کر کے اسے دل سے ہٹا دیتا تھا، ورنہ میں پاگل ہو جاتا اور جنون کی حالت میں پہلی حرکت مجھ سے یہ سرزد ہوتی کہ مرزا کے مکان کے سامنے، بازار میں ایک جلسہ منعقد کرتا، جس میں مرزا کی مکاری، بے ایمانی اور دغابازی پر ایک طویل تقریر کرتا۔ کل بنی نوع انسان اور

آئندہ آنے والی نسلوں کو مرزا کی ناپاک فطرت سے آگاہ کر دیتا اور اس کے بعد ایک چتا جلا کر اس میں زندہ جل کر مر جاتا۔

میں نے بہتر یہی سمجھا کہ جس طرح ہو سکے اب اس بائیسکل کو اونے پونے داموں بیچ کر جو وصول ہو، اس پر صبر و شکر کروں۔ بلا سے دس پندرہ روپے کا خسارہ ہی سہی۔ چالیس کے چالیس روپے تو ضائع نہ ہوں گے۔ راستے میں بائیسکلوں کی ایک اور دکان آئی، وہاں ٹھہر گیا۔

دکان دار بڑھ کر میرے پاس آیا لیکن میری زبان کو جیسے قفل لگ گیا تھا۔ عمر بھر کسی چیز کے بیچنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ ایسے موقع پر کیا کہتے ہیں۔ آخر بڑے سوچ بچار اور بڑے تامل کے بعد منہ سے صرف اتنا نکلا کہ "یہ بائیسکل ہے۔" دکان دار کہنے لگا: "پھر!"

میں نے کہا: "لو گے؟"

کہنے لگا: "کیا مطلب؟"

میں نے کہا: "بیچتے ہیں ہم۔"

دکان دار نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا کہ مجھے یہ محسوس ہوا، جیسے مجھ پر چوری کا شبہ کر رہا ہے۔ پھر بائیسکل کو دیکھا، پھر مجھے دیکھا، پھر بائیسکل کو دیکھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ آدمی کون سا ہے اور بائیسکل کون سی ہے۔ آخر کار بولا: "کیا کریں گے آپ اس کو بیچ کر؟"

ایسے سوالوں کا خدا جانے کیا جواب ہوتا ہے۔ میں نے کہا: "کہ تم یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ جو روپے مجھے وصول ہوں گے، ان کا مَصرف کیا ہو گا؟"

کہنے لگا: "وہ ٹھیک ہے، مگر کوئی اس کو لے کر کیا کرے گا؟"

میں نے کہا: "اس پر چڑھے گا اور کیا کرے گا!"

کہنے لگا: "اچھا! چڑھ گیا، پھر ـــــ؟"

میں نے کہا: "پھر کیا؟ "پھر چلائے گا اور کیا؟"

دکان دار بولا: "اچھا، ہوں "خدا بخش، ذرا یہاں آنا، یہ بائیسکل بکنے آئی ہے۔"

جن حضرت کا اسم گرامی خدا بخش تھا، انھوں نے بائیسکل کو دور ہی سے یوں دیکھا، جیسے بو سونگھ رہے ہوں۔ اس کے بعد دونوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ آخر میں وہ، جن کا نام خدا بخش تھا میرے پاس آئے اور کہنے لگے: "آپ بیچ رہے ہیں؟"

میں نے کہا: "تو اور کیا محض آپ سے ہم کلام ہونے کا فخر حاصل کرنے کے لیے میں گھر سے بہانہ کر کے لایا تھا؟"

کہنے لگا: "تو کیا لیں گے آپ؟"

میں نے کہا: "تم ہی بتاؤ؟"

کہنے لگا: "سچ مچ بتاؤں؟"

میں نے کہا: "ہاں۔"

پھر کہنے لگا: "سچ مچ بتاؤں؟"

میں نے کہا: "اب بتاؤ گے بھی یا یوں ہی ترساتے رہو گے؟"

کہنے لگا: "تین روپے دوں گا اس کے۔"

میرا خون کھول اٹھا اور میرے ہاتھ، پاؤں اور ہونٹ غصے کے مارے کانپنے لگے۔ میں نے کہا: "او صنعت و حرفت سے پیٹ پالنے والے نچلے طبقے کے انسان! مجھے اپنی توہین کی پروا نہیں، لیکن تو نے اپنی بیہودہ گفتاری سے اس بے زبان

چیز کو جو صدمہ پہنچایا ہے اس کے لیے میں تجھے قیامت تک معاف نہیں کر سکتا۔" یہ کہ کر میں بائیسکل پر سوار ہو گیا اور اندھا دھند پاؤں چلانے لگا۔

مشکل سے بیس قدم گیا ہوں گا کہ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے زمین یک لخت اچھل کر مجھ سے آ لگی ہے۔ آسمان میرے سر پر سے ہٹ کر میری ٹانگوں کے بیچ میں سے گزر گیا! اور ادھر ادھر کی عمارتوں نے ایک دوسرے کے ساتھ اپنی جگہ بدل لی ہے۔ جب حواس بجا ہوئے تو معلوم ہوا کہ میں زمین پر اس بے تکلفی سے بیٹھا ہوں گویا بڑی مدت سے مجھے اس بات کا شوق تھا، جو آج پورا ہوا۔ اردگرد کچھ لوگ جمع تھے، جن میں سے اکثر ہنس رہے تھے۔ سامنے وہ دکان تھی، جہاں ابھی ابھی میں نے اپنی ناکام گفت و شنید کا سلسلہ منقطع کیا تھا۔ میں نے اپنے گرد و پیش پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ میری بائیسکل کا اگلا پہیا بالکل الگ ہو کر لڑھکتا ہوا سڑک کے اس پار جا پہنچا اور باقی بائیسکل میرے پاس پڑی رہی۔ میں نے فوراً اپنے آپ کو سنبھالا۔ جو پہیا الگ ہو گیا تھا اس کو ایک ہاتھ میں اٹھایا، دوسرے ہاتھ میں باقی ماندہ بائیسکل کو تھاما اور چل کھڑا ہوا۔ یہ محض ایک اضطراری حرکت تھی، ورنہ وہ بائیسکل مجھے ہرگز اتنی عزیز نہ تھی کہ میں اس کو اس حالت میں ساتھ ساتھ لیے پھرتا۔

جب میں یہ سب کچھ اٹھا کر چل دیا تو میں نے اپنے آپ سے پوچھا: "یہ تم کیا کر رہے ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟"

سب سوالوں کا جواب یہی ملا کہ دیکھا جائے گا۔ فی الحال تم یہاں سے چل دو۔ سب لوگ تمھیں دیکھ رہے ہیں۔ سر اونچا رکھو اور چلتے جاؤ۔ جو ہنس رہے ہیں، ہنسنے دو۔ اس قسم کے بیہودہ لوگ ہر قوم اور ملک میں پائے جاتے ہیں۔ آخر ہوا کیا؟ محض ایک حادثہ۔ بس دائیں بائیں مت دیکھو، چلتے جاؤ۔

لوگوں کے ناشائستہ کلمات بھی سنائی دے رہے تھے۔ ایک آواز آئی: "بس حضرت! غصہ تھوک ڈالیے۔" ایک دوسرے صاحب بولے: "بے حیا بائیسکل! گھر

پہنچ کے تجھے مزہ چکھاؤں گا۔" ایک والد اپنے لختِ جگر کی انگلی پکڑے جا رہے تھے۔ میری طرف اشارہ کر کے کہنے لگے :"دیکھا بیٹا! یہ سرکس کی بائیسکل ہے۔ اس کے دونوں پہیے الگ الگ ہوتے ہیں۔"

لیکن میں چلتا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں آبادی سے دور نکل گیا۔ اب میری رفتار میں ایک عزیمت پائی جاتی تھی۔ میں چلتا گیا، حتیٰ کہ دریا پر جا پہنچا۔ پل کے اوپر کھڑے ہو کر میں نے دونوں پہیوں کو ایک ایک کر کے اس بے پروائی کے ساتھ دریا میں پھینک دیا، جیسے کوئی لیٹر بکس میں خط ڈالتا ہے، اور واپس شہر کو روانہ ہو گیا۔

(پطرس کے مضامین از احمد شاہ بخاری)

سوالات

۱۔ بائیسکل بہت پرانی تھی۔ بائیسکل کے اس وصف کو ظاہر کرنے کے لیے مصنف نے کیا انداز اختیار کیا ہے؟

۲۔ بائیسکل کی گدی، مڈگارڈوں، زنجیر اور پیڈلوں سے کس قسم کی آوازیں نکلتی تھیں؟

۳۔ اُترائی پر جب سائیکل ذرا تیز ہوئی تو پہیوں کی آوازوں نے ارد گرد کے ماحول پر کیسا اثر ڈالا؟

۴۔ جب سائیکل سوار پیچ کسوانے کے لیے مستری کی دکان پر گیا تو ان دونوں میں جو گفتگو ہوئی اسے اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۵۔ اس مضمون کے کم از کم دو ایسے حصے زبانی یاد کیجیے جنھیں پڑھ کر ہنسی ضبط نہ

ہو سکے۔

۶۔ مندرجہ ذیل عبارات کی تشریح کیجیے۔

(الف) دس قدم بھی نہ چلنے ----- ضیافت طبع کا باعث نہ ہو۔

(ب) مشکل سے بیس قدم ----- اکثر ہنس رہے تھے۔

۷۔ مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کے معانی لکھیے اور انھیں اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

ضیافتِ طبع ۔ مخمور ۔ ادق ۔ مجمل ہیئت ۔ تامل ۔ مصرف ۔ عزیمت ۔

۸۔ مندرجہ ذیل الفاظ کی تذکیر و تانیث ظاہر کرنے کے لیے انھیں جملوں میں استعمال کیجیے۔

ضیافت ۔ جنون ۔ عزیمت ۔ آواز ۔ بائیسکل ۔ قیامت ۔ سڑک ۔ سر۔

وہ حرف جو دو اسموں کے باہمی تعلق کو ظاہر کرتا ہے "**حرفِ اضافت**" کہلاتا ہے۔ مثلاً "حالات کا اندازہ"۔ "شمال کی سمت"۔ "اگلے پہیے کے ٹائر" میں کا، کی اور کے حروفِ اضافت ہیں۔

۹۔ مندرجہ ذیل جملوں میں خالی جگہوں کو حروفِ اضافت سے پُر کیجیے۔

(الف) مڈ گارڈ تھے تو سہی لیکن پہیوں ----- عین اوپر نہ تھے۔

(ب) تمام بائیسکل کسی ادق افریقی زبان ----- گردانیں دہرا رہی تھی۔

(ج) اس قدر تیز رفتاری بائیسکل ----- طبع نازک پر گراں گزری۔

(د) اگلے پہیے ----- اٹھکیلیوں ----- وجہ سے سر برابر جھٹکے کھا رہا تھا۔

۱۰۔ ذیل میں کچھ کثیرالاستعمال الفاظ مع اعراب تحریر کیے گئے ہیں۔ ہر گروپ کے درست تلفظ والے حرفی لفظ کا نمبر جوابی کالم میں درج کیجیے۔

پہنچ کے تجھے مزہ چکھاؤں گا۔" ایک والد اپنے لختِ جگر کی انگلی پکڑے جا رہے تھے۔ میری طرف اشارہ کر کے کہنے لگے: "دیکھا بیٹا! یہ سرکس کی بائیسکل ہے۔ اس کے دونوں پہیے الگ الگ ہوتے ہیں۔"

لیکن میں چلتا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں آبادی سے دور نکل گیا۔ اب میری رفتار میں ایک عزیمت پائی جاتی تھی۔ میں چلتا گیا، حتیٰ کہ دریا پر جا پہنچا۔ پل کے اوپر کھڑے ہو کر میں نے دونوں پہیوں کو ایک ایک کر کے اس بے پروائی کے ساتھ دریا میں پھینک دیا، جیسے کوئی لیٹر بکس میں خط ڈالتا ہے، اور واپس شہر کو روانہ ہو گیا۔

(پطرس کے مضامین از احمد شاہ بخاری)

سوالات

۱۔ بائیسکل بہت پرانی تھی۔ بائیسکل کے اس وصف کو ظاہر کرنے کے لیے مصنف نے کیا انداز اختیار کیا ہے؟

۲۔ بائیسکل کی گدی، مڈگارڈوں، زنجیر اور پیڈلوں سے کس قسم کی آوازیں نکلتی تھیں؟

۳۔ اُترائی پر جب سائیکل ذرا تیز ہوئی تو پہیوں کی آوازوں نے اردگرد کے ماحول پر کیسا اثر ڈالا؟

۴۔ جب سائیکل سوار پیچ کسوانے کے لیے مستری کی دکان پر گیا تو ان دونوں میں جو گفتگو ہوئی اسے اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۵۔ اس مضمون کے کم از کم دو ایسے حصے زبانی یاد کیجیے جنھیں پڑھ کر ہنسی ضبط نہ

ہو سکے۔

۶۔ مندرجہ ذیل عبارات کی تشریح کیجیے۔

(الف) دس قدم بھی نہ چلنے ----- ضیافت طبع کا باعث نہ ہو۔

(ب) مشکل سے بیس قدم ----- اکثر ہنس رہے تھے۔

۷۔ مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کے معانی لکھیے اور انھیں اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

ضیافتِ طبع ۔ مخمور ۔ ادق ۔ مجمل ہیئت ۔ تامل ۔ مصرف ۔ عزیمت ۔

۸۔ مندرجہ ذیل الفاظ کی تذکیر و تانیث ظاہر کرنے کے لیے انھیں جملوں میں استعمال کیجیے۔

ضیافت ۔ جنون ۔ عزیمت ۔ آواز ۔ بائیسکل ۔ قیامت ۔ سڑک ۔ سر۔

وہ حرف جو دو اسموں کے باہمی تعلق کو ظاہر کرتا ہے "حرفِ اضافت" کہلاتا ہے۔ مثلاً "حالات کا اندازہ" ۔ "شمال کی سمت" ۔ "اگلے پہیے کے ٹائر" میں کا، کی اور کے حروفِ اضافت ہیں۔

۹۔ مندرجہ ذیل جملوں میں خالی جگہوں کو حروفِ اضافت سے پر کیجیے۔

(الف) مڈگارڈ تھے تو سہی لیکن پہیوں ----- عین اوپر نہ تھے۔

(ب) تمام بائیسکل کسی ادق افریقی زبان ----- گردانیں دہرا رہی تھی۔

(ج) اس قدر تیز رفتاری بائیسکل ----- طبع نازک پر گراں گزری۔

(د) اگلے پہیے ----- اٹکھیلیوں ----- وجہ سے سر برابر جھٹکے کھا رہا تھا۔

۱۰۔ ذیل میں کچھ کثیر الاستعمال الفاظ مع اعراب تحریر کیے گئے ہیں۔ ہر گروپ کے درست تلفظ والے حرفی لفظ کا نمبر جوابی کالم میں درج کیجیے۔

		جوابی کالم
(i) حُضوُر	الف۔ حُضُور	
(ii) مُجْمَل	ب۔ مُجْمِل	
(iii) سُمْت	ج۔ سِمْت	
(iv) نَازُک	د۔ نَازُک	
(v) جِسْم	ہ۔ جِسم	
(vi) نَظْر	و۔ نَظَر	

۱۱۔ کالم نمبرا میں کچھ الفاظ اور کالم نمبر۲ میں قواعد کی اصطلاحات درج ہیں۔ جوابی کالم میں بتائیے کہ یہ الفاظ قواعد کی رُو سے کیا ہیں؟ ہر لفظ کے سامنے صحیح جواب کا حرفی نمبر درج کیجیے۔

کالم نمبرا	کالم نمبر۲	جوابی کالم
۱۔ کل	(الف) اسمِ نکرہ	
۲۔ بائیسکل	(ب) اسمِ معرفہ	
۳۔ بتا رہا تھا	(ج) فعلِ حال	
۴۔ چرخا	(د) فعلِ ماضی	
۵۔ کا	(ہ) اسمِ ظرف مکاں	
۶۔ لیٹر	(و) اسمِ آلہ	
۷۔ بہتا ہے	(ز) حرفِ اضافت	
۸۔ خدا بخش	(ح) اسمِ ظرف زماں	

- - - - - - - - - - - -

قومی زبان

قدرت کی بعض نعمتیں ایسی ہیں کہ ان پر ہماری زندگی کا انحصار ہے۔ وہ نہ ہوں تو ہماری زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ جیسے ہوا، پانی تنفس وغیرہ۔ لیکن عام یا بہ افراط ہونے سے ہمیں ان کی کچھ قدر نہیں ہوتی۔ یہی حال زبان کا ہے۔ بچپن سے لے کر مرتے دم تک یہ ہمارے ساتھ اور روزمرہ کے استعمال کی وجہ سے وہ ایک معمولی چیز ہو گئی ہے اور ہم اس کی وہ قدر نہیں کرتے جو کرنی چاہیے ورنہ دیکھا جائے تو زبان کا انسان کی زندگی میں بہت بڑا دخل ہے اس کے نتائج اور اثرات نہایت عجیب اور دور رس ہیں۔ یہ معمولی بات ہے جسے ہر شخص جانتا ہے کہ حیوان اور انسان میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ اگرچہ جانوروں کے بھی زبان (جیبھ) ہے اور بعض کی ہم سے بہت بڑی ہوتی ہے لیکن ان میں قوت گویائی نہیں۔ یہ خاص انسان کی امتیازی شان ہے کہ یہ محض اس کے خیالات کے اظہار کا آلہ ہی نہیں بلکہ اس کے خیالات کے بنانے اور سنوارنے کا بھی آلہ ہے۔ وہ ہماری زندگی کے ہر شعبے میں دخیل اور کارفرما ہے۔ اگر ہم اس کے تحفظ و ترقی کے لیے جدوجہد کریں، جان لڑا دیں تو یہ ہمارا فرض ہے اور اس فرض سے غفلت کسی مذہب و ملت میں روا نہیں۔

زبان نہ کسی کی ایجاد ہوتی ہے اور نہ کوئی اسے ایجاد کر سکتا ہے۔ جس اصول پر بیج سے کونپل پھوٹتی، پتے نکلتے، شاخیں پھیلتی، پھل پھول لگتے ہیں اور ایک دن وہی ننھا سا پودا ایک تناور درخت ہو جاتا ہے اسی اصول کے مطابق زبان پیدا ہوتی بڑھتی اور پھلتی پھولتی ہے۔

زبان اپنے بولنے والوں سے اس طرح وابستہ ہے کہ وہ کسی وقت اور کسی حال میں ان سے جدا نہیں ہو سکتی۔ اٹھتے، بیٹھتے، سوتے، جاگتے ہر وقت ان کی ہمدم

ہے۔ ان کی تہذیب اور تعلیم و تربیت کا یہی ذریعہ ہے۔ زبان کا وہی حشر ہو گا جو اس کے بولنے والوں کا ہو گا۔ اس کا بنانا اور بگاڑنا، ہمارے ہاتھ میں ہے۔ گزشتہ زمانے میں جیسا ہم نے اسے بنانا چاہا ویسی ہی بنی اور آئندہ بھی جیسے اسے بنانا چاہیں گے ویسی ہی بنے گی۔ اس کے بگڑنے میں ہمارا بگڑنا اور اس کے بننے میں ہمارا بننا ہے۔

زبان کو انسانی ضرورت نے پیدا کیا اور زبان اور اس کے ادب کا ارتقاء زمانے کی ضرورت اور حالات وافکار کے تابع رہا اور آئندہ بھی رہے گا۔

زبان صرف اظہارِ خیال کا آلہ ہی نہیں بلکہ ہماری زندگی کا جزو ہے۔۔ ہر شخص جو اسے بولتا یا کام میں لاتا ہے وہ اپنی بساط کے موافق اس میں اپنی زندگی کا کچھ نہ کچھ نشان ضرور چھوڑتا جاتا ہے۔ اس میں ہمارے تمدن وشائستگی، خیالات وجذبات، تجربات اور مشاہدات کی تاریخ پنہاں ہے۔ ہر لفظ ایک زندہ شے ہے جو اپنے منہ سے اپنی حکایت بیان کر رہا ہے۔ ہمارے اسلاف نے کیسی کیسی محنت ومشقت سے اسے پالا پوسا ہے اور اپنے خون سے سینچا ہے۔ یہ ایک مقدس میراث ہے جو نسلاً بعد نسل ہم تک پہنچی ہے ہم ناخلف ہوں گے اگر ہم نے اسے قائم نہ رکھا اور اس کی ترقی وفروغ میں پوری کوشش نہ کی۔

زبان صرف بول چال ہی کے لیے نہیں ہوتی۔ انسان محض بولنے اور بڑبڑانے کی کل نہیں ہے۔ زندگی کا پھیلاؤ دور دور تک ہے اور اس کے شعبے اسی قدر وسیع ہیں جس قدر کہ کائنات۔ زبان زندگی کا نہایت مفید اور اہم جزو ہے اور زندگی کے ہر شعبے کے ساتھ اس کا لگاؤ اس قدر گہرا ہے کہ انسانی تمدن اور تہذیب کی ترقی جو ہم اس وقت دیکھتے ہیں اس میں بہت کچھ اس کا دخل پایا جاتا ہے۔ اس لیے اختیار کرنے کے قابل وہی زبان ہو سکتی ہے جو تہذیب وتمدن کی ممد ہو اور ان تمام افعال واعمال کے انجام دینے میں کار آمد ہو سکے جن کا تعلق حیاتِ انسانی سے ہے۔

قومی زبان کی حدود زیادہ وسیع ہوتی ہیں اس لیے اس کا حلقۂ اثر بھی وسیع ہوتا ہے۔ قومی زبان ساری قوم کی ہے۔ قومی زبان کے ذریعے قوم کا ہر فرد اپنی آواز ساری قوم تک پہنچا سکتا ہے۔ قومی زبان پوری قوم کے خصائص اور اس کی روایات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ قومی زبان قوم کے شیرازے کو مضبوط کرتی اور اسے منتشر ہونے سے بچاتی ہے۔

زبان ایک بڑی قوت ہے اور قومیت اور تہذیب کی جان ہے یہی وجہ ہے کہ مخالف سب سے پہلے اس پر ہاتھ ڈالتا ہے اور اسے مٹانے یا کمزور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ زبان والے اگر اس راز سے واقف ہوں تو انھیں اس کے بچانے کے لیے ہر قسم کی قربانی کرنا پڑتی ہے۔

من جملہ ان اسباب کے جو قومی ترقی کا موجب ہوتے ہیں ایک بڑا سبب زبان کی تکمیل ہے۔ جس قدر کوئی قوم زیادہ ترقی یافتہ ہو اسی قدر اس کی زبان وسیع اور اس میں نازک خیالات اور علمی مطالب ادا کرنے کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے اور جس قدر کسی قوم کی زبان محدود ہو اسی قدر تہذیب وشائستگی بلکہ انسانیت میں اس کا درجہ کم ہوتا ہے۔ علمائے فلسفہ ولسانیات نے اعتراف کیا ہے کہ زبان خیال اور خیال زبان ہے اور ایک مدت کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انسانی دماغ کے صحیح تاریخی ارتقاء کا علم زبان کی تاریخ کے مطالعے سے ہو سکتا ہے۔ الفاظ ہمیں سوچنے میں وہی مدد دیتے ہیں جیسے آنکھیں دیکھنے میں۔ اس لیے زبان کی ترقی درحقیقت عقل کی ترقی، قومیت کی ترقی اور انسانیت کی ترقی ہے۔

قومیت کے لیے یک رنگی کی، یک رنگی کے لیے ہم خیالی کی، اور ہم خیالی کے لیے ہم لسانی کی ضرورت ہے۔ جہاں زبان ایک نہیں وہاں خیال کا رنگ ایک نہیں، جہاں خیال ایک نہیں وہاں دل بھی ایک نہیں۔ یہ دلوں کو جوڑتی اور بیگانوں کو یگانہ بنا دیتی ہے۔

		جوابی کالم
۳۔ زبان کا حشر وہی ہو گا	(ج) وہاں خیال کا رنگ ایک نہیں	
۴۔ الفاظ ہمیں سوچنے میں وہی مدد دیتے ہیں جیسے	(د) ان پر ہماری زندگی کا انحصار ہے	
۵۔ جہاں زبان ایک نہیں	(ص) تو یہ ہمارا فرض ہے	

۶۔ مندرجہ ذیل واحد الفاظ کے جمع اور جمع کے واحد عربی قاعدے سے لکھیے:

نتائج ۔ اثرات ۔ فرض ۔ افکار ۔ اسلاف ۔ اخلاف ۔ خصائص ۔ جزو۔

وہ حرف جو اسم اور فعل کو آپس میں ملاتا ہے اسے **"حرف جار"** کہتے ہیں۔ مثلاً۔ میں ۔ سے ۔ پر ۔ تک ۔ تلک ۔ ساتھ ۔ اوپر ۔ نیچے ۔ آگے ۔ پیچھے۔ لیے۔ واسطے وغیرہ۔

۷۔ آپ اس سبق کے پہلے پیراگراف سے حروف جار چن کر اپنی کاپی میں لکھیے۔

۸۔ نیچے چند نامکمل جملے دیے گئے ہیں، جو سابقے اور لاحقے لگانے سے مکمل ہو سکتے ہیں۔ آپ دی ہوئی فہرست سے مناسب سابقے اور لاحقے لگا کر جملے مکمل کیجیے اور جملے کے سامنے جوابی کالم میں صحیح جواب لکھ دیجیے۔

	جوابی کالم
بہ ۔ یافتہ ۔ دار ۔ آمد ۔ نا	
(الف) ہمارے ملک میں چاول ----۔ افراط ہوتا ہے۔	
(ب) اگر ہم نے زبان کی مقدس میراث کو قائم نہ رکھا تو ہم ---- خلف کہلائیں گے۔	
(ج) وہی زبان زندہ کہلا سکتی ہے جو قوم کی ترقی میں کار ----۔ ثابت ہو سکے۔	
(د) قومی زبان قومی روایات کی آئینہ ----۔ ہوتی ہے۔	

۳۔ زبان کا حشر وہی ہو گا	(ج) وہاں خیال کا رنگ ایک نہیں	جوابی کالم
۴۔ الفاظ ہمیں سوچنے میں وہی مدد دیتے ہیں جیسے	(د) ان پر ہماری زندگی کا انحصار ہے	
۵۔ جہاں زبان ایک نہیں	(ص) تو یہ ہمارا فرض ہے	

۶۔ مندرجہ ذیل واحد الفاظ کے جمع اور جمع کے واحد عربی قاعدے سے لکھیے:

نتائج۔ اثرات۔ فرض۔ افکار۔ اسلاف۔ اخلاف۔ خصائص۔ جزو۔

وہ حرف جو اسم اور فعل کو آپس میں ملاتا ہے اسے **"حرف جار"** کہتے ہیں۔ مثلاً۔ میں۔ سے۔ پر۔ تک۔ تلک۔ ساتھ۔ اوپر۔ نیچے۔ آگے۔ پیچھے۔ لیے۔ واسطے وغیرہ۔

۷۔ آپ اس سبق کے پہلے پیراگراف سے حروف جار چن کر اپنی کاپی میں لکھیے۔

۸۔ نیچے چند نامکمل جملے دیے گئے ہیں، جو سابقے اور لاحقے لگانے سے مکمل ہو سکتے ہیں۔ آپ دی ہوئی فہرست سے مناسب سابقے اور لاحقے لگا کر جملے مکمل کیجیے اور جملے کے سامنے جوابی کالم میں صحیح جواب لکھ دیجیے۔

بہ۔ یافتہ۔ دار۔ آمد۔ نا	جوابی کالم
(الف) ہمارے ملک میں چاول ---- افراط ہوتا ہے۔	
(ب) اگر ہم نے زبان کی مقدس میراث کو قائم نہ رکھا تو ہم ---- خلف کہلائیں گے۔	
(ج) وہی زبان زندہ کہلا سکتی ہے جو قوم کی ترقی میں کار ---- ثابت ہو سکے۔	
(د) قومی زبان قومی روایات کی آئینہ ---- ہوتی ہے۔	

زبان بلاشبہہ معاشرتی ضرورت ہے۔ یہی اس کی تخلیق کا باعث ہوئی اور اس کی زندگی کا ایسا جزو ہے جو اس سے کبھی جدا نہیں ہو سکتا وہ انسان سے الگ کوئی شے نہیں ہے۔ وہ ان لوگوں سے وابستہ ہے جو اسے بولتے اور اس میں فکر کرتے ہیں۔ اس کی جڑیں ہمارے دل ودماغ اور جسم میں پھیلی ہوئی ہیں اور وہیں سے اس کی نشوونما ہوتی ہے۔ زبان کی ترقی وانحطاط معاشرتی حالات کے تابع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے لسانیات تمدن ومعاشرت کی تاریخ کو زبان کی تاریخ میں تلاش کرتے ہیں۔

(مضامین عبدالحق از مولوی عبدالحق)

سوالات

۱۔ حیوان اور انسان میں بڑا فرق کیا ہے؟

۲۔ زبان اور اس کے بولنے والے کا تعلق واضح کیجیے۔

۳۔ زبان ہماری زندگی کا جزو کس طرح بنتی ہے؟

۴۔ قومی ترقی اور قومی زبان کے تعلق کو واضح کرنے کے لیے مصنف نے جو دلائل دیے ہیں ان کا خلاصہ لکھیے۔

۵۔ کالم نمبر۱ میں **"قومی زبان"** سے چن کر چند جملے دیے گئے ہیں۔ انھیں کالم نمبر۲ میں دیے ہوئے مناسب جملوں سے مکمل کیجیے۔ جوابی کالم میں کالم نمبر۱ کے جملے کے سامنے کالم نمبر۲ کے صحیح جملے کا صرف حرفی نمبر درج کیجیے۔

		جوابی کالم
۱۔ قدرت کی بعض نعمتیں ایسی ہیں کہ	(الف) جو اس کے بولنے والوں کا ہوگا	
۲۔ اگر ہم اس کے تحفظ اور ترقی کے لیے جان لڑا دیں	(ب) آنکھیں دیکھنے میں	

جوابی کالم		
	(ج) وہاں خیال کا رنگ ایک نہیں	۳۔ زبان کا حشر وہی ہو گا
	(د) ان پر ہماری زندگی کا انحصار ہے	۴۔ الفاظ ہمیں سوچنے میں وہی مدد دیتے ہیں جیسے
	(ص) تو یہ ہمارا فرض ہے	۵۔ جہاں زبان ایک نہیں

۶۔ مندرجہ ذیل واحد الفاظ کے جمع اور جمع کے واحد عربی قاعدے سے لکھیے:

نتائج۔ اثرات۔ فرض۔ افکار۔ اسلاف۔ اخلاف۔ خصائص۔ جزو۔

وہ حرف جو اسم اور فعل کو آپس میں ملاتا ہے اسے **"حرف جار"** کہتے ہیں۔ مثلاً۔ میں۔ سے۔ پر۔ تک۔ تلک۔ ساتھ۔ اوپر۔ نیچے۔ آگے۔ پیچھے۔ لیے۔ واسطے وغیرہ۔

۷۔ آپ اس سبق کے پہلے پیراگراف سے حروف جار چن کر اپنی کاپی میں لکھیے۔

۸۔ نیچے چند نامکمل جملے دیے گئے ہیں، جو سابقے اور لاحقے لگانے سے مکمل ہو سکتے ہیں۔ آپ دی ہوئی فہرست سے مناسب سابقے اور لاحقے لگا کر جملے مکمل کیجیے اور جملے کے سامنے جوابی کالم میں صحیح جواب لکھ دیجیے۔

جوابی کالم	
	بہ۔ یافتہ۔ دار۔ آمد۔ نا
	(الف) ہمارے ملک میں چاول ---- افراط ہوتا ہے۔
	(ب) اگر ہم نے زبان کی مقدس میراث کو قائم نہ رکھا تو ہم ---- خلف کہلائیں گے۔
	(ج) وہی زبان زندہ کہلا سکتی ہے جو قوم کی ترقی میں کار ---- ثابت ہو سکے۔
	(د) قومی زبان قومی روایات کی آئینہ ---- ہوتی ہے۔

(ہ) جو قوم جس قدر ترقی ـــــــــ ہے اسی قدر اس کی زبان وسیع ہے۔	جوابی کالم

۹۔ نیچے ہر گروپ میں ایک لفظ کے دو تلفظ اعراب لگا کر واضح کیے گئے ہیں۔ آپ جوابی کالم میں درست تلفظ کا حرفی نمبر درج کیجیے۔

الفاظ کے گروپ		جوابی کالم
۱۔ (الف) اِنْحِصَار	(ب) اِنْحَصَار	
۲۔ (الف) قُدْرَ	(ب) قَدَر	
۳۔ (الف) تَنَفُّس	(ب) تَنَفَّس	
۴۔ (الف) اَفْرَاط	(ب) اِفْرَاط	
۵۔ (الف) دُخَل	(ب) دَخِل	
۶۔ (الف) تَحَفُّظ	(ب) تَحَفَّظ	
۷۔ (الف) اَصُوْل	(ب) اُصُوْل	
۸۔ (الف) حَشَر	(ب) حَشْر	

۱۰۔ نیچے دیے ہوئے جملوں کو درست کیجیے۔

(الف) میں نے دس بجے دفتر پہنچنا ہے۔ (د) کیا تم چپ نہیں کر سکتے

(ب) آپ برا نہ منائیں تو صاف بات کہ دوں (ن) بارش برس رہی ہے۔

(ج) نائی حجامت کرنے آیا۔ (ی) یہ شعر مجھے سمجھ نہیں آیا۔

- - - - - - - - - -

قدرِ ایاز

کرنیلوں کو رہنے کے لیے اکثر خاصے عمدہ "سی" کلاس بنگلے ملتے ہیں۔ مجھے خوش قسمتی سے ایک ایسا بنگلہ مل گیا جو اپنی کلاس میں بھی انتخاب تھا، یعنی مجھے کرنیلوں میں وہ امتیاز حاصل نہ تھا جو میرے بنگلے کو بنگلوں میں تھا۔ بوڑھے بیروں سے روایت تھی کہ ولسن روڈ کا یہ لاشریک بنگلہ وِلسن صاحب نے خاص طور پر اپنے لیے بنوایا تھا، یعنی موصوف نے اس کی تعمیر میں چھاؤنی کے کچھ دوسرے بنگلوں کا خون بھی شامل کر دیا تھا۔

یہ بنگلہ کم وبیش دو ایکڑ قطعہ زمین پر واقع تھا، یعنی قسام ازل ہی نے اسے خاصا شاہانہ طول وعرض بخشا تھا۔ عمارت کے سامنے وسیع چمن تھا۔ جس کے حاشیے پر مہندی کی گہری سبز باڑ کے سر پر نیزوں اونچے سرو اور سفیدے کے پیڑ لہلہاتے تھے۔ چمن میں جا بجا سرخ وسپید گلاب کے پودے جن کے پھولوں میں گمنام مالیوں اور میموں کی پرورش اور پیار کا رنگ جھلکتا تھا۔ بنگلے کے دونوں پہلو گلزار تھے اور پائیں باغ تو ایک نہایت ہی دلربا سی سیر گاہ تھی جس کی وسعت میں ہمارے فرنگی پیش رُو اپنی میموں کی کمر میں بازو ڈالے گُل گشت کیا کرتے تھے۔ عمارت کے اندر بیٹھنے، کھانے اور مطالعے کے علاوہ چار سونے کے کمرے تھے اور ہر خواب گاہ کے ساتھ احتراماً ڈریسنگ روم اور غسل خانہ بھی ملحق کر دیا گیا تھا۔ اگرچہ ان چھوٹے کمروں کا ایک اپنا اندازِ تکبر بھی تھا کہ ان میں دوسری اشیاء کے علاوہ قد آدم آئینے اور بجلی کے سرکاری حمام بھی لگے ہوئے تھے جو ہر غسل خانے کا نصیب نہیں۔

الغرض ہمارے بنگلے کا مزاج ہر زاویے سے امیرانہ تھا۔ مقابلے میں ہمارے اثاثے کے تیور ہر چند کہ خاکسارانہ تھے، تاہم اپنے مکان کی شان کے پیشِ نظر ہم نے

جوں توں کر کے ہر کمرے کے لیے ایک قالین یا دری پیدا کر لی۔ اگرچہ اس کارِ خیر کا بیشتر اجر مقامی کباڑیے کو ملا۔ علاوہ ازیں مناسب فرنیچر بھی حاصل کر لیا۔ کچھ اپنا، کچھ ایم۔ای۔ایس ۱ کا۔ کھانے کے کمرے میں کرائے کا ریفریجریٹر بھی رکھ دیا جو خریدے ہوئے ریفریجریٹروں سے کسی طرح بھی مختلف نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ ضعفِ پیری سے اس کا ذوقِ برودت کسی قدر ست ہو گیا تھا بہر حال یہ ہمارے ریفریجریٹر کا اندرونی معاملہ تھا۔

ہمارے گول کمرے میں لیفٹیننی کے زمانے کا ریڈیو تو تھا ہی جو نئے ریشمی غلاف میں اچھا خاصا کم عمر نظر آتا تھا—— شہر میں ٹیلی ویژن آیا تو ہم ایک ٹیلی ویژن سیٹ بھی لے آئے جسے دیکھ کر کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ قسطوں پر خریدا گیا ہے۔ الغرض ہمیں نہیں تو ہمارے ملنے والوں کو ہماری فارغ البالی کا رشک اور احساس ہوتا تھا۔ بلکہ ہمارے بچوں نے بھی اس مصنوعی فارغ البالی کی مرصع جالی کے پیچھے کبھی نہ جھانکا تھا اور جالی کے فرنٹ ویو پر ناز کرنے میں حق بجانب تھے اور کرتے تھے۔

سلیم میاں جو ابھی میٹرک کے امتحان سے فارغ ہوئے تھے، دوسرے کرنیل زادوں کی طرح اور ان کے ہمراہ دن بھر بے فکری سے بیڈمنٹن کھیلتے اور سرِ شام ہی دوستوں کے ساتھ ٹیلی ویژن کے سامنے جم جاتے۔ کیا مجال جو کوئی غیر اس مشاہدے میں مخل یا شریک ہو، سوائے اس کے کہ ہمارا بوڑھا ملازم علی بخش ان کی تواضع کے لیے کمرے میں خاموشی سے داخل اور خارج ہوتا رہتا۔ علی بخش کو یوں بھی سلیم سے اُنس تھا کہ سلیم اسی کے ہاتھوں پلا تھا۔ ایک دن میں اپنے مطالعے کے کمرے میں بیٹھا تھا کہ علی بخش خلافِ معمول رونی صورت بنائے داخل ہوا۔ وجہ گرانی پوچھی تو بولا: ”سلیم صاحب نے ڈانٹا ہے۔ کہتے ہیں بدتمیز ہو، گنوار ہو، دیہاتی ہو، میں نے ارشادات کی شانِ نزول پوچھی تو بولا: ”کل سلیم میاں کی غیر حاضری میں ان کے ایک نئے دوست امجد صاحب آئے اور باہر برآمدے ہی میں آرام کرسی پر بیٹھ

۱۔ ملٹری انجینئرنگ سروس۔

گئے۔ میں نے ان کے کہنے پر انھیں ٹھنڈے پانی کا گلاس پیش کیا۔ کافی دیر سلیم کا انتظار کرتے رہے، لیکن آخر مایوس ہو کر چل دیے۔ بعد میں سلیم صاحب کو بتایا تو برس پڑے۔" کہنے لگے، ""انھیں گول کمرے میں صوفے پر کیوں نہ بٹھایا؟ ریفریجریٹر سے نکال کر کوکا کولا کیوں نہ پیش کیا؟ اب امجد سمجھے گا کہ ان لوگوں کو تواضع کا سلیقہ نہیں، دیہاتی ہیں، جنگلی ہیں، اور پھر جو منہ میں آیا کہ دیا۔"

علی بخش کی داستانِ غم ختم ہوئی تو سلیم میاں بھی آگئے۔ علی بخش کے چہرے پر شکایت لکھی ہوئی دیکھی، تو اپنے دل پر لکھی ہوئی شکایت بیان کرنے لگے۔ ہم نے سکون سے یہ قصہ بھی سنا۔ طرفین کے بیانوں سے واضح تھا کہ تنازعہ بہت خفیف ہے اور یہ کہ اس دو طرفہ طوفان کا حدود اربعہ ایک چائے کی پیالی میں سما سکتا ہے۔ علی بخش اس لیے ناخوش تھا کہ اسے دیہاتی کہا گیا تھا اور سلیم میاں اس بات پر برہم تھے کہ علی بخش کی غلطی کی وجہ سے امجد نے انھیں دیہاتی سمجھا ہو گا۔ ہمارے نزدیک دیہاتی ہونا یا سمجھا جانا ایسی قباحت نہ تھی۔ چنانچہ ہم نے ہنسی ہنسی میں دیہاتی پن کے فضائل بیان کرنا شروع کیے اور اس بلاغت کے ساتھ کہ سلیم اور علی بخش دونوں مسکرا دیے اور باہم راضی ہو گئے۔ باتوں باتوں میں ہم انھیں ایک دیہاتی کا قصہ سنانے لگے۔

""ایک تھا دیہاتی لڑکا جو اپنے گاؤں سے پرائمری پاس کرنے کے بعد ایک شہر کے ہائی سکول میں جا داخل ہوا۔ اپنے گاؤں میں تو وہ چھوٹا موٹا چودھری یا چودھری کا بیٹا تھا لیکن تھا ٹھیٹھ دیہاتی۔ پہلے دن کلاس میں گیا، تو ننگے سر پر صافہ باندھ رکھا تھا۔ بدن پر کرتا اور تہمد اور پاؤں میں پوٹھوہاری جوتا۔ ماسٹر جی نے شلوار پہننے کو کہا، تو دھیمی آواز میں بولا او خدایا! شلوار تو لڑکیاں پہنتی ہیں۔"

سلیم میاں یہ سن کر کھلکھلا اٹھے اور بولے:

""سچ مچ پکا پینڈو تھا۔۔۔ مگر ابا جان! وہ پتلون نہیں پہنتا تھا؟"

میں نے کہا: "بیٹا! یہ آج سے چالیس برس پہلے کی بات ہے۔ ان دنوں اگر ماسٹر جی خود بھی پتلون پہن لیتے، تو شہر کے کتے انھیں ولایت پہنچا آتے۔"

سلیم، میری بات پوری طرح سمجھے بغیر ہنس دیے۔ بوڑھا علی بخش پوری طرح سمجھ کر مسکرایا۔ ہم نے کہانی جاری رکھی:

"ان دنوں پتلون پوش خال خال ہی نظر آتے تھے۔ مثلاً سارے سکول میں ایک سیکنڈ ماسٹر صاحب تھے جو سوٹ پہنتے تھے۔ لڑکے انھیں جنٹل مین[1] کہا کرتے تھے۔ لاہور میں تعلیم پائی تھی۔ وہیں کے رہنے والے تھے۔ ہر فقرے میں دو تین لفظ انگریزی کے بولتے تھے اور لڑکے رشک سے مرنے لگتے تھے۔ آدمی خوش مزاج تھے۔ ہاکی کے کھلاڑی تھے اور شکار کے شوقین۔ ایک دفعہ دسمبر میں شکار کرتے کرتے اسی دیہاتی لڑکے کے گاؤں جا نکلے۔ رات ہو رہی تھی۔ آپ نے اسی کے ہاں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا اور ان کے دروازے پر جا دستک دی۔ لڑکے نے اچانک ماسٹر جی کو گھر کے دروازے پر دیکھا، تو ایک لمحے کے لیے چکرا سا گیا۔ ماسٹر جی نے کئی دفعہ مذاق میں کہا تو تھا کہ ہم ایک دن چھوٹے چودھری کے مہمان بنیں گے ـــــ ماسٹر جی اسے چھوٹا چودھری بھی مذاقاً ہی کہتے تھے ـــــ لیکن چودھری کو توقع تھی کہ ماسٹر جی مذاق کو مذاق کی حد تک ہی رکھیں گے، مگر آج وہ حد پھلانگ کر اس کے روبرو آ کھڑے ہوئے تو چھوٹے چودھری کو میزبانی کے بغیر چارہ نہ تھا۔

یہ نہیں کہ چھوٹا چودھری یا اس کے گھر والے مہمان نواز نہ تھے، انھیں صرف اس بات کا یقین نہیں تھا کہ ان کی مہمان نوازی ماسٹر جی کو موافق بھی آئے گی یا نہیں۔ بہرحال انھوں نے اپنی تواضع کی ابتدا کی۔ چھوٹا چودھری اور اس کا بڑا بھائی ماسٹر جی کو بصد تعظیم اپنی چوپال میں لے گئے۔ چوپال کے دو حصے تھے۔ ایک میں گھوڑی بندھی تھی دوسرے کے عین مرکز میں آتشدان تھا جس کی آگ کے شعلے اور دھواں بیک وقت بلند ہو کر چوپال میں روشنی اور تاریکی پھیلا رہے تھے۔ آتشدان

۱۔ لفظی معنے شریف آدمی۔ یہاں مراد ہے فیشن ایبل آدمی۔

کے اردگرد خشک گھاس کا نرم اور گرم فرش تھا جسے مقامی بولی میں ستھر کہتے تھے۔ گاؤں کے بیس بائیس آدمی ستھر پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ ماسٹر جی داخل ہوئے تو سب کھڑے ہو گئے۔ ماسٹر جی کو "آؤ جی خیر نال" کہا۔ ہر ایک نے ان سے مصافحہ کیا۔ ہر ایک نے انکے بال بچوں کی خیریت پوچھی۔ ماسٹر جی نے چھوٹتے ہی ذرا شرما کر کہہ دیا کہ ابھی بال بچوں کی نوبت نہیں آئی لیکن ان نامولود برخورداروں کی خیریت بہرحال ہر ملاقاتی نے پوچھی کہ یہی ان کی تواضع کی ترکیب تھی۔ چونکہ ماسٹر جی نے پتلون پہن رکھی تھی لہٰذا فرش پر بٹھانے کی بجائے ان کے لیے رنگیلی چارپائی بچھا دی۔

سلیم حیران ہو کر بولے: "ابا جان ان میں اتنی عقل نہیں تھی کہ ان کو کرسی دے دیتے؟"

میں نے کہا: "بیٹا! عقل تو تھی، کرسی نہ تھی۔"

سلیم نے فیصلہ کن انداز میں کہا: "اگر کرسی نہ تھی تو چودھری کس بات کے تھے؟"

میں نے کہا: "ایک تو وہ چودھری ذرا چھوٹی قسم کے تھے دوسرے گاؤں میں چودھری پن کی نمائش کرسیوں سے نہیں کی جاتی۔" سلیم دیہاتیوں کی کوئی غلطی یا کمزوری پکڑنے پر تلا ہوا تھا۔ بولا: "مگر کوئی گول کمرے میں بھی گھوڑی باندھتا ہے؟"

میں نے سلیم کو سمجھایا: "اگر گھوڑی کے لیے کوئی علیحدہ مستطیل کمرہ نہ ہو، تو پھر وہ بھی گول کمرے ہی میں رہتی ہے۔ علاوہ ازیں گاؤں کے کمرے اتنے گول بھی نہیں ہوتے!" سلیم طنز کو پا گیا اور بولا: "گول کمرہ تو ویسے نام پڑ گیا ہے۔ ہمارا اپنا گول کمرہ بھی تو چوکور ہے، مگر بات یہ ہے کہ ڈرائنگ روم میں گھوڑے گدھے کا کیا کام؟" میں نے ہنس کر کہا:

"بیٹا! دیہاتی لوگ اتنے مہذب نہیں ہوتے کہ ڈرائنگ روم میں کتے لے آئیں۔ وہ گھوڑوں ہی سے گزارہ کر لیتے ہیں۔" علی بخش مسکرایا۔ سلیم کسی قدر چکرایا لیکن کہانی بہرحال اشتیاق سے سن رہا تھا۔ بولا پھر کیا ہوا؟

"پھر گاؤں کا نائی ماسٹر جی کے پاؤں دابنے لگا۔ ایک نوکر دوڑ کر گیا کہ ماسٹر جی کے لیے تازہ مکئی کے بھٹے بھنوا کر لائے۔"

سلیم جھٹ بول اٹھے: "ابا جان! مکئی کے بھٹے تو پک نک پر کھائے جاتے ہیں۔ گھر میں تو چائے پلائی جاتی ہے، وہ لوگ اتنی بات بھی نہ جانتے تھے۔"

میں نے کہا: "گھر میں پکنک منانے کی غلطی دیہاتیوں سے اکثر ہو جاتی ہے۔" بہرحال ماسٹر جی نے خود ان کی اصلاح کر دی اور بھٹے کا نام سن کر کہنے لگے۔ "یہ تکلف نہ کریں۔ ہو سکے تو ایک پیالی چائے پلا دیں۔ ذرا سردی بھی ہے۔"

سلیم نے فوری تائید کی۔ "بات بھی ٹھیک تھی۔ وقت جو چائے کا تھا"۔ میں نے کہا۔ "بات ٹھیک تھی بشرطیکہ ان کے گھر چائے بھی ہوتی۔"

اس مقام پر سلیم میاں تیزی سے سوال کرنے لگے اور ہماری کہانی نے مکالمے کی شکل اختیار کر لی۔ چنانچہ فوراً بولے:

"تو کیا ان کے گھر میں چائے ختم ہو گئی تھی؟"

"نہیں بیٹا! کبھی شروع ہی نہیں ہوئی تھی۔ ان دنوں چائے ابھی دیہات میں نہیں پہنچی تھی۔"

"تو کیا انھوں نے مہمان سے صاف کہُ دیا کہ ہمارے پاس چائے نہیں ہے؟ کتنی شرم کی بات ہے!"

میں نے کہا: "بھئی میرے خیال میں پہلے تو گھر میں چائے کا نہ ہونا شرم کی بات نہیں۔ دوسرے انھوں نے مہمان کی خاطر چائے کے لیے دوڑ دھوپ شروع کر

دی اور آخر مقامی حکیم کے گھر سے چائے مل بھی گئی۔ ان دنوں چائے صرف مریضوں کو پلائی جاتی تھی" سلیم نے لمبا سانس لیا اور بولا "چلو شکر ہے چائے تو ملی"
میں نے کہا۔ "ہاں چائے تو مل گئی لیکن پھر ایک عجیب سوال پیدا ہو گیا۔"

"یہی نا کہ چائے کے ساتھ کھانے کو کیا دیا جائے؟ وہاں تو لے دے کے مکئی کے بھٹے ہی تھے۔"

"نہیں بیٹے! یہ بات نہ تھی۔ سوال ذرا بنیادی نوعیت کا تھا اور وہ یہ کہ چائے بنائی کیسے جائے!"

سلیم نیم وحشت کے عالم میں میرا منہ تکنے لگا اور بولا: "ابا جان چائے تو ہمارا جمعدار بھی بنا سکتا ہے اور دن بھر پیتا رہتا ہے۔ کیا وہ اتنے ہی اناڑی تھے؟"

میں نے کہا: "بھئی وہاں چائے پینے پلانے کا ہنر پہنچا ہی نہ تھا۔ وہاں لسی کا رواج تھا اور اس ہنر میں وہ یکتا تھے۔"

"تو کیا ماسٹر جی کو آخر لسی پلا دی؟"

"نہیں پلائی تو چائے ہی تھی، لیکن وہ ایسی کامیاب چائے نہ تھی"

"یعنی چائے کی لسی بنا دی؟"

"ہاں بیٹا، کچھ ایسا ہی ذائقہ ہو گا۔ چھوٹے چوہدری کا کہنا ہے کہ ماسٹر جی نے ایک گھونٹ پیا اور پیالی رکھ دی۔"

"تو چودھری شرم سے غرق نہ ہو گیا؟"

"نہیں ایسا حادثہ تو نہ ہوا البتہ چودھری کو اس بات کا رنج بہت ہوا کہ ماسٹر جی کی فرمائش پوری نہ کی جا سکی۔ بہرحال انھوں نے کچھ تلافی رات کے کھانے پر مرغ کے سالن سے کر دی۔"

سلیم نے کسی قدر شرارتاً کہا "ابا جان سالن کھانے کے بعد ماسٹر جی کی صحت پر کوئی فوری اثر تو نہ پڑا؟"

میں نے کہا: "ہاں بڑا صحت افزا اثر پڑا۔ ماسٹر جی نے پیٹ بھر کر کھایا اور ان کے چہرے پر رونق آگئی۔"

"پھر؟" "پھر ماسٹر جی کے لیے بستر لگا دیا گیا۔ چودھری نے ان کے لیے اکلوتی ریشمی رضائی نکلوائی اور سفید جھالر والا تکیہ بھی جس کے غلاف پر بارہ سنگے کی تصویر کڑھی ہوئی تھی۔ بے شک تکیے میں لچک کی نسبت اکڑ زیادہ تھی اور ماسٹر جی کو اسے سر کے نیچے فٹ کرنے میں کچھ دقت بھی پیش آئی لیکن آرام سے سو گئے۔ صرف ایک مرتبہ آدھی رات کے قریب گھوڑی کے کھانسنے سے ذرا انگریزی میں بڑ بڑا کر جاگ اٹھے لیکن برابر ہی چودھری اور اس کا نوکر سو رہے تھے۔ انھوں نے گھوڑی کو چارہ اور ماسٹر جی کو دلاسا دیا اور پھر صبح تک کوئی قابل ذکر واقعہ نہ ہوا۔"

"ابا جان صبح ہوتے ہی ماسٹر جی تو بھاگ نکلے ہوں گے؟"

"نہیں تو۔ وہ اطمینان سے جاگے، پہلے انھیں ہرے بھرے کھیتوں کی سیر کرائی گئی۔ پھر انھوں نے غسل کیا۔"

"غسل بھی بیٹھک ہی میں کیا ہوگا؟"

"نہیں بیٹا بیٹھک میں نہیں، مسجد میں۔"

"مسجد میں؟" سلیم نے حیرت سے کہا: "خانہ خدا کو غسل خانہ بنا دیا؟"

"بھئی گاؤں میں اکثر لوگ مسجد کے غسل خانوں ہی میں نہاتے ہیں اور بظاہر اللہ تعالیٰ کو اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں۔ دیہاتی گھروں میں ہر کام کے لیے علٰحدہ خانے کم ہی ہوتے ہیں۔"

سلیم کان پر ہاتھ رکھ کر بولے: "خدا اس دیہاتی زندگی سے بچائے۔ ابا

جان !" اچھا ہوا آپ فوج میں آگئے، ورنہ ہم بھی چھوٹے چودھری کی طرح مویشیوں کے ساتھ سو رہے ہوتے اور مسجد میں جا کر نہاتے۔" "لیکن چھوٹا چودھری اس زندگی سے بھی ناخوش نہ تھا۔" "ابا جان !" اس نے کبھی کوئی بنگلہ اندر سے دیکھا تھا؟" "میرا خیال ہے نہیں" "تو پھر وہ ناخوش کس بات سے ہوتا۔ انگریزی کہاوت ہے کہ لاعلمی بھی نعمت ہے۔" میٹرک کا امتحان دینے کے لیے سلیم میاں نے یہ کہاوتیں تازہ تازہ یاد کی تھیں۔ ہم نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا: "کہاوت تو تمھاری ٹھیک ہی کہتی ہے"۔ "مگر ابا جان ! بے چارے ماسٹر جی کا کیا بنا؟" "بنا یہ کہ ماسٹر جی نے غسل کے بعد ناشتا کیا اور پھر رخصت ہو گئے۔" ناشتا ؟ "چودھری کے گھر کارن فلیک تھے؟" "کارن فلیک تو نہ تھے، البتہ جو کچھ دال دلیا تھا، غریب نے حاضر کر دیا"۔ "ابا جان ! اس کے بعد چھوٹا چودھری تو سکول میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہا ہو گا۔" "نہیں بیٹا، سکول تو وہ اسی منہ کے ساتھ گیا اور شہری لڑکوں نے اس سے کچھ مذاق بھی کیا۔۔۔ مگر وہ مگن رہا۔" "چودھری کی جگہ میں ہوتا تو شرم سے مر جاتا۔" "مگر چودھری تو جیتا رہا بلکہ خاموشی سے پڑھتا بھی رہا اور آخر کار میٹرک پاس کر کے لاہور کالج میں چلا گیا۔" "وہ کالج میں بھی گیا؟ کیا ان کے پاس اتنے پیسے تھے؟" "پیسے تو کم ہی تھے، مگر انھوں نے تھوڑی سی زمین بیچ دی۔"

"مگر تھوڑی سی زمین سے کیا بنتا ہے! کالج میں رہ کر کھانا ہوتا ہے۔ کچھ پہننا ہوتا ہے۔ کیا وہ مکئی کے بھٹے کھاتا تھا؟ کیا وہ تہمد باندھتا تھا؟"

"بس گزارہ کر لیتا تھا" "گزارہ ہی کرتا رہا یا کچھ پڑھ بھی گیا؟"

"ہاں کچھ پڑھ بھی گیا۔" "پھر؟"۔

"پھر جیسا ان لوگوں کا دستور تھا، فوج میں بھرتی ہو گیا۔"

"پھر تو آپ اسے جانتے ہوں گے۔ کیا وہ آپ کے ماتحت کام کرتا ہے؟"

"ماتحت تو نہیں مگر جانتا ضرور ہوں"۔ "تو ابا جان ! اسے بلائیے نا کبھی۔ ہم

چھوٹے چودھری کو دیکھیں گے۔"

"دیکھیں گے؟ وہ کوئی تماشا تو نہیں۔ سلیم میاں"۔

"ابا جان! بلائیے نا چھوٹے چودھری کو۔ ہم بالکل نہیں ہنسیں گے۔"

"سچ؟"

"بالکل سچ!"

"تو پھر آؤ ملو چھوٹے چودھری سے۔" اور یہ کہ کر میں نے سلیم کی طرف بازو پھیلا دیے۔ سلیم ایک لمحے کے لیے مبہوت کھڑا مجھے دیکھتا رہا پھر یہ کہ کر مجھ سے لپٹ گیا۔

"ابا جان! آپ؟"

سلیم اور علی بخش دونوں کی آنکھیں نم تھیں اور دونوں کی آنکھوں میں ایک دیہاتی کے لیے محبت کی چمک تھی۔ ایاز اپنے اصل لباس میں بھی ایسا معیوب نظر نہ آتا تھا۔

(بزم آرائیاں از کرنل محمد خاں)

سوالات

۱۔ مصنف کو کس قسم کا بنگلہ ملا تھا؟

۲۔ سلیم میاں نے علی بخش کو کیوں ڈانٹا؟

۳۔ گاؤں کی چوپال کا نقشہ اپنے الفاظ میں کھینچیے۔

۴۔ چودھری نے ماسٹر صاحب کی چائے کی فرمائش کس طرح پوری کی؟

۵۔ سبق کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

۶۔ اس سبق کا مرکزی خیال تحریر کیجیے۔

۷۔ مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کے معانی لکھیے اور انھیں جملوں میں استعمال کیجیے۔

قسّامِ ازل ۔ ضعفِ پیری ۔ مخل ہونا۔ قباحت۔ کارِ خیر۔ خلافِ معمول۔ برہم ۔ ملحق۔

۸۔ سبق "قدرِ ایاز" سے چن کر کچھ جملے کالم نمبر۱ میں لکھے گئے ہیں۔ انھیں کالم نمبر۲ میں دیے ہوئے مناسب جملوں سے مکمل کیجیے۔ جوابی کالم میں کالم نمبر۱ کے جملے کے سامنے کالم نمبر۲ کے صحیح جملے کا صرف حرفی نمبر درج کیجیے۔

کالم نمبر۱	کالم نمبر۲	جوابی کالم
(۱) کرنل صاحب کا بنگلہ کم و بیش	(الف) ہم ایک ٹیلی ویژن سیٹ بھی لے آئے	
(۲) مجھے خوش قسمتی سے ایسا بنگلہ مل گیا جو	(ب) ہماری فارغ البالی کا رشک آور احساس ہوتا تھا۔	
(۳) شہر میں ٹیلی ویژن آیا تو	(ج) دو ایکڑ قطعہ زمین پر واقع تھا۔	
(۴) الغرض ہمیں نہیں تو ہمارے ملنے والوں کو	(د) آخر مایوس ہو کر چلے گئے۔	
(۵) کافی دیر تک سلیم کا انتظار کرتے رہے لیکن	(ی) اپنی کلاس میں بھی انتخاب تھا۔	

وہ حرف جو دو اسموں یا دو جملوں کو آپس میں ملاتا ہے۔ حرفِ **عطف** کہلاتا ہے۔ مثلاً امیر و غریب ، حامد اور محمود میں "و" اور "اور" حروفِ عطف ہیں۔ آپ اس سبق کے دوسرے پیرے میں ان مرکبات اور جملوں کی نشاندہی

کیجیے جن میں حروف عطف استعمال ہوئے ہیں۔

۹۔ نیچے کالم نمبرI میں دیے ہوئے الفاظ کے متضاد کالم نمبرII میں بے ترتیبی سے لکھے گئے ہیں۔ جوابی کالم میں ہر لفظ کے سامنے صحیح متضاد کا حرفی نمبر تحریر کیجیے۔

کالمI	کالم II	جوابی کالم
۱۔ خاص	(الف) مصروف	
۲۔ برودت	(ب) نفی	
۳۔ مخالف	(ج) انتہا	
۴۔ خلافِ معمول	(د) غنی	
۵۔ داخل	(ہ) بنجر	
۶۔ فارغ	(و) موافق	
۷۔ ابتدا	(ز) خارج	
۸۔ اثبات	(ح) حدت	
۹۔ محتاج	(ط) عام	
۱۰۔ زرخیز	(ی) حسبِ معمول	

مکاتیبِ غالب

مکتوب (۱)

منشی ہرگوپال تفتہ کے نام

صاحب!

تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے. اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت درپیش آئے۔ شعر کہے، دیوان جمع کیے۔ اسی زمانے میں ایک اور بزرگ تھے کہ وہ ہمارے تمھارے دوست دلی تھے۔ اور منشی نبی بخش ان کا نام اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا، نہ وہ اشخاص، نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط، نہ وہ ارتباط بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہٖ مثل پہلے جنم کے ہے، یعنی ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا، اس کا جواب مجھ کو آیا اور ایک خط تمھارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال و متخلص بہ تفتہ ہو، آج آیا۔ اور میں جس شہر میں ہوں اس کا نام بھی دلی اور محلے کا نام بلی ماروں کا محلہ ہے۔ لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ ڈھونڈھنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر، کیا غریب، کیا اہل حرفہ۔ اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔ اب پوچھو کہ تو کیونکر مسکن قدیم میں بیٹھا رہا؟ صاحب بندہ! میں حکیم محمد حسن خان مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرائے کو رہتا ہوں اور یہاں قریب کیا بلکہ دیوار بہ دیوار ہیں گھر حکیموں کے اور وہ نوکر ہیں راجہ نرندر سنگھ بہادر والئ پٹیالہ کے۔ راجہ نے صاحبان عالیشان سے عہد لے لیا تھا کہ بروقت غارت دہلی یہ لوگ بچ رہیں۔ چنانچہ بعد فتح، راجہ کے سپاہی یہاں آ بیٹھے

اور یہ کوچہ محفوظ رہا، ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں؟ مبالغہ نہ جاننا، امیر غریب سب نکل گئے، جو رہ گئے تھے وہ نکالے گئے، جاگیردار، پنشن دار، دولتمند، اہل حرفہ کوئی بھی نہیں ہے۔ مفصل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمان قلعہ پر شدت ہے اور باز پرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں، مگر وہ نوکر جو اس ہنگام میں نوکر ہوئے ہیں اور ہنگامے میں شریک رہے ہیں۔ میں غریب شاعر دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں۔ خواہی اس کو نوکری سمجھو، خواہی مزدوری جانو۔ اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں میں نے دخل نہیں دیا۔ صرف اشعار کی خدمت بجالاتا رہا اور نظر اپنی بے گناہی پر کر شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے، مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات پائی نہیں گئی لہٰذا طلبی نہیں ہوئی ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں، میری کیا حقیقت تھی۔ غرض کہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں، دروازے سے باہر نکل نہیں سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے، شہر میں ہے کون جو آوے؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست یازدہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر سنہ ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال مجھ کو نہیں معلوم، بلکہ ہنوز ایسے امور کی طرف حکام کو توجہ بھی نہیں۔ دیکھیے انجام کار کیا ہوتا ہے۔ یہاں باہر سے اندر کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا۔ تم زنہار یہاں کا ارادہ نہ کرنا۔ ابھی دیکھا چاہیے مسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں۔ بہرحال منشی صاحب کو میرا سلام کہنا اور یہ خط دکھا دینا۔ اس وقت تمہارا خط پہنچا اور اسی وقت میں نے یہ خط لکھ کر ڈاک کے ہرکارے کو دیا۔

(شنبہ ۵ دسمبر ۱۸۵۷ء)

مکتوب (۲)

میر مہدی حسین مجروح کے نام

میاں کس حال میں ہو؟ کس خیال میں ہو؟

کل شام کو میرن صاحب روانہ ہوئے، یہاں ان کے سسرال میں قصے کیا کیا نہ ہوئے۔ ساس اور سالیوں نے اور بی بی نے آنسوؤں کے دریا بہا دیے۔ خوشدامن صاحبہ بلائیں لیتی تھیں۔ سالیاں کھڑی ہوئی دعائیں دیتی تھیں، بی بی مانند صورت دیوار چپ، جی چاہتا ہے چیخنے کو، مگر ناچار چپ۔ وہ تو غنیمت تھا کہ شہر ویران، نہ کوئی جان نہ پہچان، ورنہ ہمسائے میں قیامت برپا ہو جاتی، ہر ایک نیک بخت اپنے گھر سے دوڑی آتی۔ امام ضامن علیہ السلام کا روپیہ بازو پر باندھا گیا، گیارہ روپے خرچ راہ دیے۔ مگر ایسا جانتا ہوں کہ میرن صاحب اپنے جد کی نیاز کا روپیہ راہ ہی میں اپنے بازو پر سے کھول لیں گے اور تم سے صرف پانچ روپے ظاہر کریں گے۔ اب سچ جھوٹ تم پر کھل جائے گا۔ دیکھنا، یہی ہو گا کہ میرن صاحب تم سے بات چھپائیں گے۔ اس سے بڑھ کر ایک بات اور ہے، اور وہ محل غور ہے۔ ساس غریب نے بہت سی جلیبیاں اور تودہ قلاقند ساتھ کر دیا ہے اور میرن صاحب نے اپنے جی میں یہ ارادہ کر لیا ہے کہ جلیبیاں راہ میں چٹ کریں گے اور قلاقند تمھاری نذر کر کر تم پر احسان دھریں گے، "بھائی میں دلی سے آیا ہوں قلاقند تمھارے واسطے لایا ہوں" زنہار نہ باور کیجیو، مال مفت سمجھ کر لے لیجیو۔ کون گیا ہے؟ کون لایا ہے؟ کلو، ایاز کے سر پر قرآن رکھو، کلیان کے ہاتھ گنگا جلی دو، بلکہ میں بھی قسم کھاتا ہوں کہ ان تینوں میں سے کوئی نہیں لایا۔ واللہ میرن صاحب نے کسی سے نہیں منگایا۔ اور سنو! مولوی مظہر علی صاحب لاہوری دروازے کے باہر صدر بازار تک ان کے پہنچانے کو گئے، رسم مشایعت عمل میں آئی۔ اب کہو بھائی، کون برا اور کون اچھا ہے؟ میرن صاحب کی نازک مزاجیوں نے کھیل بگاڑ رکھا ہے۔ یہ لوگ تو

ان پر اپنی جان نثار کرتے ہیں، عورتیں صدقے جاتی ہیں، مرد پیار کرتے ہیں۔

"مجتہد العصر، سلطان العلماء" مولانا سرفراز حسین کو میری دعا کہنا اور کہنا کہ حضرت ہم تم کو دعا کہیں اور تم ہم کو دعا دو، میاں کس قصے میں پھنسا ہے؟ فقہ پڑھ کر کیا کرے گا؟ طب و نجوم و ہیئت و منطق و فلسفہ پڑھ، جو آدمی بنا چاہے۔

(مئی ۱۸۶۱ء)

مکتوب (۳)

یوسف مرزا کے نام

یوسف مرزا! کیونکر لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا اور اگر لکھوں تو پھر آگے کیا لکھوں، کہ اب کیا کرو، مگر صبر۔ یہ ایک شیوۂ فرسودہ ابنائے روزگار ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں کہ "صبر کرو۔" ہائے، ایک کا کلیجا کٹ گیا ہے اور لوگ اسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ۔ بھلا کیونکر نہ تڑپے گا۔ صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی۔ دعا کو دخل نہیں۔ دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا، پھر باپ مرا۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سروپا کس کو کہتے ہیں تو میں کہوں گا یوسف مرزا کو۔

تمہاری دادی لکھتی ہیں کہ رہائی کا حکم ہو چکا تھا، یہ بات سچ ہے؟ اگر سچ ہے تو جواں مرد، ایک بار دونوں قیدوں سے چھوٹ گیا۔ نہ قیدِ حیات رہی نہ قیدِ فرنگ۔ ہاں صاحب وہ لکھتی ہیں کہ پنشن کا روپیہ مل گیا تھا، وہ تجہیز و تکفین کے کام آیا۔ یہ کیا بات ہے جو مجرم ہو کر ۱۴ برس کو مقیّد ہوا ہو اس کا پنشن کیونکر ملے گا۔ رسید کس سے لی جائے گی۔

مصطفیٰ خان کی رہائی کا حکم ہوا مگر پنشن ضبط۔ ہر چند اس پرسش سے کچھ حاصل نہیں، لیکن بہت عجیب بات ہے، تمہارے خیال میں جو کچھ آئے وہ مجھ کو لکھو۔

دوسرا امر، یعنی تبدل مذہب، عیاذاً باللہ۔ علی کا غلام، کبھی مرتد نہ ہوگا۔ ہاں یہ ٹھیک کہ حضرت چالاک اور سخن ساز اور ظریف تھے، سوچتے ہوں گے کہ ان دموں میں اپنا کام نکالو، اور رہا ہو جاؤ۔ عقیدہ کب بدلتا ہے۔ اگر یہ بھی تھا تو ان کا گمان غلط تھا اس طرح رہائی ممکن نہیں۔

قصہ مختصر، تمہاری دادی کا خط جو تمہارے بھائی نے مجھ کو بھیجا تھا، وہ میں نے تمہارے ماموں کے پاس بھیج دیا۔ ان کی جائداد کی واگزاشت کا حکم ہو تو گیا ہے۔ اگر ان کے بڑے بھائی کے یار، ان کو چھوڑ دیں۔ دیکھیے انجام کار کیا ہوتا ہے۔

مظفر مرزا کو دعا پہنچے۔ تمہارا خط جواب طلب نہ تھا۔ تمہارے چچا کا آغاز اچھا ہے، خدا کرے انجام اسی آغاز کے مطابق ہو۔ ان کا مقدمہ دیکھ کر تمہاری پھوپھی کا اور تمہارا سرانجام دیکھا جائے گا کہ کیا ہوتا ہے۔ ہو گا کیا، اگر جائدادیں مل بھی گئیں تو قرض دار دام دام لے لیں گے۔ رزّاقِ حقیقی پنشن دلوا دے کہ روٹی کا کام چلے۔ جناب میر قربان علی صاحب کو میرا سلام نیاز اور میر کاظم علی کو دعا۔

مرقومہ ۲۷ شوال (۱۹ مئی ۱۸۶۰ء)

مکتوب (۴)

میر مہدی حسین مجروح کے نام

اے جناب میرن صاحب! السّلام علیکم

"حضرت، آداب!"

"کہو صاحب! آج اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی؟"

"حضور! میں کیا منع کیا کرتا ہوں؟ میں نے تو یہ عرض کیا تھا کہ اب وہ تندرست ہو گئے ہیں، بخار جاتا رہا ہے، صرف پیچش باقی ہے، وہ بھی رفع ہو جائے گی۔ میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں، آپ پھر کیوں تکلیف کریں؟"

"نہیں، میرن صاحب! اس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں، وہ خفا ہوا ہو گا، جواب لکھنا ضرور ہے۔"

"حضرت! وہ آپ کے فرزند ہیں، آپ سے خفا کیوں ہوں گے؟"

"بھائی! آخر کوئی وجہ تو بتاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو؟"

"سبحان اللہ! اے لو حضرت! آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے۔"

"اچھا، تم باز نہیں رکھتے، مگر یہ تو کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں؟"

"کیا عرض کروں، سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ اٹھاتا۔ اب میں جو وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جاوے۔ میں اب پنجشنبے کو روانہ ہوتا ہوں میری روانگی کے تین دن بعد آپ خط شوق سے لکھیے گا۔"

"میاں! بیٹھو، ہوش کی خبر لو۔ تمہارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ؟ میں بوڑھا آدمی بھولا آدمی، تمہاری باتوں میں آ گیا اور آج تک اسے خط نہیں لکھا۔ لاحول ولا قوۃ۔"

سنو، میر مہدی صاحب! میرا کچھ گناہ نہیں۔ میرے خط کا جواب لکھو۔ تپ تو رفع ہو گئی، پیچش کے رفع ہونے کی خبر شتاب لکھو، پرہیز کا بھی خیال رکھا کرو۔ یہ بڑی بات ہے کہ وہاں کچھ کھانے کو ملتا ہی نہیں۔ تمھارا پرہیز اگر ہو گا بھی تو "عصمت بی بی از بے چادری" ہو گا۔ حالات یہاں کے مفصل میرن صاحب کی زبانی معلوم ہوں گے۔ دیکھو! بیٹھے ہیں، کیا جانوں حکیم میر اشرف علی میں اور ان میں کچھ کونسل ہو تو رہی ہے۔ پنجشنبہ روانگی کا دن ٹھہرا تو ہے۔ اگر چل نکلیں اور پہنچ جائیں تو ان سے یہ پوچھیو کہ جناب ملکہ انگلستان کی سالگرہ کی روشنی کی محفل میں تمھاری کیا گت ہوئی تھی اور یہ بھی معلوم کر لیجیو کہ یہ جو فارسی مثل مشہور ہے کہ "دفتر را گاؤ خورد" اس کے معنی کیا ہیں؟ پوچھیو اور نہ چھوڑیو، جب تک نہ بتائیں۔

اس وقت پہلے تو آندھی چلی، پھر مینہ آیا، اب مینہ برس رہا ہے۔ میں خط لکھ چکا ہوں، سرنامہ لکھ کر رکھ چھوڑوں گا، جب تُرشّح موقوف ہو جائے گا تو کلیان ڈاک کو لے جائے گا۔

میر سرفراز حسین کو دعا پہنچے۔ اللہ اللہ! تم پانی پت کے "سلطان العلما" اور "مجتہد العصر" بن گئے۔ کہو، وہاں کے لوگ تمھیں "قبلہ و کعبہ" کہنے لگے یا نہیں؟ میر نصیر الدین کو دعا کہنا۔

(جون ۱۸۶۱ء)

(اردوئے معلّی از مرزا اسد اللہ خان غالب)

سوالات

۱۔ غالب اپنے مسکن قدیم میں کیوں کر بیٹھے رہے؟ پہلا خط پڑھ کر تفصیل سے لکھیے۔

۲۔ جرنیلی بندوبست کے دوران میں دہلی کا جو حال غالب نے بیان کیا ہے اسے اپنے الفاظ میں لکھیے۔

۳۔ سسرال والوں نے میرن صاحب کو کس طرح رخصت کیا؟ اس کی کیفیت اپنے الفاظ میں لکھیے۔

۴۔ کیا میرن صاحب واقعی نہیں چاہتے تھے کہ مرزا غالب میر مہدی حسین مجروح کو خط لکھیں؟

۵۔ مندرجہ ذیل عبارات کی تشریح کیجیے:۔

(الف) ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا ----- دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔

(ب) ملازمان قلعہ پر شدت ہے ----- میری کیا حقیقت تھی؟

(ج) یہ ایک شیوۂ فرسودہ ----- کہوں گا یوسف مرزا کو

(د) سنو میر مہدی صاحب ----- زبانی معلوم ہوں گے۔

۶۔ مندرجہ ذیل جملے غالب کے پہلے خط سے چنے گئے ہیں۔ ان میں سے ہر جملے کی خالی جگہ پر کرنے کے لیے چار لفظ دیے گئے ہیں۔ آپ ان چار لفظوں میں سے اس مناسب لفظ سے پُر کیجیے جو غالب نے استعمال کیا ہو۔

(الف) بعد چند ----- کے پھر دوسرا ہم کو ملا۔

(۱) لمحوں (۲) دنوں (۳) مدت (۴) مہینوں

(ب) گھر کے گھر ----- پڑے ہیں۔

(۱) ویران (۲) بے چراغ (۳) غیر آباد (۴) سنسان

(ج) اس فتنہ و ---- میں کسی مصلحت میں مَیں نے دخل نہیں دیا۔

(۱) بغاوت (۲) بے چراغ (۳) آشوب (۵) عذاب

(د) مبالغہ نہ جاننا، امیر ---- سب نکل گئے۔

(۱) وزیر (۲) لوگ (۳) غریب (۴) آدمی

(س) تم ---- یہاں کا ارادہ نہ کرنا۔

(۱) بالکل (۲) زنہار (۳) ہرگز (۴) قطعی

وہ لفظ کہ جب تک اس کے ساتھ کوئی جملہ نہ ملایا جائے، ناتمام رہتا ہے اور کوئی معنی نہیں دیتا "اسمِ موصول" کہلاتا ہے مثلاً شہر میں ہے کون جو آوے۔ وہ ایک جنم تھا جس میں ہم تم دوست تھے۔ ان جملوں میں "جو" اور "جس" اسمِ موصول ہیں۔

۷۔ آپ خط نمبر۲ میں سے اسمائے موصول چن کر اپنی کاپی میں لکھیے۔

۸۔ مندرجہ ذیل واحد الفاظ کے عربی قاعدے کے مطابق جمع اور جمع کے واحد لکھیے۔

حُکّام ۔ قِصّہ ۔ ہُنُود ۔ اُمُور ۔ رسم ۔ اَبناء ۔ علماء ۔ مَکتُوب ۔ ملازمان ۔ مذہب ۔

۹۔ "سخن ساز" میں "ساز" لاحقہ ہے۔ اس لاحقے سے چار الفاظ اور بنایئے۔

۱۰۔ نیچے کالم نمبر I میں کچھ الفاظ درج ہیں اور کالم نمبر II میں قواعد کی اصطلاحات۔ جوابی کالم میں ہر لفظ کے سامنے موزوں اصطلاح کا حرفی نمبر تحریر کر کے بتایئے کہ قواعد کی رُو سے یہ لفظ کیا ہے۔

کالم نمبر۱	کالم نمبر۲	جوابی کالم
۱۔ میرن	(الف) فعلِ مستقبل	
۲۔ اور	(ب) فعلِ نہی	
۳۔ بچ رہیں	(ت) عُرف	

کالم نمبر۱	کالم نمبر۲	جوابی کالم
۴۔ سلطان العلماء	(ج) تخلص	
۵۔ پر	(د) فعل مضارع	
۶۔ مجروح	(ر) لقب	
۷۔ جس	(س) ظرفِ مکاں	
۸۔ رکھ چھوڑوں گا	(ص) حرفِ موصولہ	
۹۔ سسرال	(ہ) حرفِ عطف	
۱۰۔ ارادہ نہ کرنا	(ی) حرفِ جار	

- - - - - - - - - - -

مکاتیبِ نذیر احمد

مکتوب (۱)

(اپنے بیٹے بشیر کے نام)

میں مدراس میں اسماعیل سیٹھ کی کوٹھی کے بالا خانے پر ٹھہرا تھا، رفتہ رفتہ سیٹھ کے ساتھ تعارف زیادہ ہوتا گیا۔ آخر انھوں نے دعوت کا پیام دیا۔ مجھ کو سدا سے دعوت کی چڑ ہے، ٹالنے کے پیرائے میں انکار کیا۔ جب چل چلاؤ قریب آیا تو سیٹھ صاحب نے اس قدر اصرار کیا کہ انکار کرتے نہ بن پڑا۔ دسترخوان پر سیٹھ اور ان کے اعزّہ و اقارب اور ملازم حتیٰ کہ خدمت گار سب بلا امتیاز شریک ہوئے اور انھوں نے میرے خدمت گاروں کو بھی ساتھ بٹھانا چاہا۔ ان کو فی عمرہم[۱] برابر بیٹھنے اور ساتھ کھانے کا اتفاق ہوا نہ تھا، بہت جھجکے، بہت رکے اور سیٹھ صاحب ہیں کہ ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتے لیے چلے آتے ہیں تو چار و ناچار مجھ کو کہنا پڑا۔ "اگر آپ چاہتے ہیں کہ یہ لوگ پیٹ بھر کر کھائیں تو ان کو الگ کھانے دیجیے۔" ایسا ہی ہوا۔ مگر سیٹھوں نے بڑا ہی تعجب کیا کہ یہ کیسے مسلمان ہیں، کھانے میں آقا اور نوکر کا تفرقہ کرتے ہیں؟ اگرچہ میں اس رسم کو اپنے یہاں جاری نہیں کر سکا، تاہم اس واقعے کو استحسان کے ساتھ اکثر یاد کیا کرتا ہوں۔

(۴ جون ۱۸۷۶ء)

(موعظہ حسنہ از مولوی نذیر احمد)

۱۔ اپنی ساری عمر میں

مکتوب (۲)

(اپنے بیٹے بشیر کے نام)

بشیر! ۷ا کا خط پہنچا۔ بندۂ خدا! اتنی دیر مت کیا کرو۔ کیا کفایت شعاری اسی میں منحصر ہے کہ مجھ کو خط لکھنے میں کمی کی جائے۔ میں نے تم کو پہلے بھی لکھا ہے اور اب پھر لکھتا ہوں کہ امتحان کے بھروسے پر مت رہو۔ کسی طرح جماعت میں ترقی کرو اور آگے کو نصیحت پکڑو۔ مدرسے میں کامیابی اور ناموری کے ساتھ پڑھنا یوں تو نہیں ہو گا۔ مدرسے کے علاوہ گھر پر کم از کم تین چار گھنٹے روز دل لگا کر پڑھو گے تو خیر۔ ورنہ کیوں خود حیران ہوتے ہو اور کیوں ہم سب کو حیران کرتے ہو دنیا کی کارروائی کے لائق تم کو لکھنا پڑھنا آ ہی گیا ہے، پس میرے پاس رہ کر قانون یاد کرو اور امتحان دو۔ مدرسے میں پڑھنا منظور ہے تو یاد رکھو! انٹرنس پہلی منزل ہے۔ بھلا کچھ نہ ہو تو بی۔ اے کے خطاب تک تو ہو۔

بشیر! درجہ فضیلت حاصل کرنے کے ہرگز یہ ڈھنگ نہیں جو تمہارے ہیں۔ ہر روز کے سبقوں کا بالالتزام مطالعہ اور پڑھنے کے بعد نظر تدقیق سے ان کو دیکھنا اور ذہن نشین کرنا اور ایک درجہ اعتدال کے ساتھ محنت کا برابر جاری رکھنا شرط ضروری ہے۔ تمہارا یہ حال ہے کہ پہلے ہی امتحان میں یہ تردد کہ پاس ہوئے یا نہیں، تو اگلے امتحان جو کہیں سخت ہیں، کیونکر ان سے عہدہ برآ ہو سکو گے۔ غرض پڑھنا ہے تو پڑھنے کے طور پر پڑھو۔ چاندنی چوک جا نکلے، کہیں عجائب خانے کی سیر کی، کچھ وقت قصے کہانیوں میں ضائع کیا، دو گھڑی رات گئی اور سو رہے، یوں تو پڑھنا نہیں آتا، پڑھنا جب آ سکتا ہے کہ تم ایک ایک منٹ کی قدر کرو اور جہاں تک تندرستی اجازت دے، محنت کرتے رہو۔ تم اب تک مجھ سے صرف عربی پوچھتے تھے، آئندہ ریاضی بھی پوچھا کرو، زیادہ نہیں تو انٹرنس تک تو بتاؤں گا۔ حساب و جبر و مقابلہ کی خامی متوجہ ہو کر نکال ڈالو۔ تاریخ کے واقعات بطور سوال جواب مرتب کرتے جاؤ،

تب امتحان دینے کا مزہ ہے۔ رزی دعا سے کام نہیں چلتا۔ شوق نہیں ورنہ مولوی صاحب کے ہوتے تم کو عربی کا حاصل کرنا کیا دشوار تھا۔ مدرسے کی چیزوں کا حیلہ اور ان میں بھی نقصان۔

(۲۱۔ جنوری، ۱۸۷۷ء)

مکتوب (۳)

(بیوی کے نام)

بیوی صاحب کو سلام کے بعد معلوم ہو۔ یہ بھی ایک وفا کا دستور قرار پا گیا ہے کہ جب کسی کا کوئی عزیز قریب مرجاتا ہے، تو لوگ اس کی ماتم پرسی کیا کرتے ہیں۔ میں تم کو یہ خط اس دستور کے مطابق نہیں لکھتا ہوں کہ مصیبت تنہا تم پر ہی نہیں، مجھ پر بھی ہے۔ میاں بیوی کا عجیب رشتہ ہے کہ مرد وعورت نکاح کے ہو جانے سے دنیا کی سب چیزوں میں شریک ہو جاتے ہیں۔ یہ بات کسی اور رشتے میں نہیں پائی جاتی۔ میرا تمہارا مال مشترک، کھانا پینا مشترک، اولاد مشترک، آبرو مشترک، خوشی مشترک، رنج وغم مشترک۔ اگر وہ لڑکی جیتی تو کیا تمہاری اکیلی کی بیٹی ہوتی؟ نہیں میری تمہاری دونوں کی۔ پس اب اگر مر گئی تو کیا تمہاری اکیلی کی بیٹی مری؟ نہیں، میری تمہاری دونوں کی۔ پھر بھی میں اس کو تسلیم کرتا ہوں کہ تم کو اس سے بڑا قوی تعلق تھا لیکن روحانی تعلق کی وجہ سے شاید جس دن وہ مری ہے، میرا دل خود بخود بے قرار تھا اور میں نے اسی گھبراہٹ میں میاں بشیر کو خط بھی لکھا۔ تاریخ ملا کر دیکھو، غالب ہے کہ خط کی تاریخ اور اس کے مرنے کی تاریخ ایک ہوگی۔

"اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن[1]"

ظہیر، نصیر[2] وغیرہ کے مرنے سے یہ تو بخوبی تجربہ کر چکے کہ موت پر انسان کا کچھ اختیار نہیں چلتا، رہا رنج وہ بھی رفتہ رفتہ کم ہو جاتا ہے۔ میں تم پر الزام نہیں لگاتا، اپنا حال بیان کرتا ہوں کہ نصیر کو کس قدر پیار کرتا تھا۔ اس کی قبر میری آنکھوں کے سامنے ہے اور میں سوتا بھی ہوں، ہنستا بولتا بھی ہوں، دنیا کا کوئی کام مجھ سے نہیں چھوٹا، تو جب ظہیر، نصیر کے رنج کو ہم نے چند سال میں بھلا دیا ہے تو یہ لڑکی بے چاری کے دن کی تھی؟ آخر پھر دنیا اور دنیا کے کام۔ کتابوں میں بہت ٹھیک لکھا ہے کہ دانا اور احمق دونوں صبر کرتے ہیں مگر فرق اتنا ہوتا ہے کہ احمق رو دھو کر چپ کرتا ہے اور دانا شروع سے خدا پر نظر کر کے چپ ہو رہتا ہے۔ غرض صبر تو آخر کرنا پڑے گا، پس کیا فائدہ کہ اپنا ثواب ضائع کریں۔ دل کو مضبوط کر، آنسو پونچھ، سنبھل بیٹھو، خدا ہمارا مالک ہے، اس نے دیا اس نے لے لیا۔ خدا کو ہم سے عداوت نہیں، بیر نہیں۔ جو کچھ وہ کرتا ہے، ہمارے نفع کے لیے کرتا ہے لیکن اپنی کم فہمی کی وجہ سے ہم ان مصلحتوں کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔

دنیا کے انتظام پر نظر کرو تو تندرستی، مال، اولاد، حکومت، شرافت، دینداری، ہزاروں طرح کی نعمتیں ہیں اور یہ نعمتیں خداوند کریم نے اپنی مرضی کے مطابق لوگوں میں تقسیم کی ہیں۔ ہم کو بھی اس نے اپنی رحمتوں میں سے بہت بڑا حصہ عطا فرمایا ہے، تو کیا ہم ٹھیکے دار ہیں کہ خدا کی سب نعمتیں اپنے گھر میں گھسیٹ کر بھر لیں اور پھر اولاد سے بھی خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے، ہم محروم نہیں۔ ان کی عمروں میں خدا برکت دے! ان کو دین و دنیا کی فلاح ہو! کافی ہیں۔ اب زیادہ اولاد لے کر کیا

۱۔ ہم خدا کے ہیں اور اسی طرف پھر جانے والے ہیں یہ آیت نزول مصیبت کے وقت مفید صبر و تسکین ہے
۲۔ دو بیٹوں کے نام

سوالات

۱۔ مولوی نذیر احمد نے مدرسے میں ناموری کے ساتھ پڑھنے کی جو ترکیب بتائی ہے اسے اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۲۔ رجۂ فضیلت حاصل کرنے کی ضروری شرط کیا ہے؟

۳۔ آدمی پر جب کوئی مصیبت آجائے تو اسے کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے؟

۴۔ مولوی صاحب نے اپنے دوسرے خط میں جو قطعہ نقل کیا ہے، اس کا مطلب بیان کیجیے۔

۵۔ سیٹھ اسماعیل نے دعوت کے موقع پر ملازموں اور خدمت گاروں کے ساتھ کیا رویہ اختیار کیا؟

۶۔ مندرجہ ذیل جملوں کی وضاحت کیجیے۔

(الف) میاں بیوی کا عجیب رشتہ ہے کہ مرد و عورت نکاح کے ہو جانے سے دنیا کی سب چیزوں میں شریک ہو جاتے ہیں۔

(ب) لیکن روحانی تعلق کی وجہ سے جس دن وہ مری ہے، میرا دل خود بخود بے قرار تھا۔

(ج) دانا اور احمق دونوں صبر کرتے ہیں مگر فرق اتنا ہوتا ہے کہ احمق رو دھو کر چپ کرتا ہے اور دانا شروع سے خدا پر نظر کر کے چپ ہو رہتا ہے۔

(د) آخر یہ کالبدِ خاکی سدِ سکندر تو نہیں۔

(ہ) اگرچہ میں اس رسم کو اپنے یہاں جاری نہیں کر سکا، تاہم اس واقعے کو استحسان کے ساتھ اکثر یاد کیا کرتا ہوں۔

وہ حرف جو شرط کے موقع پر بولا جائے "حرفِ شرط" کہلاتا ہے۔ مثلاً اگر، جو، جب، چونکہ، چند، گو وغیرہ اور یہ ایک جملے کے پہلے آتے ہیں جس کو "جملہ شرطیہ" کہتے ہیں۔ اس جملے کے بعد دوسرے جملے میں جو حرف لایا جاتا ہے اسے "حرفِ جزا" کہتے ہیں۔ مثلاً تو، تب، اس لیے، لیکن پھر وغیرہ۔ مثال کے طور پر آپ نے دوسرے خط میں یہ جملہ پڑھا ہے "اگر وہ لڑکی جیتی تو کیا تمھاری اکیلی کی بیٹی ہوتی؟" اس جملے میں "اگر" حرفِ شرط ہے اور "تو" حرفِ جزا۔

۷۔ اب مندرجہ ذیل جملوں میں خالی جگہیں حروفِ شرط و جزا سے پُر کیجیے۔

(الف) ---- کسی کا کوئی عزیز قریب مر جاتا ہے ---- لوگ اس کی ماتم پرسی کیا کرتے ہیں۔

(ب) پس ---- مرگئی ---- تمھاری اکیلی کی بیٹی مری؟

(ج) آدمی کو چاہیے کہ ---- اس پر کوئی مصیبت نازل ہو ---- دوسرے بندگانِ خدا کے حال پر نظر کرے۔

(د) اسی طرح رنجوں کے مارے اس کو تحلیل کر ڈالو گی ---- کیا انجام ہو گا۔

(ہ) ---- آپ چاہتے ہیں کہ یہ لوگ پیٹ بھر کر کھائیں ---- ان کو الگ کھانے کو دیجیے۔

۸۔ مندرجہ ذیل الفاظ کا تلفظ اعراب لگا کر واضح کیجیے۔

اعزہ ۔ اقارب ۔ تعارف ۔ تفرقہ ۔ استحسان ۔ تعجب ۔ عاقبت ۔ قاصر ۔ صفت ۔ مدرسہ۔

۹۔ مندرجہ ذیل واحد الفاظ کے جمع لکھیے۔

شریک ۔ احمق ۔ کتاب ۔ بندہ ۔ استاد ۔ درجہ ۔ طالب ۔ غزل ۔

۱۰۔ مندرجہ ذیل جملوں میں خالی جگہ درست جواب کے صرف حرفی نمبر سے پُر کیجیے۔

(i) "دنیا" قواعد کی رو سے ---- ہے۔

(الف) اسمِ نکرہ۔ (ب) اسمِ مشتق ۔ (ج) اسمِ معرفہ۔ (د) اسمِ ضمیر۔

(ii) "عجائب خانہ" قواعد کی رو سے ---- ہے۔

(الف) اسم معرفہ ۔ (ب) اسم موصول ۔ (ج) اسم ظرف مکاں۔ (د) اسمِ مصدر۔

(iii) "پڑھنا" قواعد کی رُو سے ---- ہے۔

(الف) مشتق ۔ (ب) جامد ۔ (ج) مصدر ۔ (د) اسمِ آلہ ۔

(iv) "بشیر" قواعد کی رو سے ---- ہے۔

(الف) اسمِ معرفہ ۔ (ب) عرف ۔ (ج) لقب ۔ (د) خطاب۔

(v) "کرتے ہیں" قواعد کی رو سے ---- ہے۔

(الف) فعل ماضی ۔ (ب) فعل حال ۔ (ج) فعل مضارع ۔ (د) فعل مستقبل

(vi) "کہ" قواعد کی رو سے ---- ہے۔

(الف) حرفِ عطف ۔ (ب) حرف جار ۔ (ج) حرفِ بیاں۔ (د) حرفِ موصولہ

~~~~~~~~~
~~~~~~~~~

مولوی نذیر احمد کی کہانی

میں اور دانی ساڑھے گیارہ بجے مدرسے سے آئے۔ کھانا وانا کھایا، سبق کا مطالعہ کیا اور ایک بجے نکل کھڑے ہوئے۔ مکان کا پتا پوچھتے پچھاتے ڈیڑھ میں پانچ منٹ تھے کہ مولوی صاحب کے دروازے پر جا دھمکے۔ دروازے کی ایک چوکی پر میں اور دوسری پر میاں دانی ڈٹ گئے۔ سامنے ہی کمرہ تھا۔ کمرے کے اندر مولوی صاحب تھے۔ لیکن دروازہ بند تھا۔ اس لیے دکھائی نہ دیتے تھے۔ اب یہ خیال ہوا کہ یہ مولوی صاحب ہی کا مکان ہے یا کسی دوسرے کا۔ اندر زنانہ تو نہیں ہے؟ غرض اسی شش وپنج میں تھے کہ مولوی صاحب کے کمرے کے گھنٹے نے ٹن سے ڈیڑھ بجایا۔ ہم دونوں اٹھے اور دبے پاؤں چوروں کی طرح اندر داخل ہوئے۔ گھر میں سناٹا تھا۔ کمرے کا ایک دروازہ کھلا تھا اس میں گردن ڈال کر جھانکا۔ چونکہ روشنی سے اندھیرے میں آئے تھے۔ اس لیے کچھ دکھائی نہ دیا۔ اندر سے کسی نے ڈانٹ کر کہا: "کون ہے؟" میں نے کہا" میں اور دانی" مولوی صاحب نے کہا:" آؤ بیٹا اندر آؤ" مولوی صاحب فوراً پلنگ پر اٹھ بیٹھے اور تہمد سنبھالتے ہوئے نیچے اتر آئے۔ پوچھا "کیا پڑھتے ہو؟" ہم نے کتاب پیش کی۔ تھوڑی دیر تک الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔ اس کے بعد کہا:"بھئی ایک کتاب میرے لیے بھی لیتے آنا۔" ہم نے اپنی ایک کتاب ان کو دے دی اور دوسری سے دونوں نے مل کر کام نکالا۔ کیا پڑھا اور کس طرح پڑھایا اس کا میں آئندہ ذکر کروں گا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جب پڑھ کر اٹھے تو سب کچھ یاد تھا مگر دماغ پر کسی قسم کا بار نہ تھا۔ خوشی خوشی گھر آئے۔ چلو اللہ دے اور بندہ لے۔

ہمارے پڑھنے کا طریقہ یہ تھا کہ ایک روز میں پڑھتا تھا اور دوسرے روز میاں دانی۔ میری صَرف اور نحو بہت کمزور تھی اور کمزور کیوں نہ ہوتی شروع کیے ہوئے

کے دن ہوئے تھے، اعراب میں ہمیشہ غلطی کرتا تھا، نثر کو تو سنبھال لیتا تھا مگر نظم میں دقت پڑتی تھی، شعر خود بھی کہتا تھا، دوسروں کے ہزاروں اشعار یاد تھے، اس لیے شعر کو تقطیع سے گرنے نہ دیتا تھا۔ میاں دانی کی حالت اس کے بالکل برعکس تھی، وہ اعراب کی غلطی نہ کرتے تھے مگر شعر کو نثر کر دیتے تھے، سکتے تو کیا جھٹکے پڑ جاتے تھے، مولوی صاحب ہم دونوں کے پڑھنے سے بہت ربز بز ہوتے تھے ایک دن یہ ہوا کہ میرے پڑھنے کی باری تھی۔ میں نے ایک شعر پڑھا۔ معلوم نہیں کہ کہاں کے اعراب کہاں لگا گیا۔ مولوی صاحب نے کہا "ہیں! کیا پڑھا؟" میں سمجھا کہ اعراب میں کہیں غلطی ضرور ہوئی، تمام اعراب بدل کر شعر موزوں کر دیا۔ انھوں نے پھر بڑے زور سے "ہوں" کی ہم نے پھر اعراب بدل دیے۔ اس سے ان کو غصہ آگیا۔ "کہا دانی تم پڑھو۔" انھوں نے شعر کا گلا ہی گھونٹ دیا۔ خاصے بھلے چنگے شعر کو نثر بنا دیا۔ اب کیا تھا، مولوی صاحب کا پارہ ایک سو دس ڈگری پر چڑھ گیا۔ کتاب اٹھا کو جو پھینکی تو کمرے سے گزر دالان میں ہوتی ہوئی صحن میں پہنچی اور نہایت غصیلی آواز میں کہا: "نکل جاؤ ابھی میرے گھر سے نکل جاؤ۔ نہ تم مجھ سے پڑھنے کے قابل اور نہ میں تمھارے پڑھانے کے لائق۔" دانی نے میری طرف دیکھا، میں نے دانی کی طرف دیکھا۔ انھوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا "چلو"۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں جواب دیا: "ہرگز نہیں۔" انھوں نے اٹھنے کا ارادہ کیا۔ میں نے زانو دبایا۔ مولوی صاحب کی یہ حالت تھی کہ شیر کی طرح بپھر رہے تھے۔ آخر جب دیکھا کہ یہ لونڈے ٹس سے مس نہیں ہوتے تو کہنے لگے کہ: "اب جاتے بھی ہو یا نہیں؟" میں نے کہا: "مولوی صاحب جب تک کوئی دھکے دے کر نہ نکالے گا اس وقت تک تو ہم جاتے نہیں اور جائیں گے تو پھر ابھی آ جائیں گے" مولوی صاحب نے جو یہ بے حیائی دیکھی تو ذرا نرم ہوئے۔ کہنے لگے: "اچھا نہیں جاتے تو نہ جاؤ مگر میں تم کو ایک حرف نہ پڑھاؤں گا" میں نے کہا: "نہ پڑھائیے، مگر بغیر پڑھے ہم یہاں سے نہ ٹلے ہیں نہ ٹلیں گے" کہنے لگے: "بیٹا اس وقت میری طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ اب چلے جاؤ کل آ جانا" دانی نے بیچ جانا۔ میں سمجھا کہ اس وقت اٹھے تو مولوی صاحب

ہاتھ سے گئے۔ دانی اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے پکڑ کر ان کو بٹھا لیا مولوی صاحب یہ تماشا دیکھتے رہے۔ میں نے کہا: "مولوی صاحب پڑھیں گے تو آج پڑھیں گے اور آج پڑھیں گے تو اسی وقت پڑھیں گے۔ پڑھانا ہے تو پڑھایئے ورنہ ہمیں یہاں سے نہ جانا ہے نہ جائیں گے۔" آخر کار ہم جیتے اور مولوی صاحب ہارے۔ کہنے لگے: "خدا محفوظ رکھے! تم جیسے شاگرد بھی کسی کے نہ ہوں گے۔ شاگرد کیا ہوئے استاد کے استاد ہو گئے۔ اچھا بھئی میں ہارا، میں ہارا۔ جاؤ خدا کے لیے کتاب اٹھا لاؤ اور سبق پڑھ کر میرا پنڈ چھوڑو۔ دیکھیے کون سا دن ہوتا ہے کہ میرا تم سے چھٹکارا ہوتا ہے" میں جا کر صحن میں سے کتاب اٹھا لایا اور مولوی صاحب جیسے تھے ویسے کے ویسے ہو گئے۔ کہا کرتے تھے کہ اگر اس روز تم چلے جاتے تو میرے گھر میں گھسنا نصیب نہ ہوتا۔ میں تمھارے شوق کو آزماتا تھا مگر تم نے مجھے ہی آزما ڈالا۔ خدا ایسے شاگرد سب کو نصیب کرے۔ یہ بے حیائی نہیں میاں یہ شوق ہے۔ علم کا جس کو چسکا ہوتا ہے وہ بری بھلی سب ہی کچھ سنتا ہے۔ بدشوق بھاگ نکلتے ہیں اور شوقین استاد کو دبا لیتے ہیں۔

پڑھانے کا طریقہ یہ تھا کہ ہم میں سے کسی نے کتاب میں سے ایک شعر پڑھا اور مولوی صاحب نے کتاب الٹ کر میز پر رکھ دی پہلے دانی کی طرف متوجہ ہوے اور صرف و نحو کے نکات پر بحث شروع ہوئی۔ اس بحث میں مجھے بارہ پتھر باہر سمجھ لیا جاتا تھا۔ کبھی میں نے دخل بھی دیا تو مولوی صاحب نے فرمایا: "آپ مہربانی کر کے اس بارے میں اپنے دماغ پر زور ڈالنے کی تکلیف گوارا نہ فرمایئے"۔ اس کے بعد معانی بیان کیے، نکات بتائے اور پھر اسی مضمون کے اشعار اور مقولوں کا سلسلہ چھڑا۔ اب میاں دانی خارج از بحث ہو گئے اول تو مجھے یوں ہی ہزاروں شعر یاد تھے دوسرے خاص طور پر تیار ہو کر جاتا تھا۔ مولوی صاحب اگر ایک شعر پڑھتے تو میں دو پڑھنے کو تیار ہو جاتا۔

(مضامینِ فرحت از مرزا فرحت اللہ بیگ)

جوابی کالم

(د) ہم نے لاہور سے کراچی ــــــ گاڑی میں سفر کیا۔

(ہ) میں سمجھا کہ اس وقت اٹھے ــــــ مولوی صاحب ہاتھ سے گئے۔

(و) ہمارے پڑھنے کا طریقہ یہ تھا ــــــ ایک روز میں پڑھتا تھا اور دوسرے روز میاں دانی۔

(ز) کتاب اٹھا کر ــــــ پھینکی تو کمرے سے دالان میں ہوتی ہوئی صحن میں پہنچی۔

(ح) کہا کرتے تھے کہ ــــــ اس روز تم چلے جاتے تو میرے گھر میں گھسنا نصیب نہ ہوتا۔

۱۰۔ کالم ۱ میں کچھ الفاظ درج ہیں اور کالم ۲ میں قواعد کی اصطلاحات۔ جوابی کالم میں ہر لفظ کے سامنے صحیح اصطلاح کا حرفی نمبر تحریر کیجیے۔

جوابی کالم	کالم نمبر۲	کالم نمبر۱
	(الف) فعلِ حال	۱۔ دانی
	(ب) حرفِ جار	۲۔ دکھائی نہ دیا
	(ج) فعلِ امر	۳۔ نصیب کرے
	(د) فعلِ مستقبل	۴۔ آجا
	(ہ) ظرفِ مکان	۵۔ آج
	(و) فعلِ نہی	۶۔ از
	(ز) ماضی	۷۔ آجائیں گے
	(ح) ظرفِ زمان	۸۔ سنتا ہے
	(ط) فعلِ مضارع	۹۔ صحن
	(ی) عُرف	۱۰۔ گوارا نہ فرمائیے

~~~~~~~~~~
~~~~~~~~~~

جوابی کالم

(د) ہم نے لاہور سے کراچی ــــــ گاڑی میں سفر کیا۔

(ہ) میں سمجھا کہ اس وقت اٹھے ــــــ مولوی صاحب ہاتھ سے گئے۔

(و) ہمارے پڑھنے کا طریقہ یہ تھا ــــــ ایک روز میں پڑھتا تھا اور دوسرے روز میاں دانی۔

(ز) کتاب اٹھا کر ــــــ پھینکی تو کمرے سے دالان میں ہوتی ہوئی صحن میں پہنچی۔

(ح) کہا کرتے تھے کہ ــــــ اس روز تم چلے جاتے تو میرے گھر میں گھسنا نصیب نہ ہوتا۔

۱۰۔ کالم ۱ میں کچھ الفاظ درج ہیں اور کالم ۲ میں قواعد کی اصطلاحات۔ جوابی کالم میں ہر لفظ کے سامنے صحیح اصطلاح کا حرفی نمبر تحریر کیجیے۔

کالم نمبر۱	کالم نمبر۲	جوابی کالم
۱۔ دانی	(الف) فعلِ حال	
۲۔ دکھائی نہ دیا	(ب) حرفِ جار	
۳۔ نصیب کرے	(ج) فعلِ امر	
۴۔ آجا	(د) فعلِ مستقبل	
۵۔ آج	(ہ) ظرفِ مکان	
۶۔ از	(و) فعلِ نہی	
۷۔ آجائیں گے	(ز) ماضی	
۸۔ سنتا ہے	(ح) ظرفِ زمان	
۹۔ صحن	(ط) فعلِ مضارع	
۱۰۔ گوارا نہ فرمایئے	(ی) عُرف	

- - - - - - - - - - -

شہاب ثاقب

۱۳ نومبر ۱۸۳۳ء کی رات بھی کیا رات تھی جب شہاب ہائے ثاقب نے آتش بازی کا منظر پیش کر رکھا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام ستارے یک بارگی حرکت میں آگئے ہیں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ دوڑ رہے ہیں۔ بظاہر ہزاروں ٹوٹے ہوئے تاروں نے آسمان کو چمکا دیا تھا۔

کچھ لوگوں نے دعویٰ کیا کہ انھوں نے تاروں کی گرد کو برف کی ورقیوں جیسی شکل میں زمین پر گرتے پایا۔ ان کا منظر ایسا ہی تھا جیسے شب برات میں آتش بازی کا ہوتا ہے کہ ایک پہیے سے شعلے پھوٹتے نظر آتے ہیں۔ اس شب برج اسد کے مجموعہ نجوم سے بھی بے شمار چنگاریاں پھوٹتی نظر آ رہی تھیں۔

اس تماشے کو دیکھ کر بہت سے لوگوں میں دہشت پھیل گئی۔ کچھ سمجھے کہ قیامت آگئی، آسمان ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہا ہے اور جلد ہی یہ شعلے ہماری زمین کو جلا پھونک کر برباد کر دیں گے۔ ساری رات یہ آتش بازی جاری رہی۔ ہزاروں ستارے ٹوٹتے نظر آ رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمان میں کوئی سوراخ پیدا ہو گیا ہے جس میں سے یہ ستارے پھوٹتے نکلتے چلے آ رہے ہیں اور راستے میں جو ستارہ بھی ان کو ملتا ہے اس کو اپنے ساتھ لپیٹ کر افق تک گھسیٹ لے جاتے ہیں۔ جنوبی کیرولینا کے ایک شخص نے یہ سب عالم اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس نے یوں بیان کیا:۔

”میں سویا ہوا تھا کہ ایسا عجیب شور پیدا ہوا جس سے میرے کان آشنا نہیں تھے۔ میں یکایک بیدار ہوا۔ میرے چاروں طرف تین مزرعات ہیں۔ جن میں چھے سو یا آٹھ سو کے قریب حبشی لوگ آباد تھے۔ وہ سب کے سب خوفزدہ تھے اور چلّا چلّا کر رحم کے لیے دعائیں مانگ رہے تھے۔ میں اس ہنگامے کی وجہ نہ سمجھ سکا اور ابھی اس پر

غور کر ہی رہا تھا کہ میں نے دروازے کے قریب ایک نرم آواز سنی۔ کوئی مجھے میرا نام لے کر پکار رہا تھا۔ میں اٹھا اور اپنی تلوار سنبھال کر دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ اسی لمحے میں نے پھر وہی آواز سنی۔ کوئی مجھ سے بیدار ہونے کی استدعا کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا، آہ خدایا! دنیا میں آگ لگ گئی ہے!! یہ سن کر میں نے دروازہ کھول دیا اور اب یہ بیان کرنا مشکل ہے کہ میں اس منظر کی دہشت سے زیادہ متاثر ہوا یا حبشیوں کی آہ و بکا سے۔ سو سے زیادہ افراد سربسجود تھے، کچھ بالکل خاموش تھے جیسے گونگے ہو گئے ہیں اور کچھ بری طرح چیخ رہے تھے۔ ان کے ہاتھ بلند تھے۔ وہ خدا سے التجا کر رہے تھے کہ وہ دنیا کو اور ان کو اس تباہی سے بچالے۔ یہ نظارہ صحیح معنوں میں نہایت دہشت انگیز تھا کیونکہ زمین پر پہلے کبھی پانی کے قطروں کی بھی ایسی سخت بارش نہیں ہوئی تھی جیسی ان شہابیوں کی ہو رہی تھی۔ شمال، جنوب، مشرق مغرب --- غرض ہر سمت میں ایک سی حالت تھی۔"

اس سے پہلے بھی آسمانی آتشبازی کے یہ مناظر دیکھنے میں آئے ہیں اور کچھ ٹوٹے تارے زمین پر آ کر گرے ہیں۔ جب کبھی ایسا ہوتا ہے تو ہم ان کو "شہابِ ثاقب" کہتے ہیں لیکن جب وہ ٹوٹ کر آسمان کی وسعتوں میں گم ہو جاتے ہیں اور زمین تک نہیں آتے ہیں تو وہ "ٹوٹے تارے" کہلاتے ہیں۔

اریزونا (امریکہ) میں کون بٹ نامی مقام پر زمین میں ایک بہت بڑا گڑھا ہے، جس کا قطر 5ر4 میل اور گہرائی ۶۰۰ فٹ کے قریب ہے۔ اس کے کنارے ایک چٹان ڈیڑھ سو فٹ تک بلند ہو گئی ہے۔ یہ زبردست گڑھا نہ تو کسی آتش فشاں پہاڑ کا بنایا ہوا ہے اور نہ کسی جھیل کے دھنس جانے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے بلکہ وہ ان شہابیوں کی یورش کا نتیجہ ہے جو ہزاروں سال پہلے اس حصہ زمین پر وارد ہوئے جسے آج ہم اریزونا کہتے ہیں۔ اس زمانے میں یہاں انڈین قبیلے خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اس لیے ہم کو یہ معلوم نہیں ہے کہ اتنے بڑے شہابیے کے گرنے سے اس علاقے میں کیا شور غل ہوا ہو گا لیکن اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔

چند سو میل تک اس حادثے کا دھماکا ضرور پہنچا ہو گا اور جو لوگ اس علاقے میں آباد ہوں گے انھوں نے سوچا ہو گا کہ شاید بھونچال آ گیا۔ نہ صرف یہ کہ زمین بری طرح ہل گئی ہو گی بلکہ نظر کو خیرہ کر دینے والی روشنی بھی پیدا ہوئی ہو گی۔ اس کے بالنتیجہ زبردست حرارت نکلی ہو گی جس نے دور و نزدیک کے تمام جانداروں اور نباتات کو جلا پھونک کر راکھ کر دیا ہو گا۔ آج بھی اس گڑھے کے چاروں طرف جو چٹانیں موجود ہیں وہ سوختہ اور ٹوٹی پھوٹی حالت میں نظر آتی ہیں۔

تقریباً بیس سال گزرے کہ سائبیریا پر بہت سے چھوٹے بڑے شہابیوں کی بارش ہوئی تھی۔ خوش قسمتی سے یہ حادثہ سائبیریا کے اس حصے میں پیش آیا جہاں انسانی آبادی موجود نہ تھی۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہے، اس شعلے سے درخت اور جانور تباہ ہو گئے تھے۔ ۱۹۲۷ء میں ایک روسی مہم نے اس مقام کا جائزہ لیا اور بتایا کہ جس جگہ شہابیے گرے تھے اس کے چاروں طرف پندرہ میل تک گھنا جنگل چھایا ہوا تھا۔

"اب یہ عالم ہے کہ تمام درختوں کی چھال صاف ہو گئی ہے، شاخیں ٹوٹ گئی ہیں اور تقریباً سب کے سب زمین پر اس طرح پڑے ہیں کہ ان کے بالائی حصے الٹے ہوئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہابیوں کے گرنے سے بڑے زور کی آندھی آئی جس کی وجہ سے درخت اکھڑ گئے اور ان کی شاخیں پلٹ گئیں۔ چند نواحی پہاڑوں کی چوٹیوں سے بھی یہی اثر ظاہر ہے۔ کہیں کہیں درختوں کے ننگے تنے اب بھی کھڑے نظر آتے ہیں اور چند محفوظ گوشوں میں کچھ سبزہ دکھائی دیتا ہے لیکن مجموعی طور پر یہ پورا علاقہ نہایت ویران اور بنجر ہے۔

تمام نباتات سے خشکی اور سوختگی کے آثار ہویدا ہیں لیکن ایسے نہیں جیسے جنگل میں آگ لگ جانے سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ کائی تک جھلس کر رہ گئی ہے، جھاڑیاں اور درخت بھی شعلوں کی لپیٹ سے محفوظ نہیں رہے۔ مرکزی مقام سے چھے سے دس میل کے فاصلے تک یہی صورت نظر آتی ہے۔"

وسطی علاقے میں بے شمار دہانے پیدا ہو گئے ہیں جن کا قطر ایک گز سے پچاس گز تک ہے۔ ایس۔ بی۔ سیمی نوف نامی ایک شخص نے ساٹھ میل کے فاصلہ سے یہ منظر دیکھا اور اسے اپنے الفاظ میں یوں بیان کیا:

"آٹھ بجے صبح کے قریب میں اپنی برساتی میں بیٹھا ہوا تھا۔ میرا منہ شمال کی جانب تھا۔ یکایک شمال مغرب کی جانب ایک طرح کا شعلہ پیدا ہوا جس سے اس قدر حرارت نکلی کہ میں اس کی تاب نہ لا سکا۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ یہ شعلہ کم از کم ایک میل کے علاقے میں چھایا ہوا تھا لیکن وہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہا۔ میں نے آنکھ جھپکائی ہی تھی کہ وہ غائب ہو گیا۔ پھر یکایک تاریکی چھا گئی اور اس زور کا دھماکا ہوا کہ میں برساتی سے گر کر چھ فیٹ یا اس سے بھی زیادہ فاصلے پر جا گرا۔ میں نے اس غضب کی کڑک سنی کہ میں سمجھا کہ بس اب سارے مکانات جل جل کر ڈھیر ہو جائیں گے۔ بہت سی کھڑکیاں ٹوٹ گئیں، زمین کی ایک طویل پٹی شق ہو گئی اور میرے گودام کی لوہے کی چٹخنی ٹوٹ کر رہ گئی۔۔۔۔"

تقریباً ہر عجائب گھر میں چند شہابیے یا ان کے ٹکڑے رکھے ہوئے ہیں کیونکہ وہ عام دلچسپی کے حامل ہیں۔ ہم کو معلوم ہوا ہے کہ وہ چٹانی مادے لوہے کے بنے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کچھ کا وزن صرف چند پونڈ ہے اور بعض کا کئی کئی ٹن۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ شہابیے حقیقت میں ہیں کیا جو اس طرح ہماری زمین پر بمباری کرتے رہتے ہیں اور وہ کہاں سے آتے ہیں؟

سورج اور زمین کے آس پاس لاکھوں کروڑوں شہابیے موجود رہتے ہیں۔ وہ سورج کے چاروں طرف اسی صورت گردش کرتے رہتے ہیں۔ جس طرح ہماری زمین کرتی ہے۔ چونکہ وہ سرد ہیں اس لیے وہ صرف آفتاب کی روشنی سے چمکتے نظر آتے ہیں۔ ان کی جسامت بہت معمولی ہے اس لیے وہ بہت روشنی منعکس کر پاتے

۱۔ یہ اقتباس رسالہ، سائنٹفک امریکن، ۷ جولائی ۱۹۲۸ء میں شائع شدہ ایک مضمون، سائبیریا کا زبردست شہاب سے لیا گیا جسے ورجینیا یونیورسٹی کے پروفیسر چارلس پی۔ اولیویر نے لکھا۔

ہیں۔ اسی وجہ سے وہ ہم کو نظر نہیں آتے ہیں۔ چاند بھی سورج کی روشنی کو منعکس کر کے ہی چمکتا دمکتا نظر آتا ہے لیکن وہ اس قدر بڑا ہے کہ ہمیں اسے دیکھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی ہے۔ غرض یہ ٹوٹے تارے ہم کو اس وقت تک دکھائی نہیں دیتے جب تک وہ ہماری فضا میں داخل نہ ہو جائیں۔ اس وقت ہوا سے رگڑ کھا کر ان کا درجہ حرارت اس قدر زیادہ ہو جاتا ہے کہ وہ شعلہ کی طرح چمکنے لگتے ہیں۔ وہ ہر روز لاکھوں کی تعداد میں زمین پر گرتے رہتے ہیں۔

ہماری فضا پر ان کی بارش بالکل اسی طرح ہوتی رہتی ہے جس طرح کبھی طوفان برف و باراں میں آپ کار میں سفر کر رہے ہوں اور اس پر اولے گر رہے ہوں لیکن ان کی تعداد ان شہابیوں کی تعداد کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں جو زمین پر آتے رہتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ آپ کی کار مقناطیسی لوہے کی بنی ہوئی ہے جو کافی فاصلے سے ایک کیل کو اپنی طرف کھینچ سکتا ہے۔اس پر اولوں کی بجائے لوہے کی گولیوں کی بارش ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں آپ کی کار پر ہر لحظہ اولوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ گولیاں گریں گی کیونکہ وہ ان کو اپنی طرف کھینچتی رہے گی۔

ہماری زمین اور شہابیوں کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ زمین کی کشش مشہور ہے۔ وہ اس قوت کی مدد سے ان لاکھوں شہابیوں کو اپنی جانب کھینچ لیتی ہے جو سورج کے چاروں طرف گردش کرتے رہتے ہیں۔ وہ مجبور ہو کر اپنی راہ سے ہٹ جاتے ہیں اور ہماری فضا میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ان کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے۔ کبھی کبھی تو وہ چالیس میل فی سیکنڈ تک پہنچ جاتی ہے۔ اس رفتار پر ہوا کے ساتھ رگڑ کھا کھا کر ان میں زبردست حرارت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ روشن ہو جاتے ہیں۔ آپ نے اکثر رات کی تاریکی میں آسمان پر ایک تیز رو سفید لکیر دیکھی ہو گی جو صرف ایک لمحہ قائم رہتی ہے کیونکہ وہ آن کی آن میں جل بھن کر ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔

اگر ان میں جان اور قوتِ احساس موجود ہوتی تب بھی انھیں اپنی تیز رفتاری کا علم نہ ہوتا۔ وہ صرف اتنا سمجھتے کہ وہ ایک طوفان باد میں پھنس گئے ہیں جو پہلے ان کو خوب گرم کر رہا ہے اور پھر ان کے کونے کھدرے ہوا کی تیزی سے صاف ہوئے جا رہے ہیں۔ ہمیں اپنی رفتار کا اس وقت تک پتا نہیں چلتا جب تک ہم کسی چیز سے ٹکرا نہ جائیں۔ مثلاً زمین سورج کے چاروں طرف ساٹھ ہزار میل فی گھنٹا سے زیادہ رفتار کے ساتھ گردش کر رہی ہے لیکن ہمیں محسوس ایسا ہوتا ہے گویا زمین ساکن ہے۔ اسی طرح فضائے بسیط کے اس تیز رو مسافر یعنی اس شہاب کو بھی اپنی زبردست رفتار کا احساس نہیں ہوتا ہوگا۔ وہ سورج، چاند، زہرہ، مریخ، مشتری وغیرہ کو دیکھتا ہوگا اور کبھی کبھی کسی دم دار تارے کو بھی جو اپنے عجیب وغریب راستے پر اس کے قریب سے گزر جاتا ہوگا۔ ممکن ہے وہ یہ سمجھتا ہو کہ وہ ساری کائنات کا مرکز ہے جو محض اس کی تفریح کے لیے بنائی گئی ہے۔

پھر فوری طور پر اس میں ایک نیا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اسے ایک انوکھی گیس سے سابقہ پڑتا ہے جس کا نام ہوا ہے۔ وہ اس کی سطح پر سے ساٹھ ہزار میل فی گھنٹا سے زیادہ رفتار کے ساتھ گزر رہی ہے۔ اس کا خیال کیے بغیر ہی وہ فضائے ارض میں داخل ہو گیا ہے۔ ہوا میں کتنی قوت ہوتی ہے اس کا احساس ہمیں اسی وقت ہوتا ہے جب ہم کسی طوفان میں پھنس جاتے ہیں۔ صرف ساٹھ میل فی گھنٹا کی رفتار سے چلنے والی آندھی ہمارے قدم اکھاڑ دیتی ہے، اس لیے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہونی چاہیے کہ جب کوئی شہاب حد درجہ تیز رفتار کے ساتھ ہماری فضا میں داخل ہوتا ہے تو پہلے وہ گرم ہوتا ہے پھر نہایت گرم —— اتنا کہ وہ جل کر سفید ہو جاتا ہے اور پھر ٹوٹ کر ریزہ ریزہ۔

زمین کی سطح سے ٹکرانے سے پہلے شہابِ ثاقب چند سیکنڈ ہماری فضا میں گزارتا ہے۔ اس کی حرارت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ سفید نظر آتا ہے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ وہ ہم تک آنے سے پہلے ہی ٹوٹ پھوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ بہت

کم ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ کوئی بڑا شہاب زندہ وسلامت زمین پر آگرے لیکن جب کبھی ایسا ہوتا ہے تو یہ شہاب بم کی طرح پھٹتا ہے۔ جس سے زبردست شور پیدا ہوتا ہے گویا دور کہیں بجلی کڑکی۔

(سید علی ناصر زیدی)

سوالات

۱۔ ۱۳ نومبر ۱۸۳۳ء کی رات کو شہاب ثاقب کے ٹوٹنے کا منظر اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۲۔ سائبیریا میں چند برس پہلے شہابیوں کی بارش کا کیا نتیجہ نکلا؟

۳۔ شہابیہ کسے کہتے ہیں؟ اس کی ماہیت پر روشنی ڈالیے؟

۴۔ سبق کو غور سے پڑھ کر نیچے دیے ہوئے تین نامکمل سوالوں کے جوابات لکھیے۔ ہر سوال کے نیچے چار چار جوابات درج ہیں۔ آپ ان میں سے صحیح جواب کا حرفی نمبر سوال کے سامنے جوابی کالم میں تحریر کیجیے۔

I۔ اریزونا کے مقام، کون بٹ میں جو گڑھا ہے وہ --	جوابی کالم
(الف) کسی آتش فشاں پہاڑ کا بنایا ہوا ہے۔	
(ب) ہزاروں سال پہلے گرنے والے شہابیوں کی یورش کا نتیجہ ہے۔	
(ج) کسی جھیل کے دھنس جانے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔	
(د) زلزلہ آنے کی وجہ سے وجود میں آیا ہے۔	
II۔ شہابیے ہمیں اس لیے نظر نہیں آتے کہ ---	
(الف) وہ آفتاب کی روشنی کو منعکس نہیں کر سکتے۔	

(ب) وہ زمین سے بہت دور ہیں۔ (ج) ان کی جسامت بہت معمولی ہوتی ہے اور وہ سورج کی بہت تھوڑی روشنی منعکس کر پاتے ہیں۔ (د) وہ سورج سے بہت فاصلے پر ہیں۔ III۔ شہابیہ زمین تک پہنچتے پہنچتے اس لیے ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے کہ --- (الف) اس کی حرارت ختم ہو جاتی ہے۔ (ب) راستے میں کسی سیارے سے ٹکرا جاتا ہے۔ (ج) سورج کی حدت اسے جلا ڈالتی ہے۔ (د) زمینی فضا میں ہوا کے ساتھ رگڑ کھا کر جل جاتا ہے۔	جوابی کالم

۵۔ ہمیں زمین ساکن کیوں معلوم ہوتی ہے؟

۶۔ مندرجہ ذیل کو جملوں میں استعمال کیجیے :۔

یک بارگی ۔ سربسجود ۔ نظر کو خیرہ کرنا۔ آن کی آن میں ۔ آہ و بکا ۔ قدم اکھاڑ دینا۔

۷۔ مندرجہ ذیل کے مترادفات لکھیے :۔

نجوم ۔ دہشت ۔ عالم ۔ نرم ۔ سوختہ ۔ وقت ۔ لحظہ

۸۔ نیچے کالم نمبر۱ میں چند الفاظ درج ہیں اور کالم ۲ میں قواعد کی اصطلاح ۔ قواعد کی رُو سے ان الفاظ کے سامنے صحیح اصطلاح کا حرفی نمبر تحریر کیجیے :۔

کالم نمبر۱	کالم نمبر۲	جوابی کالم
۱۔ سائبیریا	(الف) حرفِ جار	

۲۔ شمال	(ب) فعلِ مستقبل	جوابی کالم
۳۔ بیدار ہوا	(ج) اسمِ ضمیر	
۴۔ تک	(د) اسمِ معرفہ	
۵۔ ہمیں	(ہ) حرفِ جزا	
۶۔ جب (اگر)	(و) فعلِ حال	
۷۔ برباد کر دیں گے	(ز) فعلِ ماضی	
۸۔ اکھاڑ دیتی ہے	(ح) ظرفِ مکاں	
۹۔ شب	(ط) حرفِ شرط	
۱۰۔ تب	(ی) ظرفِ زماں	

~ ~ ~ ~ ~ ~ ~ ~ ~ ~ ~

چھلانگ

لاہور پہنچ کر میں سیدھا مسعود کے گھر پہنچا تو وہ حضرت غائب۔ معلوم ہوا کہیں گھومنے گئے ہیں۔ خیر وہ گھومنے جائیں یا جہنم میں۔ گھر تو ان کا موجود ہی تھا۔ سامان رکھ کر نہایت اطمینان سے نہایا دھویا، کپڑے بدلے اور ان کے ملازم سے کہا "چائے لاؤ"۔ یہ ملازم بھی کوئی نیا جانور پھنسا تھا شاید۔ ایک تو وہ شروع سے آخر تک ایسی مشکوک نظروں سے دیکھ رہا تھا، جیسے میں اس کے مالک کا مہمان نہیں، کوئی اٹھائی گیرا ہوں اور اس گھر سے کچھ نہ کچھ اٹھا کر بھاگنے ہی والا ہوں۔ دوسرے معلوم یہ ہوتا تھا کہ یہ شخص آج تک کسی مہذب آدمی کے یہاں نہیں رہا ہے اور مسعود کو بھی ابھی اسے انسان بنانے کا موقع نہیں ملا ہے۔ ملاحظہ ہو تمیز داری کہ گلاس میں بنی بنائی چائے لا کر تپائی پر رکھ دی۔ میں نے حیرت سے پہلے اس بیہودہ چائے کو دیکھا۔ پھر اس نامعقول چائے لانے والے کو دیکھا۔ لیکن وہ خود ہی مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔ میں نے اس سے بہت کچھ کہنا چاہا لیکن بہ مشکل صرف یہ کہہ سکا:

"یہ کیا ہے؟"

اس نے جلے بھنے انداز سے کہا: "چائے ہے اور کیا ہوتی؟"

میں نے اب ذرا وضاحت سے کہا: "چائے تو ہے مگر گلاس میں؟"

اس نے ترکی بہ ترکی کہا "اور نہیں تو کیا گھڑے میں لاتا؟"

اب میں نے اپنے متعلق کچھ کہنا مناسب نہ سمجھ کر کہا "کیا مسعود گلاس میں چائے پینے لگے ہیں؟"

اس نے بہت کھرے انداز سے کہا "وہ نہیں پیتے چائے وائے۔ وہ لسّی پیتے ہیں۔"

اب میں اس نوکر کے منہ کیا لگتا۔ اس سے کہہ دیا یہ چائے لے جاؤ اور خود مسعود ہی کے بستر پر لیٹ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ قریب ہی پچھلے مہینے کی کسی تاریخ کا کوئی پھٹیچر سا اخبار پڑا ہوا تھا۔ دیر تک اسی کو دیکھتا رہا۔ اس میں چھپا ہوا پورا مُعمّا حل کر ڈالا۔ اس کے اشتہار تک پڑھ ڈالے مگر مسعود کو نہ آنا تھا نہ آئے۔ آخر میں اٹھا اور اس خیال سے کہ شاید اور کوئی چیز پڑھنے کو مل جائے الماری کا جائزہ لینا ہی چاہتا تھا، کہ نمائش کا اعزازی ٹکٹ سامنے رکھا نظر آیا۔ بس فوراً یہ پروگرام بنا لیا کہ یہاں پڑے پڑے انتظار کرنے کے بجائے جب تک نمائش ہی دیکھ آئیں۔ اتنی دیر میں مسعود بھی گھر آجائیں گے۔ یہ پاس اٹھا کر جیب میں رکھا اور اسی جنگلی ملازم سے نمائش کا پتا پوچھ کر نمائش جا پہنچے۔ گیٹ پر وہ پاس دکھا کر اندر جانا ہی چاہتے تھے کہ گیٹ کیپر نے پاس پر لکھا ہوا نام پڑھ کر جیسے کچھ چونکتے ہوئے کہا

"آپ ہی ہیں پروفیسر مسعود؟"

ظاہر ہے اس قسم کے موقع پر صرف جھوٹ ہی بولا جا سکتا ہے۔ ورنہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ پروفیسر مسعود نہیں ہیں تو ان کے نام کا پاس کیوں لائے؟ اس لیے بہت انکساری سے عرض کیا:۔

"اب میں اپنے منہ سے کیا عرض کروں؟"

گیٹ کیپر مجھے جواب دینے کے بجائے چیخنے لگا۔

"چودھری صاحب یہ آگئے ہیں پروفیسر مسعود۔"

اور اس آواز پر ایک نہایت حواس باختہ قسم کے بزرگ نے لپک کر میرا بازو تھاما اور اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا:

"ارے صاحب! کمال کر دیا آپ نے بھی۔ آج نمائش کا پہلا دن اور آپ نے آج ہی سارا پروگرام گڑ بڑ کر دیا ہوتا اگر ذرا دیر اور ہو جاتی۔ خلقت کا ہجوم ہے اور آپ غائب" وہ کہتے جا رہے تھے اور گھسیٹتے لیے چلے جاتے تھے۔ اپنی ہی کہتے تھے اور دوسرے کی سننے کو تیار نہ تھے۔ آخر ایک خیمے میں لے جا کر سرکس کے مسخروں والا لباس میری طرف اچھال کر کہا:

"بس اب چٹکی بجاتے ہوئے تیار ہو جائیے۔ جب تک میں لاؤڈ سپیکر پر اعلان کراتا ہوں کہ آپ پہنچ گئے ہیں۔ حضرت آپ کو لینے نمائش کے منیجر صاحب خود دوڑے گئے ہیں آپ کے گھر۔"

میں نے وہ مسخروں والا لباس غور سے دیکھ کر کہا:۔

"مگر مجھے بتائیے تو سہی کہ ماجرا کیا ہے؟"

وہ گھبراہٹ کے ساتھ بولے:

"اب ماجرا واجرا بعد میں بتایا جائے گا۔ پہلے آپ یہ کپڑے پہنئے جلدی سے۔ کمال کر دیا آپ نے بھی۔ ذرا وقت کی پابندی بھی کرنی چاہیے انسان کو اور اب بھی آپ کھڑے منہ دیکھ رہے ہیں۔ خدا کے لیے اب دیر نہ کیجیے۔ لائیے میں اتارتا ہوں آپ کے کپڑے۔"

اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں ان حضرت نے میری شیروانی اتار کر ایک طرف اچھال دی اور جھپٹے قمیض کی طرف۔ میں نے ذرا بچاؤ کی کوشش کی تو ان کے تیوروں سے اندازہ ہوا کہ شاید قمیض پھاڑ ڈالیں گے۔ اس لیے انھیں قمیض بھی اتار لینے دی اور پھر عرض کیا:

"حضرت! آپ صرف ایک بات سن لیجیے میری۔"

وہ گھبرا کر بولے:

"کمال کرتے ہیں آپ۔ یعنی آپ کو باتوں کی پڑی ہے اور وہاں تماشائیوں کے ہجوم میں نمائش کے انتظامات پر ہنسی اڑائی جا رہی ہے۔ پہلے ہی دن اگر ہماری ہوا بگڑ گئی تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔"

اب میں نے ان سے صاف صاف کہا "سنیے جناب! میں یہ مسخروں کا لباس ہرگز نہ پہنوں گا۔"

وہ آستین چڑھا کر بولے:

"پہنیں گے تو آپ کے فرشتے بھی۔ ہم آپ سے یہ شرط پہلے ہی طے کر چکے ہیں کہ آپ کو یہ لباس پہننا ہو گا اور چہرے پر بھی کھریا لیپ کر سیاہ لکیریں کھینچیں گے۔"

میں نے کہا:

"میں آپ سے ایک بات عرض کر دوں کہ میں دراصل---"

وہ ایک دم کڑک کر بولے: "معلوم ہوتا ہے سیدھی انگلیوں سے گھی نہ نکلے گا عجیب آدمی معلوم ہوتے ہو۔ تمھیں ذرا بھی خیال نہیں کہ ہماری کس قدر ہنسی اڑ رہی ہے۔ ہمیں دھوکے باز سمجھا جا رہا ہے۔ کہ ہم اشتہار کچھ دیتے ہیں اور دکھاتے کچھ ہیں۔"

میں نے پھر اصل واقعہ عرض کرنے کی کوشش کی —— "بھئی میری بات تو سنیے"۔

مگر چودھری صاحب نے خیمے سے منہ نکال کر کچھ لوگوں کو آواز دی:

"کلو! امام دین! بھوری!"

اور فوراً ہی تین چار مسٹنڈے خیمے میں آ موجود ہوئے، تو چودھری نے نادری حکم دیا کہ "یہ ہمیں ذلیل کرانے پر تلے ہوئے ہیں۔ انھیں زبردستی یہ کپڑے

پہنا کر اور منہ پر کھریا وریا مل کر لاؤ وہاں۔ جب تک میں اعلان کراتا ہوں۔"

وہ تو یہ کہ کر چلتے بنے اور یہاں ان قسائیوں نے واقعی زبردستی میرے کپڑے اتار کر مجھے وہ جوکروں والا لباس پہنا ہی دیا۔ اور جس وقت وہ میرے چہرے پر چونا مل کر سیاہ لکیریں کھینچ رہے تھے، میں نے پھر بہت خوشامد سے کہا:

"بھائی مجھ سے چاہے جیسی قسم لے لو میں پروفیسر مسعود نہیں ہوں۔"

ان میں سے ایک نے میرے سر پر سرخ پھندنے والی لمبی سی ٹوپی پہناتے ہوئے کہا:

"یہ چکما تو خیر کسی اور کو دینا۔ نہیں ہو پروفیسر تو پیشگی روپیہ کیوں لیا تھا۔؟"

دوسرے نے کہا:

"کوئی پوچھے ایسی ہی جان عزیز تھی، تو کس نے کہا تھا اس سولی پر لٹکنے کو؟"

اور اسی وقت میں نے لاؤڈ سپیکر پر اعلان سنا:

"معزز شائقین آپ کے انتظار اور اشتیاق کی واقعی حد ہو چکی ہے لیکن ہم نہایت خوشی کے ساتھ یہ اعلان کرتے ہیں کہ پروفیسر مسعود گولڈ میڈلسٹ پہنچ چکے ہیں اور مینار کے پاس تشریف لا رہے ہیں۔ آپ زندگی اور موت کا یہ کھیل دیکھنے کے لیے جمع ہو جائیں۔ ایک سو چالیس فٹ اونچے مینار سے پروفیسر مسعود اپنے جسم میں آگ لگا کر حوض میں چھلانگ لگائیں گے۔ آیئے ! آیئے !! آیئے !!! پروفیسر مسعود آگئے ! آگئے !! آگئے !!!

میرے سارے جسم میں پہلے تو کپکپی پیدا ہوئی پھر معلوم ہوا کہ رگوں میں خون منجمد ہو گیا ہے اور بہ مشکل تمام میں صرف یہ کہہ سکا:

"چھلانگ!"

اور چاروں قسائی ایک دم ہنس دیے اور مجھے خیمے کے باہر دھکا دے دیا۔ یہ موقع غنیمت تھا۔ اس لیے میں سر پر پیر رکھ کر بھاگا ہی تھا کہ ان میں ایک نے لپک کر میری گردن پکڑ لی اور مجھے جھنجھوڑ کر کہا:

"آخر تم چاہتے کیا ہو! بے ایمانی کی حد کر دی کہ اب عین وقت پر اپنا ریٹ بڑھانے کے لیے یہ حرکتیں کر رہے ہو؟"

اور اسی وقت ان خوفناک چودھری صاحب نے آکر کہا:

"کان پکڑے بابا، کل سے یہ کھیل موقوف ۔ لیکن آج تو چھلانگ لگانی ہی پڑے گی۔"

میں نے پھر تقریباً رو دینے کے انداز سے کہا:

"چودھری صاحب اللہ جانتا ہے کہ میں پروفیسر مسعود نہیں ہوں۔ نہ میں نے کبھی چھلانگ لگائی ہے، نہ میں چھلانگ لگا سکتا ہوں۔ میں بے موت مر جاؤں گا۔ میرا خون آپ کی گردن پر ہو گا۔ بخدا میں پروفیسر مسعود نہیں ہوں۔"

چودھری صاحب نے بہت ہی تعجب سے کہا: "کیا مطلب؟ یعنی اب تم پروفیسر مسعود ہی نہیں ہو؟"

میں نے اسی طرح گڑ گڑاتے ہوا کہا "اللہ جانتا ہے میں نہیں ہوں پروفیسر مسعود! میں تو ان کا ایک مہمان ہوں۔ آج ہی لاہور سے آیا ہوں۔ میں ان کا یہ پاس اٹھالایا تھا نمائش دیکھنے کے لیے۔ اور یہاں آکر اس عذاب میں پھنس گیا۔ مجھے اپنے بچوں کا واسطہ بخش دیجیے۔"

عین اسی وقت لاؤڈ سپیکر پر پھر اعلان ہوا:

"ایک سو چالیس فٹ اونچے مینار سے چھلانگ ، پروفیسر مسعود کا زندگی اور موت دونوں سے مذاق!!"

چودھری صاحب نے یہ اعلان سن کر میری اپیل خارج کر دی۔

"اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ تم پروفیسر مسعود ہو یا نہیں ہو، اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ چھلانگ تو لگانی ہی پڑے گی!"

اور میرے سامنے بجلی کے رنگا رنگ قمقموں سے جگمگاتا ہوا وہ ایک سو چالیس فٹ اونچا مینار تھا جس پر چڑھنا ہی میرے لیے دشوار تھا۔ چڑھ کر پھاندنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ میں نے اسے دیکھ کر اپنی آنکھیں خوف سے بند کر لیں لیکن چودھری صاحب نے مجھے اس مینار کی طرف دھکا دیا بلکہ تقریباً گھسیٹتے ہوئے مینار تک لے گئے۔ تماشائیوں نے مجھے دیکھ کر تالیاں بجائیں اور مجھے محسوس ہوا جیسے میرے طائرِ روح کو اڑانے کے لیے یہ تالیاں بجائی جا رہی ہیں۔ چودھری صاحب نے میرے ہاتھ میں ایک پٹرول کی بوتل اور ایک ڈبیہ دیا سلائی کی دے کر کہا:

"چڑھ جاؤ اس مینار پر اور یہ پٹرول اپنے اوپر چھڑک کر دیا سلائی دکھا دینا اور فوراً چھلانگ لگا دینا اس تالاب میں۔ بس چھٹی ہوئی۔"

چھٹی تو خیر واقعی ہمیشہ کے لیے ہونے والی تھی۔ لیکن میں اب بھی بھاگنے کی کوشش میں تھا۔ تماشائی برابر تالیاں بجا رہے تھے۔ آخر میں نے طے کیا کہ ان تماشائیوں سے صاف صاف کہُ دوں کہ مجھے زبردستی پروفیسر مسعود بنایا جا رہا ہے اور میں یقیناً مر جاؤں گا۔ لیکن اس نقار خانے میں طوطی کی آواز سنتا ہی کون؟ مجبوراً میں اس مقتل کی طرف بڑھنے لگا لیکن عین مجمع میں اسی وقت کچھ ہل چل پیدا ہو گئی اور کسی نے بہ آوازِ بلند کہا:

"یہ آگئے پروفیسر مسعود!"

اور چودھری صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے پھر گھسیٹا اور دوڑاتے ہوئے خیمے میں لا کر جلدی جلدی یہ مسخروں والا لباس میرے جسم سے اتار کر ایک نووارد کو پہنانا شروع کیا۔ میں نے اس شخص کو دیکھ کر دل میں کہا: "لیجیے کسی اور کی شامت

آئی۔ اب کسی اور کو پروفیسر مسعود بنایا جا رہا ہے اس لیے کہ دراصل یہ بھی پروفیسر مسعود نہ تھا۔ بہر حال کوئی بھی ہو، ہماری بلا سے۔ ہم تو موت کے منہ سے نکال ہی لیے گئے۔ اس نووارد نے جلدی سے وہ لباس پہنا۔ اپنے چہرے پر عجیب وغریب نقوش بنائے اور دوڑا اس مینار کی طرف۔

جب میں اپنے ذاتی کپڑے پہن کر اور منہ صاف کر کے اس ہجوم میں پہنچتا ہوں تو یہ نووارد ایک سو چالیس فٹ کی بلندی پر پہنچ کر اپنے جسم پر پٹرول چھڑک رہا تھا۔ اس نے اپنے کو پٹرول سے تر کرنے کے بعد دیا سلائی دکھا کر آگ لگائی اور اب جو پھاندا ہے اس مینار سے تو تالاب میں چھپاکا ہوا اور فضا تالیوں کے زور سے گونج گئی۔ نووارد تالاب سے نکل کر دوڑا خیمے کی طرف۔ اب میرے دماغ کا بوجھ بھی ہلکا ہو چکا تھا اور دماغ میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہونے لگی تھی۔ اس لیے سب سے پہلا سوال ذہن میں یہ آیا کہ یہ پروفیسر مسعود نہ سہی لیکن مسعود نے یہ کرتب دکھانا کب سے شروع کر دیا؟ مسعود کی زندگی کے اس رخ کی تو مجھے خبر ہی نہ تھی۔ میں ابھی اس بات پر غور کر رہا تھا کہ چودھری صاحب نے آکر پھر مجھے گھیرا۔

"چلیے آپ کو پروفیسر مسعود بلاتے ہیں۔ جن کا پاس آپ چرا لائے ہیں۔"

میں خود اس مُعمّے کو حل کرنے کے لیے بیتاب تھا۔ اس لیے بہت ہی مستعدی سے خیمے میں پہنچ گیا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نام نہاد مسعود نے کہا:

"کیوں جناب یہ میرا پاس آپ نے کہاں سے اڑایا؟"

میں نے کہا:

"یہ آپ کا نہیں پروفیسر مسعود کا پاس ہے۔ جو میرے دوست ہیں جن کے گھر میں آج ہی مہمان آیا ہوں۔"

اس شخص نے چونک کر کہا"اچھا تو یہ آپ کا بستر وغیرہ رکھا ہوا ہے میرے گھر میں۔"

میں نے کہا" آپ کے گھر میں یا مسعود کے گھر میں؟"

اس شخص نے تالی بجا کر کہا:"ارے یار تم اس مسعود کے تو مہمان نہیں ہو جو کالج میں پڑھاتا ہے۔"

میں نے کہا:"جی ہاں! وہی مسعود۔"

اس شخص نے کہا" تو یہ کہو نا۔ وہ تو میرے مکان کے سامنے والی کوٹھی میں رہتے ہیں۔ میں بھی کہوں کہ پروفیسر اور کون ہو سکتا ہے؟" اور اسی وقت چودھری صاحب نے چائے کا ایک گلاس ان پروفیسر مسعود کو دوسرا مجھے تھما دیا اور میں ان سے یہ نہ کہہ سکا کہ "چائے تو یہ ہے مگر گلاس میں؟" البتہ پروفیسر صاحب کہہ رہے تھے۔

"لسّی نہیں مل سکتی"؟

(شوکت تھانوی)

سوالات

۱۔ مہمان سے اپنے دوست کا مکان تلاش کرنے میں کیا غَلَطی ہوئی؟

۲۔ پروفیسر مسعود کا پاس لے کر نمائش میں جانے سے مہمان کی کیا درگت بنی؟

۳۔ کسی دوسرے کا پاس لے کر تقریب میں جانا کیا اخلاقی طور پر درست ہے؟

۴۔ "چھلانگ" کا مرکزی خیال اپنے الفاظ میں بیان کیجیے:۔

۵۔ اس سبق کا خلاصہ لکھیے۔

۶۔ مندرجہ ذیل محاورات کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:۔

ترکی بہ ترکی جواب دینا۔ منہ لگنا۔ ہوا بگڑنا۔ منہ دیکھنا۔ منہ دکھانے کے قابل نہ رہنا۔ آستیں چڑھانا۔ جان عزیز ہونا۔ سر پر پیر رکھ کر بھاگنا۔ بے موت مرنا۔ کان پکڑنا۔ نقار خانے میں طوطی کی آواز۔ سیدھی انگلیوں سے گھی نہ نکلنا۔

۷۔ نیچے کالم نمبرI میں کچھ الفاظ دیے گئے ہیں۔ کالم نمبرII میں ان کے مترادف بے ترتیبی سے درج ہیں۔ جوابی کالم میں ہر لفظ کے سامنے اس کے صحیح مترادف کا حرفی نمبر تحریر کیجیے۔

کالم نمبرI	کالم نمبرII	جوابی کالم
۱۔ کوشش	(الف) آغاز	
۲۔ مشکل	(ب) بھیڑ	
۳۔ اطمینان	(ج) سعی	
۴۔ شروع	(د) عجز	
۵۔ وضاحت	(ہ) دوزخ	
۶۔ ہجوم	(و) دشوار	
۷۔ جہنم	(ز) تشریح	
۸۔ انکسار	(ح) تسلی	

۸۔ مندرجہ ذیل الفاظ کے تلفظ عام طور پر غلط بولے جاتے ہیں۔ نیچے آٹھ لفظوں کے دو دو تلفظ دیے گئے ہیں آپ صحیح تلفظ کا حرفی نمبر جوابی کالم میں درج کیجیے۔

	I	II	جوابی کالم
i	(الف) جَہَنَّم	(ب) جُہَنُّم	
ii	(الف) نُمائش	(ب) نُمایش	

iii	(الف) مُعَمّا	(ب) مُعَمّہ	جوابی کالم
iv	(الف) تَعَجُّب	(ب) تَعَجَّب	
v	(الف) اِنْتِظار	(ب) اِنْتَظار	
vi	(الف) زِنْدَگی	(ب) زِنْدگی	
vii	(الف) خارِج	(ب) خارَج	
viii	(الف) اَصْل	(ب) اَصَل	

مسلمانوں کی تعلیم، جنگِ آزادی کے بعد

جنگِ آزادی جسے غیر ملکیوں کے دَور اقتدار میں غدر کے نام سے شہرت دی گئی بجائے خود ہمارے برِ عظیم کی تاریخ کا بہت بڑا واقعہ نہ تھی لیکن نتائج کے اعتبار سے اس جنگ کو ہماری تاریخ کے اہم ترین واقعات میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس لیے بھی کہ یہ اجنبی اقتدار کی زنجیروں کو ٹکڑے کر ڈالنے کی ایک نہایت پُر خلوص کوشش تھی۔ اگرچہ بعض اتفاقی حوادث کی بنا پر جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، اسے کامیابی حاصل نہ ہوئی اور اس لیے بھی کہ جنگ کے نتیجے میں ہمارے تمدّن ہماری سیاست، ہماری تہذیب، ہمارے مذہبی رجحانات، اخلاق و عادات اور زندگی کے تمام دوسرے شعبوں پر گہرا اثر پڑا، میں اپنی بات چیت صرف مذہبی رجحانات تک محدود رکھوں گا۔

غیر ملکی اقتدار کی توسیع کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کے لیے جو خطرے پیدا ہوئے ان میں سے تین خطرے جنگِ آزادی کے بعد نہایت خوفناک شکل میں سامنے آچکے تھے۔ ایک طرف مسیحی مشنری تھے جن کے حملے سب سے بڑھ کر اسلام پر ہو رہے تھے۔ اولاً اس لیے کہ جنگِ آزادی میں مسلمانوں پر سخت ضرب لگ چکی تھی ان کا برائے نام اقتدار بھی ختم ہو چکا تھا اور وہ انگریز حاکموں کے نزدیک معتوب ہونے کے باعث پریشان حال تھے۔ اس حالت میں ان کے مذہب کو ہدف بنا لینا مشنریوں کو سہل بھی نظر آیا اور نتیجہ خیز بھی۔ ثانیاً بعض مشنری سمجھتے تھے کہ اگر وہ معاذ اللہ عالمِ اسلام کو شکست دینے میں کامیاب ہو جائیں تو پھر کوئی دوسرا مذہب ان کے مقابلے پر ٹھہر نہ سکے گا۔ تیسرے انگریزوں نے مسلمانوں کے ہاتھ سے اقتدار چھینا تھا۔ انھیں یقین تھا کہ مسلمان ہی ان کے خلاف اٹھنے کی ہمت رکھتے ہیں۔ لہٰذا

مسلمانوں کی سیاسی شکست کو مکمل و فیصلہ کُن بنانے کے خیال سے ان کے مذہب پر اعتراضات کا سَیل بہا دیا گیا۔ مشنریوں کی ان کوششوں کے خلاف متعدد مذہبی عالموں نے مردانگی سے جہاد کا سرو سامان کیا جن میں مولانا رحمت اللہ مرحوم و مغفور بانیِ مدرسہ صولتیہ (مکہ معظمہ) اور ڈاکٹر وزیر خاں مرحوم کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ سر سید مرحوم و مغفور نے اس سیل کی روک تھام اور اسلام اور مسلمانوں کے بچاؤ کے لیے جو مجاہدانہ کارنامے انجام دیے ان کا سرسری ذکر میں آگے چل کر کروں گا۔

دوسرا خطرہ یہ تھا کہ انگریزوں نے مسلمانوں سے اقتدار چھینا تھا۔ طبعاً مسلمانوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف نہایت سخت ملال تھا اور انگریز چونکہ مسلمانوں اور صرف مسلمانوں ہی سے خائف تھے اس لیے نظم ونسق ملک میں ان پر اعتماد کے لیے تیار نہ تھے۔ جنگِ آزادی میں مسلمانوں نے نمایاں حصہ لیا۔ اس لیے انگریزوں کو یقین ہو چکا تھا کہ مسلمان کبھی ان سے تعاوُن نہ کریں گے۔ یوں ایسی صورت پیدا ہو گئی تھی کہ انگریزوں کے دَورِ اقتدار میں مسلمان نظم ونسق میں حصہ داری سے محروم ہو کر اس پستی میں گر جاتے جس میں ہزاروں سال سے اچھوت گرے ہوئے تھے۔ تیسرا خطرہ یہ تھا کہ انگریزی اقتدار کی بنیادیں مضبوط ہونے کے بعد انگریزی تعلیم جاری ہو گئی تھی اور روز بروز اس کا دائرہ پھیل رہا تھا۔ مسلمان چاہتے بھی تو اس تعلیم سے بالکل بے تعلق نہ رہ سکتے تھے۔ اگر وہ انگریزی تعلیم پاتے تو اندیشہ تھا کہ ان کے مذہبی معتقدات پر بہت برا اثر پڑے گا۔ حکومت مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ دَورِ زوال میں مذہبی معتقدات بھی بڑی حد تک بگڑ چکے تھے۔ صحیح دینی تعلیم کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہا تھا۔ ان حالات کا طبعی نتیجہ یہ ہوتا کہ انگریزی تعلیم کی اشاعت کے ساتھ ساتھ مشنریوں کے لیے مسلمانوں میں اشاعتِ مسیحیت کا راستہ صاف ہو جاتا۔

سرسید مرحوم وہ بزرگ تھے جنھیں تینوں خطروں کا پورا احساس ہوا اور ۱۸۵۷ء سے زندگی کے آخری سانس تک انھوں نے جو کچھ کیا اس کا مقصد یہی تھا کہ ان تینوں خطروں کا انسداد ہو یعنی مشنریوں کے اعتراضات کے محض الزامی جوابات پر قناعت نہ کرلی جائے بلکہ تحقیقی اور علمی جوابات دیے جائیں اور اس سلسلے میں اسلام کی برتری محکم حقائق کی بنا پر ثابت کی جائے۔ انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان بے اعتمادی اور بدظنی کی جو خلیج حائل ہو چکی تھی اسے پاٹا جائے تاکہ مسلمان اس سرزمین میں ایک معزز قوم کی حیثیت میں ملکی نظم ونسق کے حصہ دار بن سکیں۔ ان کے لیے انگریزی تعلیم کا ایسا انتظام کیا جائے کہ ان کی اسلامیت نہ صرف محکم وپائیدار بن جائے بلکہ ان میں اسلام کی حقانیت وافضلیت کا سچا جذبہ اور جوش پیدا ہو جائے۔ ان کو صرف رسمی اور موروثی حیثیت ہی میں مسلمان نہ سمجھا جائے بلکہ وہ حقیقی معنوں میں پُر جوش مسلمان بن جائیں۔

مسلمان اگر انگریزی تعلیم سرکاری درسگاہوں یا مشن سکولوں اور کالجوں میں پاتے تو سخت خطرہ تھا کہ ان کے اسلامی عقائد پر اچھا اثر نہ پڑے گا لہٰذا سرسید نے اپنے زیرِ اہتمام ایک معیاری درسگاہ قائم کرنے کا ارادہ فرمایا۔ جہاں مسلمانوں کو بہتر مسلمان بنانے کا پختہ انتظام موجود ہو۔ اس ادارے نے علی گڑھ کالج کی شکل اختیار کی اور کوئی شخص اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ سرسید کی یہ سکیم بہ اعتبار نتائج بہت کامیاب ہوئی اور علی گڑھ کے نمونے پر مسلمانوں نے جا بجا جتنی درسگاہیں قائم کیں ان کی خدماتِ جلیلہ روزِ روشن کی طرح سب پر آشکار ہیں۔ اس سلسلے میں سرسید نے قرآنِ مجید کی تفسیر لکھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ جو لوگ انگریزی تعلیم پائیں ان کے سامنے مذہب کو نئی عقلیت کے نقطہ نگاہ سے معقول طریق پر پیش کیا جائے۔

علمائے کرام کا ایک گروہ ایسا بھی تھا جو ہر قسم کی سیاسی مشکلات کے باوجود انگریزوں سے تعاون کا روادار نہ ہوا۔ انھوں نے جا بجا خالص دینی درسگاہیں قائم

کیں تاکہ مسلمانوں میں دینی حمیّت کو زندہ رکھیں اور ان کے لیے ان سے استفادے کے مواقع بہم پہنچائیں جو دین کے حقیقی سرچشمے تھے اور زوال کے بعد ان سے بہرہ مندی کے مواقع بڑی حد تک ختم ہو چکے تھے۔ اس سلسلے میں بہت سی درسگاہوں کے نام لیے جا سکتے ہیں جو اس برعظیم کے طول و عرض میں جا بجا قائم ہوئیں اور اب تک موجود ہیں۔ اس سلسلے کی جس درسگاہ نے سب سے بڑھ کر شہرت پائی وہ دیوبند کی درسگاہ تھی اس کی بنیاد حضرت مولانا محمد قاسمؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے رکھی یہ بالکل معمولی سر و سامان کے ساتھ شروع ہوئی تھی لیکن بانیوں کے اخلاص اور حُبِ اسلام کی بدولت اس برِ عظیم کی نہایت اہم دینی درسگاہ بن گئی۔ حضرت مولانا محمد قاسمؒ دینِ اسلام پر مخالفوں کی نکتہ چینیوں کے جوابات دیتے رہے خواہ وہ نکتہ چینیاں مشنریوں کی طرف سے ہوں یا دوسرے مذہب کے پیروؤں کی طرف سے۔ اس سلسلے میں ان کے خطبات اور تقریریں ادبِ اسلامیہ کا ایک گراں قدر سرمایہ ہیں۔

علیگڑھ اور دیوبند بظاہر دو قسم کی درسگاہیں تھیں لیکن ان دونوں نے مسلمانوں کی دینی و دنیوی علمی و سیاسی اور اخلاقی و ثقافتی میراث کو بہتر سے بہتر طریق پر محفوظ رکھنے کی جو کوششیں کیں ان کی مشکوریت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے۔ جو مسلمان ۱۸۵۷ء میں بہ ظاہر اپنا سب کچھ کھو چکے تھے، وہ تھوڑی ہی مدت میں سنبھل کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے اور مجاہد قوم بن گئے۔ جزوی یا بعض معاملات میں ناکامیوں سے قطع نظر کرتے ہوئے جن سے کسی قوم کو بھی زندگی کے مختلف مراحل میں مفر نہیں اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ جن مسلمانوں کے متعلق ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد سمجھا جا چکا تھا کہ وہ اب ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکے ہیں وہ نہ صرف اٹھے بلکہ اس وسیع سرزمین کی تقدیر میں نہایت اہم وظیفہ بجا لانے کے قابل بن گئے۔ حالانکہ انھیں کسی دائرے میں وہ وسائل میسا نہ رہے تھے جو اس ملک میں ایک ہزار سال سے زیادہ مدت تک قومی میراث بنے رہے۔

ان دینی اور قومی مجاہدوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ جنھوں نے ۱۸۵۷ء کا

خونیں دور اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا وہ نتائج سے متاثر ضرور ہوئے ہوں گے لیکن نہ اسلام کے ایمان کی پختگی میں فرق آیا نہ ان کے قدمِ ہمت میں لغزش پیدا ہوئی۔ نہ ان کی غیرت و حمیت کی حرارت میں افسردگی آئی، نہ وسائل کا فقدان ان کا دامن گیر ہو سکا۔ وہ اپنے فرض کو پہچانتے ہوئے اٹھے اور انھوں نے عمل کے جو راستے ہموار کر دیے تھے، ان پر چلنے کے لیے پوری قوم میں بے پناہ جوش پیدا کر دیا۔ انھیں بزرگوں کے پُر خلوص کارناموں کی برکت تھی کہ مسلمانوں نے حقیقی مذہبی میراث کے تحفظ کو اپنا نصب العین بنایا۔ باقی رہا یہ امر کہ ہم اس میراث کی عظمت و جلالت کو بحال رکھنے میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں یا کامیاب ہوں گے تو اس بارے میں فیصلے کا علم حال کے نہیں بلکہ مستقبل کے ہاتھ میں ہے۔

(مولانا غلام رسول مہر)

سوالات

۱۔ جنگ آزادی میں شکست کے بعد مسلمانوں کے لیے تین سب سے بڑے خطرے کون سے تھے؟

۲۔ سر سید مرحوم نے ان خطروں کا انسداد کس طرح کیا۔؟

۳۔ دیوبند کی درسگاہ کے قیام کا مقصد کیا تھا۔؟

۴۔ سر سید نے علی گڑھ کالج کس مقصد سے قائم کیا اور اس کالج نے مسلمانوں کی کیا خدمت کی؟

۵۔ "باقی رہا یہ امر کہ ہم اس میراث کی عظمت و جلالت کو بحال رکھنے میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں، یا کامیاب ہوں گے، تو اس بارے میں فیصلے کا علم حال کو نہیں بلکہ مستقبل کے ہاتھ میں ہے" سبق کے اس آخری جملے کو مدنظر رکھ کر بتائیے کہ "میراث" سے کیا مراد ہے؟ اور ہم پاکستانی کس طرح اس کے اہل بن سکتے ہیں۔

۶۔ مندرجہ ذیل عبارات کی تشریح کیجیے۔

(الف) جنگِ آزادی جسے غیر ملکیوں کے دَورِ اقتدار ---- نہایت پُر خلوص کوشش تھی۔

(ب) علمائے کرام کا ایک گروہ ایسا بھی تھا ---- حقیقی سرچشمے تھے۔

(ج) علی گڑھ اور دیوبند بظاہر دو قسم کی درسگاہیں تھیں ------ مجاہدِ قوم بن گئے۔

۷۔ نیچے کالم نمبر I میں کچھ الفاظ درج ہیں اور کالم نمبر II میں ان کے متضاد بے ترتیبی سے دیے گئے ہیں۔ جوابی کالم میں ہر لفظ کے سامنے اس کے صحیح متضاد کا حرفی نمبر تحریر کیجیے۔

کالم نمبر I	کالم نمبر II	جوابی کالم
۱۔ زوال	(الف) آشنا	
۲۔ سرسری	(ب) مشکل	
۳۔ مضرت	(ج) عروج	
۴۔ اجنبی	(د) مفصل	
۵۔ سہل	(ہ) مستقبل	
۶۔ حال	(و) نفع	

۸۔ مندرجہ ذیل الفاظ کے واحد لکھیے:۔

اختلافات ۔ خدمات ۔ خطبات ۔ مراحل ۔ وسائل ۔ رجحانات ۔ فضلاء۔ مساکین۔

۹۔ نیچے آٹھ لفظوں کے دو دو تلفظ دیے گئے ہیں۔ آپ جوابی کالم میں صحیح تَلَفُّظ کا

حرفی نمبر درج کیجیے۔

			جوابی کالم
i	(الف) بَدظَنی	(ب) بَدظَنی	
ii	(الف) اَفضَلِیَّت	(ب) اَفضِلیت	
iii	(الف) اَخلَاص	(ب) اِخلَاص	
iv	(الف) فُرَض	(ب) فَرض	
v	(الف) اِستَفادَہ	(ب) اِستِفادَہ	
vi	(الف) مُبالِغَہ	(ب) مُبالَغَہ	
vii	(الف) مَساوَات	(ب) مُساوَات	
viii	(الف) مُحَبَّت	(ب) مُحُبَّت	

- - - - - - - - - - -

ماحول پر انسانی اثرات

(ایک سیر کی رُوداد)

زہیر اور قنبر کے ابو جی کا وعدہ تھا کہ وہ انھیں بہار کے موسم میں اسلام آباد اور ٹیکسلا کی سیر کرائیں گے۔ جونھی مارچ میں سالانہ امتحانات ختم ہوئے، بچوں نے رٹ لگا دی کہ ابو جی! اپنا وعدہ پورا کیجیے۔ آخر وہ دن آ ہی گیا۔ صبح ناشتا کرتے ہی سب لوگ کار میں آ بیٹھے۔ اگلی سیٹ پر امی بیٹھیں۔ پچھلی سیٹ پر ایک دروازے کے ساتھ زہیر اور دوسرے کے ساتھ قنبر لگ کر بیٹھ گیا۔ درمیان میں ان کے دادا آ بیٹھے۔ دادا دھان پان سے آدمی ہیں۔ اس لیے دونوں پوتوں کے درمیان بڑی آسانی سے سینڈوچ ہو گئے۔

ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد دادا جی سیر و سیاحت کے کچھ زیادہ ہی دلدادہ ہو گئے ہیں۔ زہیر اور قنبر سے ان کی خاصی بے تکلفی ہے۔ زہیر نویں جماعت میں پڑھتا ہے اور قنبر چھٹی میں۔ دونوں ماشاء اللہ بہت ذہین ہیں اور جیسا کہ اچھے طالب علموں کا خاصّہ ہونا چاہیے، انھیں سوال پوچھنے کی بہت عادت ہے۔ خاص طور پر زہیر تو نہایت مُتجَسِّس فطرت کا مالک ہے۔ دادا جی بھی سینتیس سال تک لڑکوں کو پڑھاتے رہے، ان کا تجربہ اور علم وسیع ہے اور سوالوں کا جواب دینے کے لیے جس صبر و استقامت کی ضرورت ہے وہ ان کی فطرتِ ثانیہ بن چکے ہیں۔

جونھی کار بند روڈ پر پہنچی دادا جی نے کھانستے ہوئے کہا "ذرا شیشے چڑھا لو، گرد بہت اڑ رہی ہے اور ڈیزل کا دھواں گلے میں پھندا ڈال رہا ہے۔" لڑکوں نے شیشے چڑھا دیے اور دادا جی نے جیب سے "اِن ہیلر" نکالا اور ایک کش لیا۔ اس سے انھیں کچھ افاقہ ہوا۔ دادا جی کو سانس کی تکلیف ہے۔ گرد، دھوئیں، ڈیزل اور

پٹرول کی بُو انھیں بہت پریشان کرتی ہے۔

دادا جی نے کہا "جوں جوں لاہور کی آبادی بڑھتی چلی جا رہی ہے، اس کا ماحول بہت خراب ہوتا چلا جا رہا ہے۔ صفائی کا انتظام نہایت ناقص ہے۔ گندے پانی کا نکاس صحیح طریقے سے نہیں ہوتا۔ موٹر گاڑیوں کو ڈیزل سے چلایا جاتا ہے جو دھواں چھوڑتی رہتی ہیں۔ کچھ کارخانے بھی شہر کے اندر موجود ہیں جن کی چمنیوں سے گاڑھا دھواں نکلتا ہے تو فضا میں بادل سا بن جاتا ہے اس سے تنفّس کے نظام کا بگڑ جانا لازمی ہے۔"

ہمارے سائنس کے استاد نے بتایا تھا کہ ماحول کی آلودگی بہت سی بیماریاں پیدا کرتی ہے۔ زہیر بولا ہاں بہت سی ----- "ایک نظریہ ہے کہ سرطان کی موذی بیماری میں ماحول کی آلودگی سے اضافہ ہوا ہے۔ گھروں میں جو جراثیم کش دوائیں استعمال کی جاتی ہیں ان سے بچوں کو سرطان ہونے کا بہت خطرہ لاحق ہے۔" دادا جی نے جواب دیا۔

کار راوی کے پل پر سے گزر رہی تھی۔ راوی میں پانی بہت کم تھا۔ تبر ان دو چار کشتیوں کو دیکھنے میں محو ہو گیا جو بارہ دری کے قریب پانی کی سطح پر تیر رہی تھیں۔ فضا میں کچھ کشادگی کا احساس ہوا تو دادا جی نے کہا "تبر تھوڑا سا شیشہ نیچے اتار دو" ٹھنڈی ہوا کے خوشگوار جھونکے آئے تو کار کی فضا کچھ بہتر ہو گئی۔ ریل کے پھاٹک سے گزرنے کے بعد شاہراہ کی وسعت میں اضافہ ہو گیا اور کناروں پر درخت نظر آنے لگے۔ کالا شاہ کاکو کے قریب سرسبز کھیتوں کا سلسلہ بھی دور تک پھیل گیا۔

ذرا آگے نکلے تو صنعتی علاقہ شروع ہو گیا۔ ایک پل پر سے کار گزری تو دادا جی نے کہا "زہیر! کبھی لوگ اس نالے کے کنارے پکنک منانے اور مچھلیاں پکڑنے آتے تھے۔ اب اس نالے میں فیکٹریوں کا گندا اور زہریلا پانی شامل ہونے

سے مچھلیاں ختم ہو گئی ہیں۔ دیکھو یہ فیکٹریاں کتنی خوبصورت ہیں۔ رات کو گزرو تو یہاں کی روشنیاں بہت دلکش نظر آتی ہیں جیسے چراغاں کیا گیا ہو۔ یوں بھی کسی ملک کی ترقی کا انحصار ان فیکٹریوں پر ہے اور ان ہی سے بے روزگاری کا مسئلہ بھی حل ہوتا ہے لیکن تصویر کا دوسرا رخ بڑا بھیانک ہے۔ بھلا کیسے؟"

"صاف ظاہر ہے کہ یہ ماحول کو خراب کرتی ہیں"۔ زہیر بولا۔

"ہمارے ملک میں فیکٹریاں کم ہیں اس لیے ماحول کی آلودگی خطرناک حد تک نہیں پہنچی۔ البتہ جن ممالک میں زہریلی گیسیں بنانے اور ایٹمی توانائی پیدا کرنے کے کارخانے بہت زیادہ ہیں وہاں ماحول کو صاف رکھنا ایک حد تک لاینحل مسئلہ بن گیا ہے۔ زہریلی گیسیں ہزار احتیاط کے باوجود بھی ماحول میں سرایت کر جاتی ہیں جن سے جاندار طرح طرح کی تکالیف میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ ان کارخانوں کا ناکارہ مادہ خاص قسم کے بکسوں میں بند کر کے سمندر کی تہہ میں اتار دیا جاتا ہے جن کے حادثاتی طور پر پھٹنے سے سمندر میں تابکاری اثرات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں سمندری نباتات اور حیوانی زندگی متاثر ہو رہی ہے۔"

"کیا سائنس دان اس کا کوئی حل نہیں سوچتے؟" زہیر نے پوچھا۔

"کیوں نہیں؟ سوچتے ہیں لیکن ایک حل دریافت ہوتا ہے تو اس کے رَدِّ عمل میں کوئی اور مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس زمین پر جب سے انسان کو پیدا کیا گیا ہے وہ ماحول سے متصادم ہے۔ قدرت کی تسخیر اس کی فطرت میں ہے لیکن تعمیر و تخریب ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ مثلاً ایندھن کا مسئلہ لو۔ پہلے انسان لکڑی جلا کر آگ پیدا کرتا تھا پھر اس نے زمین سے کوئلہ نکالا، کوئلہ ختم ہونے کو آیا تو تیل نکل آیا لیکن زمین کی کوئی دولت لامتناہی نہیں ہے۔ اب انسان ایٹمی توانائی سے ایندھن کا مسئلہ حل کرنا چاہتا ہے لیکن اس میں ماحول کی آلودگی کا جو بھیانک خطرہ مضمر ہے اس کا تصور ہی اسے پریشان کیے ہوئے ہے۔ ابھی تک تو اس کا کوئی حتمی

حل دریافت نہیں ہوا۔"

یکایک دادا جی کو احساس ہوا کہ وہ بچوں کو بور کر رہے ہیں۔ تنبر تو ان کی حکمت و دانش سے بے نیاز شیشے سے آنکھیں لگائے باہر کے دوڑتے بھاگتے مناظر میں کھویا ہوا تھا۔ یوں بھی صنعتی علاقے کی بدبودار ہوا پیچھے رہ گئی تھی اور اب حد نظر تک گندم کے سرسبز کھیت لہلہا رہے تھے اور ان پر بہار کی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ وسیع و عریض شاہراہ کے دونوں کناروں پر شیشم، سفیدے اور پاپلا کے نوخیز درخت کسی سبز پوش فوج کے سنتری بن کر کھڑے تھے۔ شاہراہ کے عین درمیان سرخ سرخ پھولوں سے لدے ہوئے پودے باد بہار کا آب حیات پی کر مستی میں وجد کر رہے تھے۔ دادا جی خود ایسے مناظر کے بہت شائق تھے۔ ان کے چہرے پر بشاشت تھی۔ وہ بھی شیشے سے باہر کے مناظر دیکھ رہے تھے۔ ایک بچے کی طرح ان کی بوقلمونیوں میں کھو سے گئے تھے۔

کچھ توقف کے بعد وہ بولے "بزرگ کہا کرتے تھے کہ سبزے سے آنکھوں کو طراوت ملتی ہے اور پھول دلوں میں کشادگی پیدا کرتے ہیں۔"

تنبر نے کہا "میرا جی تو چاہتا ہے کہ کچھ دیر کو رکیں اور سڑک کے کنارے بیٹھیں اور چائے پیئیں اور بسکٹ کھائیں۔" زہیر نے تنبر پر طنز کی۔

"چائے بسکٹ کا نام سن کر تو میرے منہ میں بھی پانی بھر آیا ہے زہیر بیٹا!" دادا جی بولے "انسان کی ساری تگ و دو بھی تو چائے بسکٹ کے لیے ہے۔ پہلے ہم دال روٹی کے لیے محنت کرتے تھے، اب چائے بسکٹ کے لیے۔"

عین اس لمحے کار نہر اپر چناب کے پل پر سے گزری تو دادا جی نے پوچھا "تنبر! یہ نہر کس دریا سے نکلتی ہے؟"

"مجھے معلوم نہیں۔" تنبر نے جواب دیا۔

"بیٹے! تمھارا جغرافیہ بہت کمزور ہے۔ جب میں چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا تو مجھے پنجاب کی ہر نہر کا نام معلوم تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ یہ نہر کس دریا سے نکلتی ہے اور کس مقام سے اور کن علاقوں کو سیراب کرتی ہے۔ واپسی پر ہم تمھیں ہیڈ مرالہ دکھائیں گے جہاں سے یہ نہر دریائے چناب سے نکالی گئی ہے۔"

پھر زہیر کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا "کیا تم بتا سکتے ہو کہ نہروں کا کیا فائدہ ہے؟"

"دادا جی! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ نہروں سے ملک کے بنجر علاقوں کو سیراب کیا جاتا ہے۔"

"پنجاب اور سندھ میں نہروں کا جال بچھا ہے لیکن ابھی تک ہم خوراک میں خود کفیل نہیں ہو سکے۔ تربیلا اور منگلا کے مقامات پر دریائے سندھ اور جہلم پر اس قدر بڑے بڑے ڈیم بنانے کے باوجود خوراک کی کمی کا مسئلہ حل نہیں ہوا۔ ایک وجہ یہ ہے کہ ملک کی آبادی میں بے تحاشا اضافہ ہو رہا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ایک طرف بنجر زمینیں آباد ہوتی ہیں تو دوسری طرف زرخیز زمینیں سیم اور تھور کے باعث بنجر ہو جاتی ہیں۔ کوئی زمانہ تھا کہ ہماری بلکہ دنیا کی زراعت کا انحصار بارش پر تھا۔ پھر جہاں پانی نزدیک تھا وہاں کنویں کھودے گئے۔ ہزاروں سال پہلے انسان دریاؤں کے کناروں پر آباد ہوا جہاں سے اسے پینے کے لیے بھی پانی ملتا اور زراعت کے لیے بھی جیسے ہڑپہ اور موہنجوڈارو کے قدیم شہر۔ عراق کا نہری نظام تو کم از کم چار ہزار سال پرانا ہے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جب سے اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کرہ زمین کی امانت سپرد کی ہے اس وقت سے وہ ایک جنگ میں مبتلا ہے یعنی قدرت کی تسخیر، تعمیر اور تخریب ...... سیم اور تھور کے علاج کے لیے سیم نالے کھودے جا رہے ہیں ..... مصنوعی بارش کا طریقہ بھی دریافت ہو چکا ہے، سمندر کے کھاری پانی کو میٹھا بنانے کے لیے پلانٹ ایجاد ہو چکے ہیں۔ یہ کوشش بھی ہو رہی ہے کہ دنیا کے گرم اور خشک منطقوں کی آب و ہوا کو معتدل بنایا جائے ....

قدرتی ماحول کو بدلنے کے یہ سارے طریقے بہت مہنگے ہیں۔ عرب ممالک میں کہ جہاں تیل کی دولت کو دونوں ہاتھوں سے لٹایا جا رہا ہے، یہ مصنوعی طریقے کچھ کامیاب ہوئے ہیں۔"

"جب تیل ختم ہو گیا تو پھر کیا ہو گا؟" زہیر نے پوچھا۔

"اللہ بہتر جانتا ہے ..... ممکن ہے کہ شمسی توانائی سے کام لیا جائے یا ایٹمی توانائی سے ..... لیکن معلوم نہیں کہ اس مسلسل پیکار میں ماحول شکست کھاتا ہے یا انسان .... جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ ابھی تک انسان ایٹمی تابکاری کی مضرت رسانیوں کا کوئی وافی وشافی علاج دریافت نہیں کر سکا۔" دادا جی نے تھکی آواز میں کہا پھر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر ٹانگیں پھیلائیں اور آنکھیں بند کر لیں۔

زہیر کے ابو جی نے کہا "ارے بھائی! تمھارے دادا سیر کرنے آئے ہیں اور تم نے کار میں سکول کھول لیا ہے اب انھیں آرام کرنے دو۔"

یوں بھی سڑک اب آبادی میں سے گزر رہی تھی اور آبادی کے مکینوں نے مسافروں کو خوش آمدید کہنے کے لیے غلاظت کے ڈھیروں اور گڑھوں کے متعفن پانی کی وافر مقدار سڑک کے کنارے جمع کر دی تھی جس سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے اور گرد بھی۔ زہیر اور قنبر نے شیشے چڑھا دیے۔

وزیر آباد کے قریب نالہ پلکھو کا پل عبور ہوتے ہی ماحول نے اپنا فطری لبادہ اوڑھ لیا۔ سڑک کے دونوں طرف سرسبز اونچے اونچے درخت سایہ فگن ہو گئے۔ شاداب کھیتوں اور ہرے بھرے درختوں سے خوشبو کے نیم سرد جھونکے آئے تو سب تازہ دم ہو گئے۔ دریائے چناب میں پانی کم تھا۔ کافی دور تک سڑک کے کنارے کوئی بڑا شہر یا قصبہ آباد نہیں۔ اس لیے فضا میں تازگی برقرار رہی اور ماحول صاف ستھرا رہا۔ کافی دور اور کھاریاں کے درمیان سڑک کے کنارے محکمہ سیاحت والوں

ہوٹل ہے ۔ یہاں کچھ دیر آرام کیا گیا۔ لان میں بیٹھ کر چائے پی اور بسکٹ کھائے۔ لان کی گھاس شاداب تھی اور پھول کھل رہے تھے۔ ساتھ ہی ایک باغ ہے جس کے پھل دار پودے بہت نرم و نازک تھے۔ ماحول نہایت پر سکون تھا۔ پرندوں کے چہچہے کانوں کو بھلے لگ رہے تھے۔

کھاریاں سے آگے سڑک کے دونوں طرف چھوٹے چھوٹے مٹی کے ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہوا جو دور تک چلا گیا۔ ٹیلوں پر پھلا ہی اور کیکر کی جھاڑیاں تھیں۔ کہیں کہیں چھوٹی چھوٹی کھیتیاں نظر آتی تھیں جن میں گندم اگی ہوئی تھی۔ قنبران کیاریوں کو دیکھ کر ہنسنے لگا۔ "دادا جی! یہ کھیت ہیں یا کھیتوں کے بچے؟"

"کھیتوں کے بچے ہی کہہ لو۔ یہ وہ زمین ہے جو پانی کی دست برد سے بچ گئی .... ماہر ارضیات کا خیال ہے کہ آج سے صدیوں پہلے یہاں بہت بڑا جنگل تھا۔ انسان نے جنگل صاف کر کے کہیں کہیں آبادیاں قائم کر رکھی تھیں۔ مزید آبادیاں قائم کرنے کے لیے یا ایندھن کے لیے اس نے جنگل کاٹنا شروع کر دیا اور جو درخت کاٹا اس کی جگہ نیا درخت نہ لگایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سیلاب آنے لگے اور خس و خاشاک کے ساتھ زرخیز مٹی کو بھی بہا لے گئے بے تحاشا کٹاؤ سے اس زرخیز میدان کی صورت ہی بدل گئی۔"

"دادا جی! درخت سیلاب کے پانی کو روک لیتے ہیں؟" زبیر نے پوچھا۔

"سیلاب کے پانی کو نہیں روکتے البتہ اس کی شدت تخریب کو کم کر دیتے ہیں۔ ان کی جڑیں اور ان کے نیچے اگی ہوئی جھاڑیاں، بیل بوٹے اور گھاس مٹی کی حفاظت کرتے ہیں اور اسے بہ جانے سے روکتے ہیں۔"

"مجھے تو یہ علاقہ بہت اچھا لگ رہا ہے۔" قنبر بولا۔

"آج سے پچاس پچپن سال پہلے تک تو اس علاقے کی ویرانی سے ڈر لگتا تھا۔ اب یہاں شجر کاری کی گئی ہے۔ یہ جھاڑیاں مٹی کی محافظ بن گئی ہیں اور علاقہ

خوبصورت نظر آنے لگا ہے۔"

اب ایک عجیب واقعہ ہوا کہ سڑک کے بائیں کنارے دادا جی کو دو سہمے سکڑے تیتر نظر آئے۔ ان کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ "تیتر اور وہ بھی سڑک کے کنارے ...... حیرت ہے۔" زہیر کے ابو نے کار کی رفتار دھیمی کرتے ہوئے کہا "تیتر سڑک کے کنارے کیسے آگئے۔ اباجی! کہیں آپ کی آنکھوں کو دھوکا تو نہیں ہوا؟"

"نہیں بیٹا! وہ تیتر ہی تھے ان کے شکار پر پابندی لگی ہے تو وہ اپنی پناہ گاہوں سے نکلنے کی جرأت کرنے لگے ہیں۔ یہ تیتر سڑک کو عبور کرنا چاہتے تھے اور آتی جاتی گاڑیوں کے شور نے انھیں بوکھلا دیا۔ یہاں سڑک کے دونوں طرف کے ٹیلے بھی خاصے اونچے ہیں اور تیتر کی اڑان بہت محدود ہوتی ہے وہ اوپر کی طرف زیادہ بلندی تک نہیں اڑ سکتا۔ ان علاقوں میں کبھی تیتر عام ملتے تھے۔ صبح صبح ہر طرف سے "سبحان تیری قدرت" کے نغمے گونجتے تھے۔ پھر انسان کے ہاتھ میں بندوق آگئی۔ اس نے اس خوبصورت، خوش گلو، حمد گو اور نعمت خواں پرندے پر چھروں کی بوچھاڑ کر دی کہ جھاڑیاں بھی اسے حفظ وسلامتی کا حصار مہیا نہ کر سکیں۔ اب حکومت نے اس کے شکار پر پابندی لگائی ہے تو "سبحان تیری قدرت" کا نغمہ کبھی کبھار سننے میں آجاتا ہے۔ میرے ایک دوست ہیں جو گاؤں میں رہتے ہیں عرصہ ہوا میں ان سے ملنے گیا۔ پکی سڑک سے ان کا گاؤں کچھ فاصلے پر ہے۔ راستے میں ایک قطعہ زمین پڑا کہ جہاں سرکنڈوں کے جھنڈ تھے۔ اچانک تیتر نغمہ سرائی کرنے لگے۔ میں ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے اتنا روحانی کیف ملا کہ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کچھ ہی دن ہوئے وہ دوست مجھے ملے تو میں نے پوچھا کیا سرکنڈوں کے جھنڈ میں اب بھی تیتر بولتا ہے کہنے لگے کہ نہیں، شکاری کی بندوق سے جو تیتر بچے تھے انھیں کھیتوں میں ڈالی جانے والی کیڑے مار دوائیاں ہلاک کر گئیں .... دادا جی خاموش ہو گئے۔ پھر نہایت دھیمی آواز میں بولے "ہماری دنیا پر پرندوں اور جانوروں کا بھی حق ہے بلکہ ان کی

وجہ سے دنیا کی رونق بھی قائم ہے۔ مور، تیتر، فاختہ، کبوتر، ہرن، نیل گائے، اڑیال، شیر، ہاتھی وغیرہ۔"

"دادا جی! پرندے اور جانور اگر زیادہ بڑھ جائیں تو ان کا نقصان بھی تو ہے۔" زہیر نے کہا۔

"کیوں نہیں! چڑیاں، طوطے اور کوے فصلوں کا بہت نقصان کرتے ہیں۔ اسی طرح ہرن اور نیل گائے وغیرہ بھی کھیت چر جاتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کا قتل عام کر دیا جائے۔ زہیر بیٹا! فطرت بذات خود ماحول میں ایک نہایت حکیمانہ توازن قائم رکھتی ہے۔ پرندوں اور جانوروں کی تعداد کو مناسب حد سے بڑھنے نہیں دیتی۔ پرندوں میں اس نے باز، جرے، شکرے اور عقاب بھی پیدا کیے ہیں اور جانوروں میں شیر اور بھیڑیے بھی۔ تاہم انسان کو بھی اجازت ہے کہ وہ اپنی ضرورت کے مطابق ان کا شکار کر سکتا ہے۔ چڑیاں کھیت سے دانہ چگ لیتی ہیں لیکن کیڑے مکوڑوں کا شکار بھی تو کرتی ہیں۔ تلیر نڈی کا بہت دشمن ہے۔ تلیر نڈی دل میں اڑتا چلا جاتا ہے اور خیاط کی طرح نڈیوں کو کترتا چلا جاتا ہے۔ نڈی کی کمر دھاگے کی طرح باریک ہوتی ہے۔ اس کا گودا اسے بہت پسند ہے۔ چین میں چڑیاں فصل کو نقصان پہنچاتی تھیں۔ انھیں یکسر ختم کر دیا گیا۔ اب وہاں ایک خاص قسم کی سنڈی نے مسئلہ پیدا کر دیا ہے۔ کبھی اس سنڈی کو چڑیاں چگ لیا کرتی تھیں۔"

اب دادا جی نے آنکھیں بند کر لیں۔ زہیر اور قنبر نہروں، نالوں اور ان پر سے گزرتے ہوئے پلوں کا منظر دیکھنے میں محو ہو گئے۔ ٹرکّی کے پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہوا تو ہر موڑ پر منظر بدل جاتا تھا۔ دونوں بھائی سڑک کے پیچ وخم میں کھوئے رہے حتیٰ کہ راولپنڈی پہنچ گئے۔ یہاں انھوں نے اپنی پھوپھی کے ہاں قیام کیا۔ اگلے دن اسلام آباد کی سیر کی۔ شکر پڑیاں، راول ڈیم فیصل مسجد اور دامن کوہ دیکھے۔ اسلام آباد درختوں کا شہر ہے جہاں قدرتی ماحول برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جنگل، پہاڑ، نشیب وفراز اور ان کی ترتیب نو میں ایک خاص حُسن موجود ہے۔

لڑکے تو ان مناظر میں کھو کر گنگ سے ہو گئے۔ یوں بھی اسلام آباد کے ماحول میں اتنا سکون ہے کہ بولنے کو جی نہیں چاہتا۔ گویا بقول اقبال :

ع ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو

واپسی پر تبر نے کہا "دادا جی! پاکستان کے سارے شہر ایسے ہی ہونے چاہییں۔"

"یہ کیسے ممکن ہے تبر بیٹا! ہاں البتہ سارے شہر ایسے ہی صاف ستھرے ضرور ہونے چاہییں۔ کبھی لاہور بھی درختوں کا شہر تھا۔ اب سڑکیں چوڑی ہو رہی ہیں اور ان کے کناروں پر سے کئی سایہ دار درخت کاٹے جا رہے ہیں۔ درخت ماحول میں جہاں حسن پیدا کرتے ہیں وہاں ہوا میں تازگی اور خنکی بھی برقرار رکھتے ہیں۔ درخت بارش کے لانے کا سبب بھی بنتے ہیں یعنی اوپر سے گزرتے ہوئے بادلوں کو بن برسے نہیں جانے دیتے۔ دن کے وقت آکسیجن چھوڑتے ہیں اور فضا میں پاکیزگی پیدا ہوتی ہے جہاں درخت زیادہ ہوں گے وہاں کی فضا زیادہ صاف، شفاف، منزہ اور لطیف ہو گی کہ سانس لینے میں آسانی ہو گی۔"

"جبھی تو آپ صبح صبح گھر کے صحن میں جو امرود کے دو درخت ہیں ان کے نیچے کھڑے ہو کر زور زور سے سانس لیتے ہیں۔" تبر نے ہنس کر کہا۔

"بہت خوب! دادا جی بولے "اس وقت میرے پھیپھڑوں کو آکسیجن کی بہت ضرورت ہوتی ہے انسان نے درخت کے ساتھ ایسا ہی ظلم روا رکھا تو وہ دن دور نہیں جب انسان کو منہ پر آکسیجن کا ماسک چڑھائے رکھنا ہو گا۔"

اگلے روز وہ ٹیکسلا گئے۔ عجائب گھر دیکھنے کے بعد ٹیکسلا کے آثار قدیمہ دیکھے۔ دادا جی "سرکپ" کے راج محل کی ایک دیوار پر بیٹھے مراقبے میں چلے گئے

نہ جانے وہ ماضی کے کن کن زمانوں کی سیر کر رہے تھے کہ زہیر نے ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھا۔ ان کی آنکھ کھل گئی۔ کھنڈروں پر دھوپ چھائی ہوئی تھی اور ہو کا عالم طاری تھا۔

وہ بولے "آج سے دو ہزار سال پہلے یہ شہر آباد تھے۔ ان میں ہنستے بولتے لوگ چلتے پھرتے تھے۔ پھر یہ بستیاں اُجڑ کر آنے والی نسلوں کے لیے عبرت کا نمونہ بن گئیں۔"

"دادا جی! ٹیکسلا کی بستیاں برباد کیوں ہوئیں؟"

"بیٹا! بستیاں اس وقت برباد ہوتی ہیں جب وہ قانونِ فطرت سے سرتابی کرتی ہیں۔ یہ لوگ اپنے ماحول کو اپنے ہاتھوں درہم برہم کر بیٹھے۔ کبھی یہ وسیع وعریض علاقہ نہایت زرخیز اور آباد تھا۔ یہاں بارش سونا برساتی تھی اور پہاڑوں سے آنے والے ندی نالے اس کے مکینوں کو صاف شفاف پانی مہیا کرتے تھے۔ پھر یہ ہوا کہ لوگوں نے پہاڑوں اور میدانوں سے جنگلوں کا صفایا کر دیا پہاڑوں سے سیلاب آئے اور میدانوں میں بارش کم ہو گئی۔ سیلاب زرخیز مٹی کو بہا کر لے گئے اور میدان بنجر ہو گئے-----"

"تو لوگ شہروں کو خالی کر گئے؟" زہیر نے پوچھا۔

"بیٹا! شہروں کی زندگی کا دارومدار دیہاتوں پر ہوتا ہے۔ دیہات اجڑ جائیں تو شہر بھی اجڑ جاتے ہیں۔ ٹیکسلا کا میدان بانجھ ہوا تو اس کے شہر کھنڈر بن گئے۔ لوگ در و دیوار پر حسرت کی نگاہیں ڈالتے ہوئے زرخیز زمینوں کی تلاش میں روانہ ہو گئے۔ صدیوں کی خس و خاشاک نے انھیں یوں ڈھانپا کہ وہ انسان کی نظر سے اوجھل ہو گئے۔ جب جدید دَور کے انسان کو اپنے ماضی کی جستجو ہوئی تو اس نے خس و خاشاک دُور کر کے ان شہروں کو دریافت کیا۔"

"اب تو یہاں زمینیں آباد نظر آ رہی ہیں اور کارخانے بھی اگ رہے ہیں۔" زہیر نے کہا۔

"زہیر! جب ہم سرکپ کے کھنڈرات کی طرف آئے تھے تو راستے میں ایک نالے کے پُل پر سے گزرے تھے۔ پُل سے دور نیچے نالے میں پانی بہتا ہے۔ میری نگاہ کو اگر دھوکا نہیں ہوا تو پانی مجھے کلا کلا سا نظر آیا۔"

واپسی پر پل پر سے گزرتے وقت زہیر نے جھانک کر نیچے دیکھا اور کہا کہ دادا جی! واقعی آپ ٹھیک کہتے تھے مجھے بھی نالے کا پانی کلا کلا سا نظر آ رہا ہے۔

"معلوم ہوتا ہے کہ اس نالے میں کارخانوں کا گندا پانی ڈالا جاتا ہے۔ اسلام آباد کی سیر میں مَیں نے تمھاری توجہ ان نالوں کی طرف نہیں دلائی تھی جو شہر کا گندا پانی لے کر نالہ لئی میں ملنے کو بہ رہے تھے مبادا کہ سیر کا مزا کرکرا ہو جائے۔"

"دادا جی! کیا ماحول کی آلودگی کا علاج بھی ہے؟" زہیر نے پوچھا۔

"کیوں نہیں؟ ضرور ہے۔ شہروں کو صاف ستھرا رکھا جائے اور کارخانے لگانے سے پہلے ان کے ضرر رساں پہلوؤں کا مداوا بھی تلاش کر لیا جائے --- حفظ ماتقدم علاج سے کہیں بہتر ہے --- درختوں میں اضافہ کیا جائے --- پہاڑوں پر درخت لگائے جائیں --- جانوروں اور پرندوں کی افزائش پر توجہ دی جائے اور آبادی کے بے تحاشا اضافے سے جو مسائل پیدا ہوتے ہیں انھیں نظر میں رکھا جائے -----"

(سید غلام الثقلین نقوی)

سوالات

۱۔ ماحول سے کیا مراد ہے؟

۲۔ انسان اپنے ماحول پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے؟

۳۔ ماحول کی آلودگی کا مطلب کیا ہے؟ اس سے انسانی زندگی کو کوئی نقصان پہنچتا ہے یا نہیں۔

۴۔ ماحول کو بہتر بنانے کے لیے کیا کیا تدابیر اختیار کی جا سکتی ہیں؟

~~~~~~~~~~
~~~~~~~~~~

انسان اور اس کا ماحول

جب سے انسان دنیا میں آباد ہوا ہے وہ مختلف زمانوں میں تہذیب و ترقی کی کئی منزلوں سے گزر کر آج کے مہذب دور تک پہنچا ہے۔ ابتدائی دور میں انسان نے بھی دیگر جانوروں جیسی زندگی گزاری لیکن جوں جوں انسانی آبادی میں اضافہ ہوا۔ اس نے مچھلیوں اور دوسرے جانوروں کا شکار شروع کیا۔ اس مقصد کے لیے اس نے پتھروں اور ان سے بنے ہوئے ہتھیار بھی استعمال کیے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خوراک کی بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اس نے جنگلی جانوروں کو سدھا کر پالنے کی طرف توجہ دی۔ پھر جب ان کا دودھ اور گوشت بھی ناکافی ثابت ہوا تو جانوروں کی مدد سے کھیتی باڑی شروع کی۔ بعض مخصوص علاقوں میں زمین کی کھدائی کے دوران میں معدنیات دریافت ہوئیں جو آنے والے زمانے میں بے حد مفید ثابت ہوئیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے وہ اپنی ذہانت اور ہمت سے کام لے کر ناساز گار حالات اور ناموافق ماحول پر قابو پا لیتا ہے۔ دھاتوں کی دریافت کے بعد اس نے ایک قدم آگے بڑھایا یعنی پہیہ اور پھر مشینیں بنائیں، بھاپ کے انجن کی ایجاد کے بعد دنیا کے مختلف حصوں میں صنعتی انقلاب رونما ہوا۔ یہ جدوجہد جاری تھی کہ عصر حاضر میں "ایٹمی توانائی" کی تحقیق نے اقوام عالم کو حیرت میں ڈال دیا۔ اس توانائی کے ذریعہ انسان نے دنیا کی وسیع تر معلومات حاصل کرنے کے علاوہ گرد و نواح کے سیاروں اور ستاروں پر کمندیں ڈالنا شروع کر دیں۔ خصوصاً چاند تک رسائی اس کی بے مثل کامیابی ہے۔

سائنس کی ترقی نے انسان اور اس کے قدرتی ماحول کے درمیان تعلق کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ سائنسدانوں کے نظریات کے مطابق ہم جدید ٹیکنالوجی کی مدد

سے ماحول کو تابع بنا کر اپنا مستقبل روشن کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر تسخیرِ کائنات کے علاوہ صنعتی انقلاب ، زرعی انقلاب ، سمندر کی تہ سے معدنیات کی دریافت ، صحرائی علاقوں کو مصنوعی بارش کی مدد سے سرسبز وشاداب بنانا ، سمندر کے کھاری پانی کو پینے اور آبپاشی کے قابل بنانا ، شمسی اور ایٹمی توانائی کا پُرامن استعمال وغیرہ وغیرہ۔

یہ بات درست ہے کہ انسان اپنی سوجھ بوجھ اور جانفشانی سے نا مساعد حالات پر حاوی ہو جاتا ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ وہ اپنے قدرتی ماحول سے حد درجہ متاثر ہوتا ہے۔ اس کی بود و باش ، خوراک ، لباس اور اقتصادی ترقی اس کے طبیعی ماحول کے مطابق ہوتی ہے جس میں وہ رہتا بستا ہے۔

جہاں تک طبیعی حالات کا تعلق ہے اتنا تو ہم سب جانتے ہیں کہ زمین کی سطح ہر جگہ یکساں نہیں ہے۔ اس پر کہیں بلند و بالا پہاڑ ہیں ، کہیں سطح مرتفع اور کہیں میدان۔ پہاڑی علاقے پتھریلے اور ناہموار ہونے کی وجہ سے کاشتکاری کے لیے موزوں نہیں ہوتے۔ اسی طرح سطح مرتفع کے علاقے بھی اونچے نیچے ہوتے ہیں اور وہاں کھیتی باڑی محدود پیمانے پر ہوتی ہے مگر قدرت نے ان علاقوں کو معدنی دولت سے مالا مال کر رکھا ہے۔ اب رہے میدانی علاقے خصوصاً دریاؤں کی وادیاں جو زمانہ قدیم سے تہذیب وتمدن کا گہوارہ رہی ہیں۔ دورِ حاضر میں انسان نے نہروں ، سڑکوں اور دیگر ذرائع آمدورفت کے جال بچھا دیے ہیں۔ زراعت اپنے عُروج پر ہے۔ چنانچہ دنیا کی بیشتر آبادی میدانی علاقوں ہی میں پائی جاتی ہے۔

یہ انسانی طبیعت کا خاصہ ہے جہاں حالات ، آب وہوا موافق ہو بود و باش اختیار کرتا ہے۔ مختلف زرعی اجناس کی پیداوار کا انحصار بھی موافق آب وہوا پر ہوتا ہے۔ اسی طرح حیوانی زندگی بھی طبیعی حالات ، آب وہوا اور نباتات پر منحصر ہوتی ہے۔ گویا دنیا کے جن خطوں میں موزوں آب وہوا نے خوشگوار ماحول پیدا کیا ہے وہاں انسان نے بہت زیادہ زرعی واقتصادی ترقی کی ہے۔ اس کے برعکس دنیا کے بعض علاقوں میں قدرتی ماحول نے انسان کے لیے بہت سی مشکلات پیدا کی ہیں مثلاً

ٹنڈرا کا علاقہ، بڑے بڑے ریگستان اور استوائی جنگلات کا خطہ۔ ظاہر ہے ایسے علاقوں میں آبادی بہت کم ہے اور وہاں کے رہنے والے لوگ تہذیب و ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔

قیاس کیا جاتا ہے کہ کرۂ ارض کئی کروڑ سال پرانا ہے۔ اس دوران میں اس کرۂ ارض پر سمندر، پہاڑ اور میدان گرم استوائی اور سرد قطبی علاقوں کی ماحولیاتی حدود تبدیل ہوتی رہی ہیں۔ یہ تبدیلیاں نظامِ قدرت کا اہم حصہ ہیں۔ روئے زمین پر کچھ تبدیلیاں اتنی پرانی ہیں کہ وہ صرف ماہرینِ علم الارض کی دلچسپی کا باعث ہیں۔ ان میں بعض تبدیلیاں ایسی ہیں جو ہماری زندگیوں کو براہ راست متاثر کر رہی ہیں مگر ان کی رفتار ست ہے جیسے جنگلات زمین کے اندر دھنسنے کے بعد حرارت اور دباؤ کی وجہ سے کوئلے میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ تبدیلیاں اچانک اور فوری نوعیت کی ہوتی ہیں اور کسی بھی ماحولیاتی طبقے میں تبدیلی کا سبب بن سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر آتش فشانی عمل اور زلزلے کی وجہ سے سطح زمین پر پہاڑ اور نشیبی علاقے بن جاتے ہیں۔ اسی طرح دن رات اور موسموں کا تغیر و تبدل ماحول پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔

انسان ہمیشہ اپنے قدرتی ماحول سے جنگ کرتا رہا ہے تاکہ اسے اپنی ضرورت کے مطابق تبدیل کر کے قدرت کے عطا کیے ہوئے وسائل سے فائدہ اٹھائے۔ انسان کی اس مسلسل کوشش ہی میں اس کی ترقی کا راز مضمر ہے۔ لیکن انسانی تہذیب و معاشرت جتنی تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کر رہی ہے اتنی ہی برق رفتاری سے قدرتی وسائل کے استعمال میں اضافہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ یہ اندیشہ ہے کہ بعض قدرتی وسائل کا ذخیرہ ختم نہ ہو جائے خصوصاً معدنی ذخائر جو اگر ایک مرتبہ ختم ہو جائیں تو ان کی تجدید نہیں ہو سکتی ہے۔

قدرتی وسائل کے بے دریغ استعمال کے ساتھ ساتھ موجودہ زمانے میں ماحولیاتی آلودگی میں مسلسل اضافہ کرۂ ارض پر انسانی بقا کے لیے ایک مستقل خطرہ کا

باعث بن رہا ہے۔ اس میں فضائی آبی اور زمینی آلودگی سب ہی شامل ہیں۔ سائنس دانوں کی تحقیق کے مطابق ماحول کی بڑھتی ہوئی آلودگی مستقبل کی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن رہی ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں فضائی آلودگی میں مسلسل اضافہ ایک ایسا مسئلہ بن گیا ہے جس کا خاطر خواہ حل تلاش کرنا نہایت ضروری ہے۔ فضائی آلودگی کی اصل وجہ فضا میں مختلف قسم کی مہلک گیسوں کی زیادتی ہوتی ہے جو کہ گرد و پیش موٹر گاڑیوں اور کارخانوں میں ایندھن کے جلنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ فضا میں ان ہی گیسوں کی زیادتی کی وجہ سے کئی قسم کی مہلک بیماریاں جنم لے رہی ہیں۔

سائنس کی حیرت انگیز ایجادات اور روز افزوں سہولتوں کا بقول بعض ماہرین ایک مضر پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ قدرتی ماحول میں انسان کی بے جا مداخلت کے باعث زمین کی زرخیزی میں کمی ہو رہی ہے۔ زیر زمین پانی کے ذخیروں کی قلت اور سیم و تھور میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ معدنی وسائل روز بروز محدود اور جنگلی جانور ناپید ہو رہے ہیں۔ اسی طرح ایٹمی تجربات کی کثرت اور فضائی آلودگی میں مسلسل زیادتی کا رجحان پایا جاتا ہے۔ یہ سارے حقائق ظاہر کرتے ہیں کہ انسان کو اپنے ماحول پر مکمل اختیار حاصل نہیں ہے۔ چنانچہ دور اندیشی کا تقاضا ہے کہ وہ قدرتی ماحول کو حُزم و احتیاط کے ساتھ استعمال میں لائے تاکہ نسلِ انسانی کو تباہی سے بچایا جا سکے۔ ماحول میں اس بڑھتی ہوئی آلودگی کو مدنظر رکھتے ہوئے قومی و بین الاقوامی سطح پر کوششیں کی جا رہی ہیں کہ اس میں مزید اضافہ نہ ہونے پائے۔

(پروفیسر مشرف علی انصاری)

سوالات

۱۔ سائنس کی ایجادات نے ہمیں بہت سے فائدے پہنچائے لیکن اس کے ساتھ ہی ان سے نقصان بھی پہنچا۔ ماحول کو خراب کرنے میں سائنسی ایجادات کس حد تک ذمے دار ہیں؟

۲۔ ہمارے زمانے میں کن کن باتوں کی بنا پر ماحول کی آلودگی میں اضافہ ہوتا ہے؟ اس سے کیسے نجات حاصل کی جا سکتی ہے؟

۳۔ ماحول کو صاف ستھرا رکھنے میں انسان کا تہذیبی شعور اور شہری احساس کس طرح مددگار ثابت ہوتے ہیں؟

~ ~ ~ ~ ~ ~ ~ ~ ~ ~

حصّہ نظم

حمد

کون جانے تجھے کہاں تُو ہے
دُوسرا کون ہے جہاں تُو ہے

سو نشانوں میں بے نشاں تُو ہے
لاکھ پردوں میں تُو ہے بے پردہ

کہیں پنہاں کہیں عیاں تُو ہے
تُو ہے خلوت میں تو ہے جلوت میں

میزباں تُو ہے میہماں تُو ہے
نہیں تیرے سوا یہاں کوئی

جلوہ فرما یہاں وہاں تُو ہے
نہ مکاں میں نہ لامکاں میں کچھ

خوب دیکھا تو باغباں تُو ہے
رنگ تیرا چمن میں، بو تیری

جس کو کہتے ہیں رازداں تُو ہے
محرمِ راز تو بہت ہیں **امیرؔ**

(امیرؔ مینائی)

سوالات

۱۔ حمد کسے کہتے ہیں؟ کسی دوسرے شاعر کی کوئی اچھی سی حمد تلاش کر کے اپنی کاپی میں لکھیے۔

۲۔ اس نظم میں شاعر نے جو خیالات بیان کیے ہیں ان کا خلاصہ لکھیے۔

۳۔ چھٹے شعر کا مرکزی خیال لکھیے۔

۴۔ ہر شعر کے آخر میں آنے والے ہم آواز اور ہم وزن الفاظ کو "**قافیہ**" کہتے ہیں۔ مثلاً اوپر کی نظم میں کہاں، نشاں اور عیاں قافیے ہیں۔ قافیے کے بعد جو الفاظ بار بار جوں کے توں دہرائے جاتے ہیں انھیں "**ردیف**" کہا جاتا ہے۔ اوپر کی نظم کے ہر دوسرے مصرعے میں "تو ہے" کے الفاظ **ردیف** ہیں۔ اس نظم میں آنے والے تمام قافیوں کی نشاندہی کیجیے۔

۵۔ جلوت ۔ پنہاں ۔ میزباں ۔ مکاں ۔ یہاں ۔ محرم ۔ کے متضاد لکھیے۔

نعت

دیکھی نہیں کسی نے اگر شانِ مصطفیٰؐ
دیکھے کہ جبرئیلؑ ہے دربانِ مصطفیٰؐ

لُطفِ خدائے پاک کی تصویر کھنچ گئی
پھرنے لگے جب آنکھ میں احسانِ مصطفیٰؐ

پھیلا ہوا ہے اَسوَد و اَحمر کے واسطے
صحنِ عرب سے تا بہ عَجَم خوانِ مصطفیٰؐ

رکھے وہ یاد، خسروِ پرویز کا مآل
پہنچا ہو جس کے ہاتھ میں فرمانِ مصطفیٰؐ

میرے ہزار دل ہوں تَصَدُّق حُضورؐ پر
میری ہزار جان ہو قربانِ مصطفیٰؐ

رشتہ مرا خدا کی خدائی سے ٹوٹ جائے
چھوٹے، مگر نہ ہاتھ سے دامانِ مصطفیٰؐ

(مولانا ظفر علی خاں)

سوالات

۱۔ اس نظم میں آنے والے قافیوں اور ردیف کی نشاندہی کیجیے۔

۲۔ دی ہوئی فہرستوں میں سے صحیح لفظ لگا کر جملے کا حل کیجیے۔

(الف) نبیوں کی طرف وحی لے کر آنے والے فرشتے کو ـــــ کہتے ہیں۔

(عزرائیل ۔ اسرافیل ۔ جبرائیل ۔ میکائیل)

(ب) جو نظم رسولِ پاک ؐ کی تعریف میں لکھی جائے اسے ----- کہتے ہیں۔

(حمد ۔ نعت ۔ قصیدہ)

۳۔ اس نظم کے چوتھے شعر میں کس تاریخی واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے؟

۴۔ آسُودَہ و اُخرِیٰ۔ صحنِ عرب۔ آنکھ میں ۔ ہزار جان۔ خدا کی خدائی مرکّبِ ناقص کی کون کون سی قسم ہیں؟

اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

دنیا عجب بازار ہے ، کچھ جنس یاں کی ساتھ لے
نیکی کا بدلہ نیک ہے ، بُد سے بدی کی بات لے
میوہ کھلا میوہ ملے ، پھل پھول دے پھل پات لے
آرام دے آرام لے ، دکھ درد دے آفات لے

کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے ، اِس ہات دے اُس ہات لے

جو چاہے لے چل اس گھڑی ، سب جنس یاں تیار ہے
آرام میں آرام ہے ، آزار میں آزار ہے
دنیا نہ جان اس کو میاں ، دریا کی یہ منجدھار ہے
اُوروں کا بیڑا پار کر ، تیرا بھی بیڑا پار ہے

کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے ، اس ہات دے اس ہات لے

کر چک جو کچھ کرنا ہے اب ، یہ دم تو کوئی آن ہے
نقصان میں نقصان ہے ، احسان میں احسان ہے
تہمت میں یاں تہمت لگے ، طوفان میں طوفان ہے
رحمان کو رحمان ہے ، شیطان کو شیطان ہے

کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے ، اِس ہات دے اُس ہات لے

اپنے نفع کے واسطے ، مت اور کا نقصان کر
تیرا بھی نقصان ہوئے گا ، اس بات اوپر دھیان کر
کھانا جو کھا تو دیکھ کر ، پانی پیے تو چھان کر
یاں پاؤں کو رکھ پھونک کر ، اور خوف سے گُزران کر

کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے ، اِس ہات دے اُس ہات لے

غفلت کی یہ جاگہ نہیں ، یاں صاحبِ اِدراک رہ
دل شاد رکھ دل شاد رہ ، غمناک رکھ غمناک رہ
ہر حال میں تُو بھی نظیرؔ ، اب ہر قدم کی خاک رہ
یہ وہ مکاں ہے او میاں ، یاں پاک رہ بے باک رہ

کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے ، اِس ہات دے اُس ہات لے

(نظیرؔ اکبر آبادی)

مُفلسی

جب آدمی کے حال پہ آتی ہے مفلسی
کِس کِس طرح سے اس کو ستاتی ہے مفلسی
پیاسا تمام روز بٹھاتی ہے مفلسی
بھوکا تمام رات سُلاتی ہے مفلسی

یہ دکھ وہ جانے جس پہ کہ آتی ہے مفلسی

جو اہلِ فضل عالم و فاضل کہاتے ہیں
مُفلِس ہوئے تو کلمہ تلک بھول جاتے ہیں
پوچھے کوئی "اَلِف" تو اسے "بے" بتاتے ہیں
وہ جو غریب غرباء کے لڑکے پڑھاتے ہیں
ان کی تو عُمر بھر نہیں جاتی ہے مفلسی

مُفلِس کی کچھ نظر نہیں رہتی ہے آن پر
دیتا ہے اپنی جان وہ ایک ایک نان پر
ہر آن ٹوٹ پڑتا ہے روٹی کے خوان پر
جس طرح کُتے لڑتے ہیں اک اُستخوان پر
ویسا ہی مفلسوں کو لڑاتی ہے مفلسی

جب مفلسی ہوئی تو شرافت کہاں رہی
وہ قدر ذات کی، وہ نجابت کہاں رہی
کپڑے پھٹے تو لوگوں میں عزت کہاں رہی
تعظیم اور تواضع کی بابت کہاں رہی
مجلس کی جوتیوں پہ بٹھاتی ہے مفلسی

دنیا میں لے کے شاہ سے اُے یارو تا فقیر
خالق نہ مفلسی میں کسی کو کرے اسیر
اشراف کو بناتی ہے اک آن میں حقیر
کیا کیا میں مفلسی کی خرابی کہوں نظیرؔ
وہ جانے جس کے دل کو جلاتی ہے مفلسی

(نظیر اکبر آبادی)

سوالات

۱۔ نظم "اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے" کا مرکزی خیال لکھیے۔

۲۔ اس نظم میں شاعر نے ہمیں کس بات کی نصیحت کی ہے؟

۳۔ مفلسی میں انسان پر کیا گزرتی ہے؟ اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۴۔ ہمارے معاشرے میں ایک مفلس انسان کو عام طور پر کس نظر سے دیکھا جاتا ہے۔؟

۵۔ علم سے عالم اسمِ فاعل ہے مندرجہ ذیل سے اسمِ فاعل بنائیے :۔
ظلم ۔ قتل ۔ صبر ۔ عدل ۔ شکر ۔ حکم ۔

۶۔ جس نظم کے ہر بند میں پانچ مصرعے ہوں اسے مخمّس کہتے ہیں ۔ ان پانچ مصرعوں میں پہلے چار مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں جبکہ پانچویں مصرعے کا قافیہ الگ ہوتا ہے۔ نظیرؔ اکبر آبادی کے کسی اور مشہور مخمّس کا عنوان لکھیے۔

- - - - - - - - - -

میدانِ کربلا میں گرمی کی شدت

گرمی کا روزِ جنگ کی کیونکر کروں بیاں
ڈر ہے کہ مثلِ شمع نہ جلنے لگے زباں
وہ لُو کہ اَلحذر وہ حرارت کہ اَلاماں
رَن کی زمیں تو سرخ تھی اور زرد آسماں

آبِ خنک کو خَلق ترستی تھی خاک پر
گویا ہَوا سے آگ برستی تھی خاک پر

شیر اٹھتے تھے نہ دھوپ کے مارے کچھار سے
آہو نہ منہ نکالتے تھے سبزہ زار سے
آئینہ مہر کا تھا مُکدّر غبار سے
گَردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے

گرمی سے مُضطرِب تھا زمانہ زمین پر
بُھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

گرداب پر تھا شعلۂ جوالہ کا گماں
انگارے تھے حُبابِ تو پانی شرر فشاں
منہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں
تہ پر تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں

پانی تھا آگ ، گرمیِ روزِ حساب تھی
ماہی جو سیخِ موج تک آئی کباب تھی

وہ گرمیوں کے دن وہ پہاڑوں کی راہ سخت
پانی نہ منزلوں نہ کہیں سایۂ درخت
ڈوبے ہوئے پسینوں میں ہیں غازیوں کے رُخت
سنولا گئے ہیں رنگ جوانانِ نیک بخت

راکب عبائیں چاند سے چہرے پہ ڈالے ہیں
تونسے ہوئے سمُند زبانیں نکالے ہیں

وہ دن ہیں جن دنوں کوئی کرتا نہیں سفر
صحرا کے جانور بھی نہیں چھوڑتے ہیں گھر
رنج مسافرت میں ہیں سلطانِ بحر و بر
لب برگِ گُل سے خشک ہیں چہرہ عرق میں تر

آتی ہے خاک اڑ کے یمین و یسار سے
گیسوئے مُشک بار اَٹے ہیں غبار سے

امامِ حسین رضؓ کی شہادت

چلتے تھے چار سمت سے بھالے حسینؓ پر
ٹوٹے ہوئے تھے برچھیوں والے حسینؓ پر
قاتل تھے خنجروں کو نکالے حسینؓ پر
یہ دکھ نبیؐ کی گود کے پالے حسینؓ پر

تیرِ ستم نکالنے والا کوئی نہیں
گرتے تھے اور سنبھالنے والا کوئی نہیں

زخموں سے چُور چُور ہوا فاطمہؓ کا لال
سروِ ریاضِ احمدؐ و حیدرؓ ہوا نڈھال
چہرے پہ خون ئل کے بصد حسرت و ملال
کی عرض شہؓ نے شکر ہے اے رب ذوالجلال!
بچپن سے روز و شب تھی یہی آرزو مجھے
یا رب! تیرے کرم نے کیا سرخرو مجھے

لاکھوں میں ایک بیکس و دلگیر ہائے ہائے!
فرزندِ فاطمہؓ کی یہ توقیر ہائے ہائے!
بھالے وہ اور پہلوئے شبیرؓ ہائے ہائے!
وہ زہر میں بجھائے ہوئے تیر ہائے ہائے!
غصے میں تھے جو فوج کے سرکش بھرے ہوئے
خالی کیے حسینؓ پہ تُرکش بھرے ہوئے

وہ گُرد تھے جو بھاگتے پھرتے تھے وقتِ جنگ
اک سنگ دل نے پاس سے مارا جبیں پہ سنگ
صدمے سے زرد ہو گیا سبطِ نبیؐ کا رنگ
ماتھے پہ ہاتھ تھا کہ گلے پر لگا خدنگ
تھاما گلا جنابؓ نے ماتھے کو چھوڑ کے
نکلا جو تیر حلقِ مبارک کو توڑ کے

گر کر کبھی اٹھے کبھی رکھا زمیں پہ سَر
اگلا کبھی لہو تو سنبھالا کبھی جگر
حسرت سے کی خیام کے جانب کبھی نظَر
کروٹ کبھی تڑپ کے ادھر لی کبھی اُدھر

اٹھ بیٹھے جب، تو زخموں سے برچھی کے پھل گرے
تیر اور تن میں گڑ گئے جب منہ کے بَل گرے

جنگل سے آئی فاطمہ زہراؑ کی یہ صدا
امت نے مجھ کو لوٹ لیا وا محمداؐ!
اس وقت کون حقِ محبت کرے ادا
ہَے ہَے یہ ظلم اور دو عالم کا مقتدا

انیس سو ہیں زخم تنِ چاک چاک پر
زینبؑ نکل، حسینؑ تڑپتا ہے خاک پر

زینبؑ اِدھر تڑپ کے گری اور حرم ادھر
قاتل نے تیغ پھیر دی سیّد کے حلق پر
ہاتف نے آسماں سے صدا دی پکار کر
فریاد! کٹ گیا پسرِ فاطمہؑ کا سر

بے جاں لبِ فرات شہِ تشنہ لب ہوا
مارا گیا امامِ زماںؑ تو غضب ہوا

دیکھا جو اہلِ بیتِؑ نبیؐ نے اٹھا کے سر
نیزے پہ آفتابِ امامت پڑا نظر
دوڑے سروں پہ خاک اُڑاتے بچشمِ تر
دیکھا یہ حال جب سرِ بالیں ہوا گزر

تازہ لہو رواں ہے تنِ پاش پاش سے
تکبیر کی صدا چلی آتی ہے لاش سے
(میر انیسؔ)

سوالات

۱۔ شاعر نے میدانِ کربلا میں گرمی کی شدت کا جو منظر پیش کیا ہے اسے اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۲۔ نظم "امام حسینؑ کی شہادت" کا خلاصہ لکھیے۔

۳۔ جو نظم کسی کی وفات پر اظہار غم کے لیے لکھی جائے اسے کیا کہتے ہیں؟ صحیح لفظ پر ✓ کا نشان لگائیے۔

(قصیدہ۔ مرثیہ۔ گیت)

۴۔ "سبزہ زار" اور "دلگیر" میں "زار" اور "گیر" لاحقے ہیں، ان لاحقوں سے مزید چار چار الفاظ بنائیے۔

۵۔ مندرجہ ذیل کے متضاد لکھیے۔

گرمی۔ جنگ۔ زمین۔ دھوپ۔ آگ۔ سخت۔ بحر۔ خشک۔ یمین۔ دکھ۔

۶۔ ان نظموں میں اسمائے معرفہ اور اسمائے آلہ کی نشاندہی کیجیے۔

۷۔ جس نظم کے ہر بند میں چھے مصرعے ہوں اسے "مسدس" کہتے ہیں۔ مسدس کے ابتدائی چار مصرعے آپس میں ہم قافیہ ہوتے ہیں جبکہ آخری دو مصرعے الگ قافیوں میں آتے ہیں۔ مگر دونوں آپس میں ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ اپنی کتاب میں سے مسدس کی کم از کم چار مثالیں تلاش کر کے لکھیے۔

نظم قومی

مسلمانو بتاؤ تو تمھیں اپنی خبر کچھ ہے؟
تمھارے کیا مدارج رہ گئے ، اس پر نظر کچھ ہے ؟
اگر کچھ ہے ، تو سوچو دل میں بھی اس کا اثر کچھ ہے ؟
حریفوں کی تعلّی باعثِ سوزِ جگر کچھ ہے ؟
تمھیں معلوم ہے کچھ رہ گئے ہو کیا سے کیا ہو کر
کدھر آ نکلے ہو راہِ ترقی سے جدا ہو کر

تمھاری عزّتیں تھیں ، اَوج تھا ، رُتبہ تھا ، شانیں تھیں
تمھاری بات تھی ، اُحکام تھے ، کہنا تھا ، آنیں تھیں
تمھارے ذکر میں سرگرم دنیا کی زبانیں تھیں
تمھیں تم تھے ، زمانہ میں تمھاری داستانیں تھیں
غرور و ناز کم کرنا پڑا تھا ایک عالَم کو
سرِ تسلیم خم کرنا پڑا تھا ایک عالَم کو

تمھارا اتفاقِ باہمی دیوارِ آہن تھا
مخالف ایک کا جو تھا ، وہ گویا سب کا دشمن تھا
تمھاری ہمتوں کا عرشِ اعظم پر نشیمن تھا
تمھارے ہاتھ میں آفاق کا ہر علم و ہر فن تھا
تم اپنی حق پرستی سے دبا لیتے تھے دنیا کو
خدا کے سامنے جھک کر جھکا دیتے تھے اعداء کو

نہیں ہے ہائے افسوس اب تمہارا وہ چلن باقی
نہ وہ حسنِ عمل باقی نہ اب وہ حسنِ ظن باقی
نہ وہ ذوقِ ہنر مندی ، نہ شوقِ علم و فن باقی
نہ دل میں ہے وہ جوشِ حُبِ یارانِ وطن باقی
جو فکریں ہیں تو اپنے نفس کو راحت رسانی کی
توقع کیا اسی پر ہے خدا کی مہربانی کی ؟

وہ باتیں جن سے قومیں ہو رہی ہیں نامور ، سیکھو
اٹھو تہذیب سیکھو، صنعتیں سیکھو ، ہنر سیکھو
بڑھاؤ تجربے ، اطرافِ دنیا میں سفر سیکھو
خواصِ خشک و تر سیکھو ، علومِ بحر و بر سیکھو
خدا کے واسطے اے نوجوانو ، ہوش میں آؤ
دلوں میں اپنے غیرت کو جگہ دو ، جوش میں آؤ

(اکبرالہ آبادی)

بیٹا

بیٹے کو لوگ کہتے ہیں آنکھوں کا نور ہے
ہے زندگی کا لطف تو دل کا سرور ہے
گھر میں اسی کے دم سے ہے ہر سمت روشنی
نازاں ہے اس پہ باپ تو ماں کو غرور ہے
خوش قسمتی کی اس کو نشانی سمجھتے ہیں

کہتے ہیں یہ خدا کے کرم کا ظہور ہے
اکبرؔ بھی اس خیال سے کرتا ہے اتفاق
اس کا بھی ہے یہ قول کہ ایسا ضرور ہے
البتہ شرط یہ ہے کہ بیٹا ہے ہونہار
مائل ہے نیکیوں پہ برائی سے دُور ہے
سنتا ہے دل لگا کے بزرگوں کی پند کو
وقتِ کلام لب پہ جناب و حضور ہے
برتاؤ اس کا صدق و محبت سے ہے بھرا
اس میں نہ ہے فریب نہ کچھ مکر و زُور ہے
افکارِ والدین میں ہے دل سے وہ شریک
ہمدرد ہے، معین ہے، اہلِ شعور ہے
راضی ہے اس پہ باپ کی جو کچھ ہو مصلحت
صابر ہے، با ادب ہے، عقیل و غیور ہے
رکھتا ہے خاندان کی عزّت کا وہ خیال
نیکوں کا دوست، صحبتِ بد سے نفور ہے
کسبِ کمال کی ہے شب و روز اس کو دُھن
علم و ہنر کے شوق کا دل میں وفور ہے
لیکن جو ان صفات کا مطلق نہیں پتا
اور پھر بھی ہے خوشی تو خوشی کا قصور ہے

(اکبرؔ الہ آبادی)

سوالات

۱۔ "نظم قومی" کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

۲۔ اس نظم کے آخری بند میں شاعر نے نوجوانوں کو کیا نصیحت کی؟

۳۔ اکبرالہ آبادی کن شرطوں کے ساتھ بیٹے کو قدر کے قابل سمجھتے ہیں؟

۴۔ مندرجہ ذیل کیسے حروف ہیں؟

اگر ۔ تو ۔ سے ۔ کی ۔ پر ۔ اور ۔ میں ۔ جو ۔

۵۔ جمع کے واحد لکھیے۔

مدارج۔ احکام۔ آفاق۔ اعداء۔ اطراف۔ خواص ۔ علوم۔ افکار۔ صفات۔

۶۔ مندرجہ ذیل کے مترادف لکھیے :۔

روشنی ۔ ہونہار ۔ پند ۔ کلام۔ برتاؤ ۔ عقیل ۔ غیور ۔

۷۔ "علم و ہنر" کیسا مرکب ہے؟ صحیح جواب پر ✓ کا نشان لگائیے :۔

(مرکبِ اضافی ۔ مرکبِ توصیفی ۔ مرکبِ عطفی)

محنت کی برکات

مُشقّت کی ذِلّت جنھوں نے اُٹھائی
جہاں میں مِلی ان کو آخر بڑائی
کسی نے بغیر اس کے ہرگز نہ پائی
فضیلت نہ عزت نہ فرماں روائی

نہال اس گلستاں میں جتنے بڑھے ہیں
ہمیشہ وہ نیچے سے اوپر چڑھے ہیں

نہ بونصر[1] تھا نوع میں ہم سے بالا
نہ تھا بوعلی[2] کچھ جہاں سے نرالا
طبیعت کو بچپن سے محنت میں ڈالا
ہوئے اس لیے صاحبِ قدر والا

اگر فکرِ کسبِ ہنر تم کو بھی ہو
تمھیں پھر ابو نصر اور بو علی ہو

بہت ہم میں اور تم میں جوہر ہیں مخفی
خبر کچھ نہ ہم کو نہ تم کو ہے جن کی
اگر جیتے جی، کچھ نہ ان کی خبر لی
تو ہو جائیں گے مِل کے مٹّی میں مٹّی

یہ جوہر ہیں ہم میں امانت خدا کی
مبادا تلَف ہو ودیعت خدا کی

نہیں سہل گر صید کا ہاتھ آنا
تو لازم ہے گھوڑوں کو سرپٹ بھگانا
نہ بیٹھو جو ہے بوجھ بھاری اٹھانا

۱۔ ابو نصر فارابی، عہد عباسی کا بہت بڑا مسلمان فلسفی۔
۲۔ بو علی سینا، عہد عباسی کا مشہور فلسفی اور طبیب۔

۳۔ اکبرالہ آبادی کن شرطوں کے ساتھ بیٹے کو قدر کے قابل سمجھتے ہیں؟

۴۔ مندرجہ ذیل کیسے حروف ہیں؟

اگر ۔ تو ۔ سے ۔ کی ۔ پر ۔ اور ۔ میں ۔ جو ۔

۵۔ جمع کے واحد لکھیے۔

مدارج ۔ احکام ۔ آفاق ۔ اعداء ۔ اطراف ۔ خواص ۔ علوم ۔ افکار ۔ صفات ۔

۶۔ مندرجہ ذیل کے مترادف لکھیے :۔

روشنی ۔ ہونہار ۔ پند ۔ کلام ۔ برتاؤ ۔ عقیل ۔ غیور ۔

۷۔ "علم و ہنر" کیسا مرکب ہے؟ صحیح جواب پر ✓ کا نشان لگائیے :۔

(مرکبِ اضافی ۔ مرکبِ توصیفی ۔ مرکبِ عطفی)

محنت کی برکات

مُشقّت کی ذِلّت جنھوں نے اُٹھائی
جہاں میں مِلی ان کو آخر بڑائی
کسی نے بغیر اس کے ہرگز نہ پائی
فضیلت نہ عزت نہ فرماں روائی

نہال اس گلستاں میں جتنے بڑھے ہیں
ہمیشہ وہ نیچے سے اوپر چڑھے ہیں

نہ بونصر[1] تھا نوع میں ہم سے بالا
نہ تھا بوعلی[2] کچھ جہاں سے نرالا
طبیعت کو بچپن سے محنت میں ڈالا
ہوئے اس لیے صاحبِ قدر والا

اگر فکرِ کسبِ ہنر تم کو بھی ہو
تمھیں پھر ابُو نصر اور بو علی ہو

بہت ہم میں اور تم میں جوہر ہیں مخفی
خبر کچھ نہ ہم کو نہ تم کو ہے جن کی
اگر جیتے جی، کچھ نہ ان کی خبر لی
تو ہو جائیں گے مِل کے مٹی میں مٹی

یہ جوہر ہیں ہم میں امانت خدا کی
مبادا تلَف ہو ودیعت خدا کی

نہیں سہل گر صید کا ہاتھ آنا
تو لازم ہے گھوڑوں کو سرپٹ بھگانا
نہ بیٹھو جو ہے بوجھ بھاری اٹھانا

۱۔ ابو نصر فارابی، عہد عباسی کا بہت بڑا مسلمان فلسفی۔
۲۔ بو علی سینا، عہد عباسی کا مشہور فلسفی اور طبیب۔

ذرا تیز ہانکو جو ہے دُور جانا
زمانہ اگر ہم سے زور آزما ہے
تو وقت اے عزیزو! یہی زور کا ہے

بشر کو ہے لازم کہ ہمت نہ ہارے
جہاں تک ہو کام آپ اپنے سنوارے
خدا کے سوا چھوڑ دے سب سہارے
کہ ہیں عارضی زور، کمزور سارے

اڑے وقت تم دائیں بائیں نہ جھانکو
سدا اپنی گاڑی کو تم آپ ہانکو

تمھیں اپنی مشکل کو آساں کرو گے
تمھیں درد کا اپنے درماں کرو گے
تمھیں اپنی منزل کا ساماں کرو گے
کرو گے تمھیں کچھ اگر یاں کرو گے

چھپا دستِ ہمت میں زورِ قضا ہے
مثل ہے کہ ہمت کا حامی خدا ہے

(مولانا الطاف حسین حالیؔ)

عظیم لوگ

بہت مخلص اور پاک بندے خدا کے
نشاں جن سے قائم ہیں صدق و صفا کے
نہ شہرت کے خواہاں، نہ طالب ثنا کے
نمائش سے بیزار، دشمن ریا کے

ریاضت سب ان کی خدا کے لیے ہے
مشقت سب اس کی رضا کے لیے ہے

بہت نوعِ انساں کے غم خوار و یاور
ہوا خواہِ مِلت بہ اندیشِ کشور
شدائد کے دریائے خوں میں شناور
جہاں کی پُر آشوب کشتی کے لنگر

ہر اک قوم کی ہست و بود ان سے ہے یاں
سب اس انجمن کی نمود ان سے ہے یاں

کسی پر ہو سختی ، صُعُوبت ہے ان پر
کسی کو ہو غم ، رنج و کلفت ہے ان پر
کہیں ہو فلاکت ، مصیبت ہے ان پر
کہیں آئے آفت ، قیامت ہے ان پر

کسی پر چلیں تیر ، آماج ہیں یہ
لُٹے کوئی رہ گیر ، تاراج ہیں یہ

خدا نے عطا کی ہے جو ان کو قوت
سمائی ہے دل میں بہت اس کی عظمت
نہیں پھیرتی ان کا منہ کوئی زحمت
نہیں کرتی زیر ان کو کوئی صعوبت

بھروسے پہ اپنے دل و دست و پا کے
سمجھتے ہیں ساتھ اپنے لشکر خدا کے

نہیں مرحلہ کوئی دشوار ان کو
ہر اک راہ ملتی ہے ہموار ان کو
گلستاں ہے صحرائے پُر خار ان کو
برابر ہے میدان و کہسار ان کو

نہیں حائل ان کے کوئی رہگذر میں
سمندر ہے پایاب ان کی نظر میں

انھیں سے ہے آباد ہر ملک و دولت
انھیں سے ہے سرسبز ہر قوم و ملت
انھیں پر ہے موقوف قوموں کی عزت
انھیں کی ہے سب ربع مسکوں میں برکت

دم ان کا ہے دنیا میں رحمت خدا کی
انھیں کو ہے پھبتی خلافت خدا کی

ہر اک ملک میں خیر و برکت ہے ان سے
ہر اک قوم کی شان و شوکت ہے ان سے
نجابت ہے ان سے ، شرافت ہے ان سے
شرف ان سے ، فخر ان سے ، عزت ہے ان سے

جفا کش بنو گر ہو عزت کے خواہاں
کہ عزت کا ہے بھید ذلت میں پنہاں

(مولانا الطاف حسین حالیؔ)

چپ کی داد

اے ماؤ ! ، بہنو ! ، بیٹیو ! ، دنیا کی زینت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمھی ، قوموں کی عزت تم سے ہے
تم گھر کی ہو شہزادیاں ، شہروں کی ہو آبادیاں
غمگیں دلوں کی شادیاں ، دکھ سکھ میں راحت تم سے ہے
تم ہو تو غربت ہے وطن ، تم بن ہے ویرانہ چمن
ہو دیس یا پردیس ، جینے کی حلاوت تم سے ہے
نیکی کی تم تصویر ہو ، عفت کی تم تدبیر ہو
ہو دین کی تم پاسباں ، ایماں سلامت تم سے ہے

فطرت تمھاری ہے حیا ، طینت میں ہے مہر و وفا
گھٹی میں ہے صبر و رضا ، انساں عبارت تم سے ہے
مونس ہو خاوندوں کی تم ، غم خوار فرزندوں کی تم
تم بن ہے گھر ویران سب ، گھر بھر میں برکت تم سے ہے
تم آس ہو بیمار کی ، ڈھارس ہو تم بے کار کی
دولت ہو تم نادار کی ، عسرت میں عشرت تم سے ہے

(مولانا الطاف حسین حالؔی)

سوالات

۱۔ "محنت کی برکت" کا خلاصہ لکھیے۔

۲۔ "خدا کی امانت" سے کیا مراد ہے؟

۳۔ مولانا حالی نے عظیم لوگوں کی کون کون سی خوبیاں بیان کی ہیں ؟

۴۔ "چپ کی داد" میں ماں ، بہن ، بیوی ، بیٹی کی حیثیت سے عورت کے کون کون سے اوصاف بیان کیے گئے ہیں؟

۵۔ اعراب لگا کر تلفظ واضح کیجیے۔
مشقت فکر۔ تلف۔ امانت ۔ مخلص ۔ کلفت ۔ فخر۔ مسرت ۔ صبر۔

۶۔ واحد کے جمع (عربی قواعد کی رو سے) لکھیے۔
نوع ۔ طبیعت ۔ ہمت ۔ منزل ۔ مثل ۔ ملت ۔ مصیبت ۔ آفت ۔ قوت ۔ مرحلہ ۔ تدبیر۔

۷۔ صحیح لفظ لگا کر خالی جگہ پُر کیجیے۔
مسدس وہ نظم ہے جس کے ہر بند میں------ مصرعے ہوتے ہیں۔

۸۔ وہ مختصر نام جو شاعر اصلی نام کے بجائے اپنے اشعار میں استعمال کرتے ہیں اسے "تخلص" کہتے ہیں چنانچہ "حالی" مولانا الطاف حسین کا تخلص ہے ۔ اردو کے دو مشہور شاعروں کے تخلص لکھیے۔

شکوہ

کیوں زیاں کار بنوں ، سود فراموش رہوں ؟
فکرِ فردا نہ کروں ، محوِ غمِ دوش رہوں
نالے بُلبُل کے سُنوں ، اور ہمہ تن گوش رہوں
ہمنوا ! میں بھی کوئی گُل ہوں کہ خاموش رہوں ؟

جرأت آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے ، خاکم بدہن ، ہے مجھ کو

ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم
قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم
ساز خاموش ہیں ، فریاد سے معمور ہیں ہم
نالہ آتا ہے اگر لب پہ ، تو معذور ہیں ہم

اے خدا ! شکوہ اربابِ وفا بھی سن لے
خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر
کہیں مسجود تھے پتھر ، کہیں معبود شجر
خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر
مانتا پھر کوئی اَن دیکھے خدا کو کیوں کر ؟

تجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا ؟
قوتِ بازوئے مُسلم نے کیا کام ترا !

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں
خشکیوں میں کبھی لڑتے ، کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں

شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

آگیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز
قبلہ رُو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے
نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے
تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے
تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے

پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں، تُو بھی تو دلدار نہیں
(علامہ اقبالؒ)

جوابِ شکوہ

آئی آواز غم انگیز ہے افسانہ ترا
اشکِ بیتاب سے لبریز ہے پیمانہ ترا
آسماں گیر ہوا نعرۂ مستانہ ترا
کس قدر شوخ زباں ہے دلِ دیوانہ ترا

شکر شکوے کو کیا حسنِ ادا سے تُو نے
ہم سخن کر دیا بندوں کو خدا سے تُو نے

ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے؟ رہروِ منزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے، جوہرِ قابل ہی نہیں
جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گِل ہی نہیں

کوئی قابل ہو تو ہم شانِ کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے
ہم سے کب پیار ہے ہاں نیند تمھیں پیاری ہے
طبعِ آزاد پہ قیدِ رمضاں بھاری ہے
تمھیں کہہ دو یہی آئینِ وفاداری ہے؟

قوم مذہب سے ہے، مذہب جو نہیں، تم بھی نہیں
جذبِ باہم جو نہیں، محفلِ انجم بھی نہیں

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے؟
نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا کس نے؟
میرے کعبے کو جبینوں سے بسایا کس نے؟
میرے قرآن کو سینوں سے لگایا کس نے؟

تھے تو آباء وہ تمھارے ہی مگر تم کیا ہو؟
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو

منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبیؐ، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرمِ پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں، اور کہیں ذاتیں ہیں!
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

کون ہے تارکِ آئینِ رسولِؐ مختار ؟
مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار ؟
کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعارِ اغیار ؟
ہو گئی کس کی نگہ طرزِ سلف سے بیزار ؟

قلب میں سوز نہیں ، روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغامِ محمدؐ کا تمھیں پاس نہیں !

شور ہے ہو گئے دنیا سے مسلماں نابود
ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مُسلِم موجود ؟
وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدّن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنھیں دیکھ کے شرمائیں یہود !

یوں تو سیّد بھی ہو ، مرزا بھی ہو ، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو ، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو ؟

ہر کوئی مست مۓ ذوقِ تن آسانی ہے
تم مسلماں ہو ؟ یہ اندازِ مسلمانی ہے ؟
حیدریؓ فقر ہے ، نے دولتِ عثمانیؓ ہے
تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

(علامہ محمد اقبالؒ)

فاطمہ بنت عبداللہ

(عرب لڑکی جو طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی)

فاطمہ! تو آبروئے اُمتِ مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مُشتِ خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت حُورِ صحرائی! تری قسمت میں تھی
غازیانِ دیں کی سقائی تری قسمت میں تھی
یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر!
ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر!
یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی!
ایسی چنگاری بھی یا رب اپنی خاکستر میں تھی!
اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں!
فاطمہ! گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے
نغمۂ عشرت بھی اپنے نالۂ ماتم میں ہے
رقص تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے!
ذرہ ذرہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے
ہے کوئی ہنگامہ تیری تُربتِ خاموش میں
پل رہی ہے ایک قومِ تازہ اس آغوش میں
تازہ انجم کا فضائے آسماں میں ہے ظہور
دیدۂ انساں سے نامحرم ہے جن کی موجِ نور
جن کی تابانی میں اندازِ کہن بھی، نو بھی ہے
اور تیرے کوکبِ تقدیر کا پَرتو بھی ہے

(علامہ محمد اقبالؔ)

پیوستہ رہ شجر سے

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ
ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے
ہے لازوال عہدِ خزاں اس کے واسطے
کچھ واسطہ نہیں ہے اسے برگ و بار سے
ہے تیرے گلستاں میں بھی فصلِ خزاں کا دور
خالی ہے جیبِ گل زرِ کامل عیار سے
جو نغمہ زن تھے خلوتِ اوراق میں طیور
رخصت ہوئے ترے شجرِ سایہ دار سے
شاخِ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو
نا آشنا ہے قاعدۂ روزگار سے

ملّت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

(علامہ محمد اقبالؒ)

سوالات

۱۔ نظم "شکوہ" میں پہلے زمانے کے مسلمانوں کے جن کارہائے نمایاں کا ذکر کیا گیا ہے انھیں اختصار سے لکھیے۔

۲۔ "جوابِ شکوہ" میں موجودہ دور کے مسلمانوں کا جو کردار پیش کیا گیا ہے اسے اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۳۔ فاطمہ کو شاعر نے "راکھ میں دبی ہوئی چنگاری" کیوں کہا ہے؟ وضاحت کیجیے۔

۴۔ اس نظم کے آخر میں فضائے آسمانی میں ابھرنے والے نئے ستاروں کا ذکر کیا گیا ہے، اس سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

۵۔ نظم "پیوستہ رہ شجر سے" کا مرکزی خیال لکھیے۔

۶۔ خالی جگہ میں صحیح لفظ چن کر لگائیے۔

(الف) ایاز محمود کا---- تھا (دوست ۔ بھائی ۔ غلام ۔ بیٹا)

(ب) فاطمہ بنت عبداللہ قواعد کی رُو سے---- ہے (عرف ۔ لقب ۔ کنیت)

(ج) قوم---- سے بنتی ہے ۔ (وطن ۔ نسل ۔ مذہب ۔ زبان)

(د) ہے تیرے---- میں بھی فصل خزاں کا دُور ۔

(چمن ۔ گلشن ۔ گلستان ۔ باغ)

۷۔ سجدہ سے مسجود اور عَبد سے مَعبُود اسم مفعول ہیں۔ مندرجہ ذیل سے اسمِ مفعول بنائیے :۔

قتل ۔ حکم ۔ دفن ۔ ذکر ۔ علم ۔ ظلم

۸۔ اِعراب لگا کر تَلَفُّظ واضح کیجیے۔

حمد ۔ کلمہ ۔ کرم ۔ صبح ۔ رمضان ۔ منفعت ۔ حرم۔ مصلحت ۔ سلف ۔ وضع ۔ شجر۔ خلوت ۔

آنحضرتؐ کی مدینے میں تشریف آوری

ہوا چاروں طرف اقصائے عالم میں پکار آئی
بہار آئی ، بہار آئی ، بہار آئی ، بہار آئی

جوان و پیر و مرد و زن سراپا چشم بیٹھے تھے
بہار آنے کو تھی گلشن سراپا چشم بیٹھے تھے

جنوبی سمت اٹھا ایک نورانی غبار آخر
سوادِ شہر میں داخل ہوا ناقہ سوار آخر

فضا میں بس گئیں توحید کی آزاد تکبیریں
یہ تکبیریں تھیں باطل کے گلو پر تیز شمشیریں

مہاجر پیچھے پیچھے چل رہے تھے سربکف ہو کر
کھڑے تھے راہ میں انصار ہر سو صف بہ صف ہو کر

در و دیوار استادہ ہوئے تعظیم کی خاطر
زمیں کیا آسماں بھی جھک گئے تسلیم کی خاطر

مسلماں بیبیاں گھر کی چھتوں پر جمع ہو ہو کر
نظر سے چومتی تھیں عصمتِ دامانِ پیغمبرؐ

زباں پر اَشْرَقَ الْبَدْرُ عَلَیْنَا[1] کی صدائیں تھیں
دلوں میں مَا دَعیٰ لِلّٰہِ دَاعٍ[2] کی دعائیں تھیں

کہیں معصوم ننھی بچیاں تھیں، دَف بجاتی تھیں
رسولِ پاکؐ کی جانب اشارے کر کے گاتی تھیں

کہ ہم ہیں بچیاں نجّار کے عالی گھرانے کی
خوشی ہے آمنہ کے لالؐ کے تشریف لانے کی

مسلمانوں کے بچّے بچیاں مسرور تھے سارے
گلی کوچے خدا کی حمد سے معمور تھے سارے

نُبوّت کی سواری جس طرف سے ہو کے جاتی تھی
دُرود و نعت کے نغمات کی آواز آتی تھی

(حفیظ جالندھری)

۱۔ ہم پر چودھویں کا چاند چمکا۔
۲۔ جب تک پکارنے والا اللہ کو پکارے، پورا شعر یوں ہے:۔
طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَیْنَا مِنْ ثَنِیَّاتِ الْوَدَاع ۔ وَجَبَ الشُّکْرُ عَلَیْنَا مَا دَعیٰ لِلّٰہِ دَاع
(ترجمہ: ہم پر چودھویں کا چاند چمکا رخصت کی گھاٹیوں پر شکر واجب ہوا جب تک اللہ کو پکارنے والا اسے پکارے۔)

شام

رفتہ رفتہ سرخیوں پر چھا گیا کالا غبار
مٹ گیا رنگِ شفق مرجھا گیا یہ لالہ زار

نور کے زریں ایوانوں میں تالے پڑ گئے
اُرغوانی بدلیوں کے رنگ کالے پڑ گئے

شام آئی خامشی کا جال پھیلائے ہوئے
ساحرہ بیٹھی ہے کالے بال بکھرائے ہوئے

بے زباں خاموشیاں جاگیں، صدائیں سو گئیں!
شورشیں چپ ہو گئیں، خاموشیوں میں کھو گئیں

کوہ پر ظلمات کی پریوں نے پَر پھیلا دیے
ہر طرف تاریک دامن کھول کر پھیلا دیے
جھاڑیاں کالی ردائیں اوڑھ کر چپ ہو گئیں
بند کلیاں اپنی خوشبو سے لپٹ کر سو گئیں

اس طرح اونچے پہاڑوں میں گھِری ہیں وادیاں
جس طرح دیووں کے گھر میں قید ہوں شہزادیاں

منظرِ کہسار پر اس دم یہ ہوتا ہے گماں
اونٹ ہیں بیٹھے ہوئے، اُترا ہوا ہے کارواں

یا گھٹائیں ہیں رکہ اٹھیں سرد ہو کر جم گئیں
اور یا پھر آندھیاں ہیں چلتے چلتے تھم گئیں

(حفیظ جالندھری)

سوالات

۱۔ آنحضورؐ کی مدینے میں تشریف آوری کا منظر بیان کیجیے۔

۲۔ نظم "شام" کے حوالے سے غروب آفتاب کا سماں اپنے الفاظ میں لکھیے۔

۳۔ خالی جگہوں میں صحیح لفظ چن کر لگائیے۔

(الف) مہاجر ---- چل رہے تھے (آگے آگے - پیچھے پیچھے)

(ب) انصار صف بہ صف ---- (بیٹھے تھے - کھڑے تھے)

(ج) ننھی بچیاں ---- بجاتی تھیں (تالیاں - دف)

(د) گلی کوچے خدا کی ---- سے معمور تھے۔ (یاد - حمد)

(ہ) شفق کا رنگ ---- ہوتا ہے (نیلا - سرخ)

۴۔ قوسین میں گرامر کی چند اصطلاحیں بے ترتیبی سے دی گئی ہیں۔ نیچے دیے ہوئے الفاظ کے سامنے صحیح اصطلاح لگا کر خالی جگہیں پر کیجیے۔

(اسمِ معرفہ - اسمِ ظرف زماں - اسمِ نکرہ - اسمِ ظرف مکاں - اسم آلہ مونث - اسمِ صِفت)

گلشن ------ مسرور ------ شام ------ مدینہ ------ ساحرہ ------ لالہ زار ---- شمشیر ---- پہاڑ ----

نوائے سروش

امیدِ فتح رکھو اور عَلَم اٹھائے چلو
عَمَل کے ساتھ مقدّر کو آزمائے چلو
مسافروں میں مسافت کا ذکر کیا معنی
فضا پکار رہی ہے قدم بڑھائے چلو
بجا! بجا! کہ اندھیرا ہے شاہراہوں میں
چراغِ فکر جہاں تک جلے جلائے چلو
یہ دُور آگ نہیں، روشنی ہے منزل کی
قدم ملا کے بڑھو اور عَلَم اٹھائے چلو
سفینہ غرق ہو یا کوئی گھاٹ پر اترے
تمہارا فرض یہ ہے روشنی دکھائے چلو
جو برق رَو ہیں انھیں دو اُصُولِ مُستقری
جو تیز گام نہیں ان کا دل بڑھائے چلو
نہیں ہے شاخ تراشی ہی شاملِ دانش
رَوِش رَوِش پہ نئے پھول بھی کھلائے چلو
(احسان دانشؔ)

لُطفِ سَحَر

صبح کا پیارا سماں ہے کس قدر کیف آفریں!
جنت الفردوس سے بڑھ کر ہے پہنائے زمیں

اٹھ رہی ہے خود بخود اُنوارِ مشرق سے نقاب
چاند کے جلووں کی پھیکی پڑ گئی ہے آب و تاب

تیرگی میں سیمگوں جلوے نمایاں ہو چلے
تان کر تنویر کی چادر ستارے سو چلے

ہر گُلِ نورستہ خوشبو کا امانت دار ہے
ہر کلی اب مسکرانے کے لیے تیار ہے

وہ اندھیرا ، رات جو میداں میں تھا چھایا ہوا
ہے درختوں کی گھنی شاخوں میں تھرایا ہوا

نور ظلمت کے تعاقب میں ہے سر گرمِ خرام
لے رہی ہے روشنی تاریکیوں سے انتقام

ناچتی پھرتی ہے شبنم کے ستاروں پر نسیم
چھا گئی ہے باغ پر پھولوں کی جاں پرور شمیم

حُسنِ فطرت کے نظارے دل کو تڑپانے لگے
صبح کے دامن میں چشمے بھیرویں گانے لگے

ہلکی ہلکی سانس سی لینے لگیں پھلواریاں
ہو گئیں گلشن میں ہر سُو کیف کی موجیں رواں

ہر شعاعِ مہر آ کر ہو رہی ہے سر بہ خم
بن رہا ہے گلستاں کا گلستاں بابِ حرم

ہوتے ہوتے بے خودی سی مجھ پہ طاری ہو گئی
رفتہ رفتہ میری بے تابی کی دنیا سو گئی

(احسان دانش)

سوالات

۱۔ نظم "نوائے سروش" میں شاعر نے ہمیں کیا پیغام دیا ہے؟

۲۔ تیز قدم اور سست رفتار ساتھیوں کے بارے میں ہمارا کیا رُویّہ ہونا چاہیے؟

۳۔ نظم "تعاقبِ سحر" میں صبح کی آمد کا جو منظر پیش کیا گیا ہے اسے اپنے الفاظ میں لکھیے۔

۴۔ اِعراب لگا کر تلفُّظ واضح کیجیے۔

تعاقب ۔ فتح ۔ مسافت ۔ فضا ۔ فکر ۔ غرق ۔ منزل ۔ اصول ۔ روش ۔

۵۔ قوسین میں چار مرکبات ناقص دیے گئے ہیں ان میں سے ہر مرکب کو اس کی صحیح خالی جگہ پر لگائیے۔

(مرکب جاری ۔ مرکبِ اضافی ۔ مرکبِ توصیفی ۔ مرکبِ عطفی)

(الف) مسافت کا ذکر ----- (ب) تعاقب میں -----

(ج) آب و تاب ----- (د) پیارا سماں -----

(ہ) گھاٹ پر ----- (و) منزل کی روشنی -----

(ز) نئے پھول ----- (ح) دن اور رات

۶۔ مندرجہ ذیل کے متضاد لکھیے۔

فتح ۔ مسافر ۔ اندھیرا ۔ پھول ۔ صبح ۔ مشرق ۔ نور ۔ تاریکی ۔

۷۔ "شاہراہ" میں "شاہ" اِسمِ مکبّر کا سابقہ ہے ۔ مندرجہ ذیل سے ایسے ہی اسمِ مکبّر بنائیے۔

کار ۔ سوار ۔ باز ۔ پر ۔ تیر ۔

بھٹائیؒ[1] کا پیغام

تیری ہی ذات اوّل و آخر — تو ہی قائم ہے اور تو ہی قدیم
کم ہے جتنی کریں تری تعریف — تو ہی اعلیٰ ہے اور تو ہی علیم
والیٔ شش جہات واحد ذات — رازقِ کائنات ، ربِ رحیم

کامل ایماں کے ساتھ جس نے بھی — دل سے مانا زبان سے مانا
جس کی خاطر بنی ہے یہ دنیا — اس محمدؐ کا مرتبہ جانا
فوقیت اس کو دوسروں پہ ملی — اپنی ہستی کو اس نے پہچانا
جس نے اس قادرِ حقیقی کو — وحدہٗ لا شریک گردانا

پرتوِ حسنِ دوست ہے جن پر — ان کے دل روشنی سے ہیں معمور
اپنی دنیا الگ بسائی ہے — خوف و رنج و غم و اَلَم سے دُور

تجھ میں جب تک ہے ذوقِ خود بینی — تیرا شَوقِ نماز بے توقیر
بھول جا اپنے آپ کو پہلے — زیب دے گی زباں کو پھر تکبیر
دین کو چھوڑ کر نہ جانے کیوں — مول لیتے ہیں نت نیا آزار
جھاگ ہی کو سمجھ رہے ہیں دودھ — کیوں یہ دیں ناشناس دنیا دار

ا۔ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کا ذکر پچھلی جماعتوں میں آ چکا ہے۔ آپ سندھ کے عظیم صوفی شاعر تھے۔ سندھ ہی کے ایک معروف و ممتاز شاعر شیخ ایاز نے آپ کے عارفانہ کلام "رسالہ شاہ عبداللطیف بھٹائی" کا منظوم اردو ترجمہ کیا ہے۔ یہ اشعار اس فصیح و بلیغ ترجمے میں سے ہیں۔

عجز کو جس نے اختیار کیا　　اس کی گزری سدا فراغت سے
شکوہ سنجِ غمِ جہاں کو مگر　　ہاتھ آیا نہ کچھ شکایت سے

سنگریزوں سے بھر لیا دامن　　گوہرِ بے بہا کو چھوڑ دیا
موجِ طوفانِ معصیّت نے آہ!　　میری کشتی کے رخ کو موڑ دیا
ہائے وہ عہد جس کو اے مالک!　　اپنی غفلت سے میں نے توڑ دیا

کُوکتی ہے شمال میں کویل　　ہل کسانوں نے کر لیے تیار
گلہ بانوں پہ کیف طاری ہے　　دیکھ کر یہ فضائے خوش آثار
اَبرِ باراں کے پیرہن میں آج　　کتنا پُر کیف ہے جمالِ یار

میں نہ پہنوں گی ریشمی ملبوس　　چاہے جس رنگ کا بھی ہو کوئی
میرے پیارے وطن کا تحفہ ہے　　صاف و شفاف اُون کی لوئی

گھما چرخے کو اور کچھ کر لے ناداں　　کہ بس دو چار دن کی زندگی ہے
یہاں جیسا کسی نے سُوت کاتا　　اسے ویسی ہی عزّت بھی ملی ہے
(ترجمہ از شیخ ایاز)

سوالات

۱۔ "شاہ جی نے اپنی شاعری میں دین واخلاق کی تعلیم دی ہے"
مندرجہ بالا اقتباسات کی روشنی میں اس قول کی وضاحت کیجیے۔

۲۔ قطعہ نمبر ۷ میں شاعر نے کس عہد کی طرف اشارہ کیا ہے؟

۳۔ آخری قطعے میں چرخے سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

۴۔ اول و آخر، شش جہات، شمال میں، ریشمی ملبوس، وطن کا تحفہ، کیسے مرکبات ہیں؟

۵۔ "کویل کوکتی ہے" کی مثال سامنے رکھ کر خالی جگہوں میں موزوں اسمِ صوت لگائیے:۔

(الف) پرندہ ______ ہے　　(ب) سانپ ______ ہے

(ج) ہاتھی ______ ہے　　(د) شیر ______ ہے

(ہ) اونٹ ______ ہے　　(و) گھوڑا ______ ہے

۶۔ "گلہ بان" میں "بان" لاحقہ ہے اور "ناشناس" میں "نا" سابقہ ہے ان دونوں علامات سے چار چار الفاظ اور بنائیے۔

۷۔ مذکر اور مؤنث الگ الگ کیجیے۔
کائنات ۔ پرتو ۔ ذوق ۔ توقیر ۔ جھاگ ۔ فراغت ۔ عجز ۔ ہل ۔ کیف ۔ ملبوس ۔ پیرہن ۔

- - - - - - - - - -

یہ دیس ۔ مرا دیس

یہ ارضِ وطن ، مہرِ بداماں و جہاں تاب
یہ شاعرِ مشرق کے تخیّل کا حسیں خواب
یہ قائدِ اعظمؒ کا اُجالا ہوا مہتاب
یہ صبحِ درخشاں کا وطن ، میرا وطن ہے
یہ دیس ۔ مرا دیس

اس خاک میں آنکھیں ، ہیں بزرگانِ سلف کی
اس دیس میں مٹی بھی ہے بطحا و نجف کی
یہ جان جوانانِ جری ، تیغ بکف کی
دل جن کا سمندر ہے تو فولاد بدن ہے
یہ دیس ۔ مرا دیس

اس دیس کا زندہ دل و بیدار مسلماں
اُٹھا ہے لیے پرچمِ آزادیٔ انساں
وہ دین کا ناصر ہے وہ ملّت کا نگہباں
ہونٹوں پہ ہے تکبیر تو شانوں پہ کفن ہے
یہ دیس ۔ مرا دیس

اس دیس میں دنیا بھی ہے اور دین خدا بھی
ثروت بھی ہے ، عزّت بھی ، محبّت کی فضا بھی
قرآن بھی اور دولتِ تسلیم و رضا بھی
یہ دیس علمدارِ روایاتِ کہن ہے
یہ دیس ۔ مرا دیس

(یوسف ظفر)

سوالات

۱۔ اس نظم کے پہلے بند میں شاعر نے جس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے اس کی وضاحت کیجیے۔

۲۔ پاکستان اور اہلِ پاکستان کی جو خصوصیات اس نظم میں بیان کی گئی ہیں انھیں اپنے الفاظ میں لکھیے۔

۳۔ مندرجہ ذیل مرکبات کا مطلب لکھیے۔

مہرِ درخشاں ۔ جہانتاب ۔ صبحِ درخشاں ۔ بزرگانِ سلف ۔ تیغ بکف ۔ دولتِ تسلیم و رضا۔ روایاتِ کہن۔

۴۔ علمدار میں "دار" لاحقہ ہے، اس لاحقے سے پانچ الفاظ اور بنایئے۔

۵۔ واحد کے جمع لکھیے۔

ارض ۔ شاعر ۔ تخیل ۔ وطن ۔ سلف ۔ ملت ۔ دین ۔ ناصر۔

۶۔ خالی جگہ میں صحیح لفظ چن کر لگایئے۔

(الف) جو نام کسی خاص وصف کی وجہ سے مشہور ہو جائے اسے ---- کہتے ہیں۔ (عرف ۔ خطاب ۔ لقب)

(ب) شاعرِ مشرق ---- کا لقب ہے۔

(مولانا حالیؔ ۔ علامہ اقبالؔ ۔ اکبر الہ آبادی)

(ج) نجف ---- میں واقع ہے۔ (شام ۔ عراق ۔ ایران)

- - - - - - - - - -

قطعات

(۱)

چھوڑ لٹریچر کو ، اپنی ہسٹری کو بھول جا
شیخ و مسجد سے تعلّق ترک کر اسکول جا
چار دن کی زندگی ہے ، کوفت سے کیا فائدہ؟
کھا ڈبل روٹی ، کلرکی کر ، خوشی سے پھول جا
(اکبؔر الہ آبادی)

(۲)

تم شوق سے کالج میں پھلو ، پارک میں پُھولو
جائز ہے غباروں میں اُڑو چرخ پہ جھولو
بس ایک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو
(اکبؔر الہ آبادی)

(۳)

ترقی کی نئی راہیں جو زیرِ آسماں نکلیں
میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بیبیاں نکلیں
مصیبت میں بھی اب یادِ خدا آتی نہیں ان کو
دعا منہ سے نہ نکلی ، پاکٹوں سے عرضیاں نکلیں
(اکبؔر الہ آبادی)

(۴)

عجم کی زینتیں سیکھیں ، مباہاتِ عرب سیکھیں
زمانے کی ترقی جو سکھائے ان کو سب سیکھیں

مگر اک التماس ان نوجوانوں سے مَیں کرتا ہوں
خدا کے واسطے اپنے بزرگوں کا ادب سیکھیں

(اکبرالہ آبادی)

(۵)

آپس میں موافق رہو، طاقت ہے تو یہ ہے
دیکھو نہ بہم عیب ، محبت ہے تو یہ ہے
صحت بھی ہو، روزی بھی ہو ، دل کو بھی ہو تسکیں
دنیا میں بشر کے لیے نعمت ہے تو یہ ہے

(اکبرالہ آبادی)

(۶)

جس کو خدا سے شرم ہے وہ ہے بزرگِ دیں
دنیا کی جس کو شرم ہے، مردِ شریف ہے
جس کو کسی کی شرم نہیں اس کو کیا کہوں
فطرت میں وہ رذیل ہے دل کا کثیف ہے

(اکبرالہ آبادی)

(۷)

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو پڑ گیا
یکسر وہ اُستخوان شکستوں سے چُور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسی کا سرِ پُر غرور تھا

(میر تقی میرؔ)

رباعیات

(۱)

ماں باپ سے بھی سوا ہے شفقت تیری
افزوں ہے ترے غضب سے رحمت تیری
جنت انعام کر کہ دوزخ میں جلا
وہ رحم ترا ہے، یہ عدالت تیری

(میر انیسؔ)

(۲)

افسوس جہاں سے دوست کیا کیا نہ گئے
اس باغ سے کیا کیا گُلِ رعنا نہ گئے
تھا کون سا نخل جس نے دیکھی نہ خزاں
وہ کون سے گُل کھلے جو مرجھا نہ گئے

(میر انیسؔ)

(۳)

رتبہ جسے دنیا میں خدا دیتا ہے
وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی
جو ظرف کہ خالی ہو، صدا دیتا ہے

(میر انیسؔ)

(۴)

گر لاکھ برس جئے تو پھر مرنا ہے
پیمانہ عمر ایک دن بھرنا ہے

ہاں توشۂ آخرت مہیّا کر لے
غافل تجھے دنیا سے سفر کرنا ہے

(میر انیس)

(۵)

جو لوگ ہیں نیکیوں میں مشہور بہت
ہوں نیکیوں پر اپنے نہ مغرور بہت
نیکی ہی خود اِک بدی ہے گر ہو نہ خُلُوص
نیکی سے بدی نہیں ہے کچھ دُور بہت

(مولانا الطاف حسین حالؔی)

(۶)

عشرت کا ثمر تلخ سدا ہوتا ہے
ہر قہقہہ پیغامِ بُکا ہوتا ہے
جس قوم کو عیش دوست پاتا ہوں میں
کہتا ہوں کہ اب دیکھیے کیا ہوتا ہے

(مولانا الطاف حسین حالی)

(۷)

اے عِلم! کیا ہے تُو نے مُلکوں کو نہال
غائب ہوا تُو جہاں سے، واں آیا زوال
ان پر ہوئے غیب کے خزانے مفتوح
جن قوموں نے ٹھہرایا تجھے رأس المال

(مولانا الطاف حسین حالؔی)

(۸)

تیمور نے اِک مورچہ زیرِ دیوار
دیکھا کہ چڑھا دانے کو لے کر سَو بار

آخر سرِ بام لے کے پہنچا تو کہا
مشکل نہیں کوئی پیشِ ہمت دشوار

(مولانا الطاف حسین حالیؔ)

سوالات

۱۔ مغرب کی پیروی میں ہم جس قسم کی ترقی کر رہے ہیں۔ قطعہ نمبر۳ کے حوالے سے اس کی وضاحت کیجیے۔

۲۔ دوسرے اور چوتھے قطعے میں شاعر نے نوجوانوں کو کس بات کی تلقین کی ہے؟

۳۔ شاعر نے کس شخص کو دل کا کثیف کہا ہے؟

۴۔ دوسری رباعی کا مرکزی خیال تحریر کیجیے۔

۵۔ "**تھوتھا چنا باجے گھنا**" ایک مشہور کہاوت ہے۔ اس کہاوت کا مفہوم کس رباعی میں بیان ہوا ہے؟

۶۔ توشہ آخرت سے کیا مراد ہے؟

۷۔ شاعر نے عیش دوست قوم کے بارے میں کس خدشے کا اظہار کیا ہے۔ وضاحت کیجیے۔

۸۔ آخری رباعی میں کس واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور اس سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے؟

۹۔ "مورچہ" قواعد کی رو سے اسم مصغر ہے جو فارسی لفظ "مور" کے آخر میں "چہ" کی علامت تصغیر لگا کر بنایا گیا ہے۔ مندرجہ ذیل سے اسمِ مصغّر بنائیے۔
دیگ۔ کتاب۔ صندوق۔ خوان۔ طاق۔

۱۰۔ **رباعی** نظم کی وہ قسم ہے جس کے چار مصرعے ہوں۔ اس کا پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرع عام طور پر ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ رباعی میں بالعموم فلسفہ و حکمت اور پند و نصائح کے مضامین بیان کیے جاتے ہیں۔ آپ کی درسی کتاب میں کس کس شاعر کی رباعیات شامل ہیں؟

غزلیات

(۱)

جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا
کہ نہ ہنسنے میں رو دیا ہوگا
ان نے قصداً بھی میرے نالے کو
نہ سنا ہوگا، گر سنا ہوگا
دل زمانے کے ہاتھ سے سالم
کوئی ہوگا کہ رہ گیا ہوگا
حال مجھ غم زدے کا جس تس نے
جب سنا ہوگا، رو دیا ہوگا
دل بھی، اے دردؔ قطرۂ خوں تھا
آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا

(خواجہ میر دردؔ)

(۲)

ان نے کیا تھا یاد مجھے بھول کر کہیں
پاتا نہیں ہوں تب سے میں اپنی خبر کہیں
پھرتی رہی تڑپتی ہی عالم میں جا بجا
دیکھا نہ میری آہ نے روئے اثر کہیں
مدت تلک جہان میں ہنستے پھرا کیے
جی میں ہے خوب روئیے اب بیٹھ کر کہیں

یوں تو نظر پڑے ہیں تن افگار اور بھی
دل ریش کوئی آپ سا دیکھا نہ پر کہیں

ظالم جفا جو چاہے سو کر مجھ پہ تو و لے
پچھتاوے پھر تو آپ ہی ایسا نہ کر کہیں

پوچھا میں درؔد سے کہ بتا تو سہی مجھے
اے خانماں خراب ہے تیرا بھی گھر کہیں

کہنے لگا مکانِ معین فقیر کو
لازم ہے کیا کہ ایک ہی جاگہ ہو، ہر کہیں

(خواجہ میردرد)

سوالات

۱۔ غزل، نظم کی ایک اہم قسم ہے جس میں شاعر اپنے دل پر گزرنے والی کیفیّات کا اظہار نہایت لطیف پیرائے میں کرتا ہے۔ حسن و عشق، اخلاق و تصوف اور پند و نصائح کے علاوہ زندگی کے مختلف مسائل اور حقائق بھی غزل کے موضوعات میں شامل ہیں۔ بتائیے درد کی پہلی غزل کے پہلے اور تیسرے شعر میں زندگی کی کس تلخ حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے؟

۲۔ غزل کے پہلے شعر کو "مَطلَع" اور آخری شعر کو (جس میں شاعر اپنا تخلص لاتا ہے) "مَقطَع" کہتے ہیں اوپر کی دونوں غزلوں کے مَطلعے اور مَقطعے اپنی کاپی میں لکھیے۔

۳۔ دوسری غزل کے مَقطع کا مفہوم اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۴۔ غم زدہ میں "زدہ" (مارا ہوا) لاحقہ ہے۔ ذیل کے اسموں کے آخر میں یہ علامت لگا کر ایسے ہی الفاظ بتائیے۔ اور ان کے معانی لکھیے:۔
آفت ۔ قحط ۔ ستم ۔ سیلاب۔ مصیبت۔

(۱)

درد و غم سے دل کبھو، فرصت نہ پائے
یہ صعوبت کب تلک کوئی اٹھائے
زار رونا چشم کا کب دیکھتے
دیکھیں ہیں لیکن خدا جو کچھ دکھائے
جو لکھی قسمت میں ذلت ہو سو ہو
خطِ پیشانی کوئی کیونکر مٹائے
کب تلک چاکِ قفس سے جھانکیے
برگِ گُل یاں بھی صبا کوئی تو لائے
میرؔ اکثر عمر کے افسوس میں
زیرِ لب بالائے لب ہے ہائے وائے
(میر تقی میرؔ)

(۲)

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دُعا کر چلے
جو تجھ بِن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اِس عہد کو اب وفا کر چلے
جبیں سجدہ کرتے ہی کرتے گئی
حقِ بندگی ہم ادا کر چلے
نہ دیکھا غمِ دوستاں شُکر ہے
ہمیں داغ اپنا دکھا کر چلے
کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میرؔ
جہاں میں تم آئے تھے کیا کر چلے
(میر تقی میرؔ)

سوالات

۱۔ پہلی غزل میں "خطِ پیشانی" کی تشریح کیجیے۔

۲۔ دوسری غزل کے چوتھے شعر میں شاعر نے کس بات کا شُکر ادا کیا ہے؟

۳۔ "فقیرانہ" صفتِ نسبتی ہے جو "فقیر" کے آخر میں "انہ" کی علامت لگا کر بنائی گئی ہے ایسی کم از کم پانچ مثالیں اور لکھیے۔

۴۔ میر کی غزلوں میں کون کون سے اشعار آپ کو زیادہ پسند ہیں کم از کم ایسے چار اشعار کی تشریح لکھیے۔

۵۔ دوسری غزل میں "صدا" قافیہ ہے اور "کر چلے" ردیف۔ اس غزل میں آنے والے تمام قافیے اپنی کاپی میں لکھیے۔

سوالات

۱۔ پہلی غزل میں "خطِ پیشانی" کی تشریح کیجیے۔

۲۔ دوسری غزل کے چوتھے شعر میں شاعر نے کس بات کا شکر ادا کیا ہے؟

۳۔ "فقیرانہ" صفتِ نسبتی ہے جو "فقیر" کے آخر میں "انہ" کی علامت لگا کر بنائی گئی ہے ایسی کم از کم پانچ مثالیں اور لکھیے۔

۴۔ میر کی غزلوں میں کون کون سے اشعار آپ کو زیادہ پسند ہیں کم از کم ایسے چار اشعار کی تشریح لکھیے۔

۵۔ دوسری غزل میں "صدا" قافیہ ہے اور "کر چلے" ردیف۔ اس غزل میں آنے والے تمام قافیے اپنی کاپی میں لکھیے۔

~~~~~~~~~~
~~~~~~~~~~

(۱)

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاجِ گدایانہ بنایا ہوتا
اپنا دیوانہ بنایا مجھے ہوتا تُو نے
کیوں خرد مند بنایا، نہ بنایا ہوتا
خاکساری کے لیے گرچہ بنایا تھا مجھے
کاش خاکِ درِ جانانہ بنایا ہوتا
نشۂ عشق کا گر ظرف دیا تھا مجھ کو
عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا
روز معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفؔر
ایسی بستی کو تو ویرانہ بنایا ہوتا

(بہادر شاہ ظفؔر)

(۲)

لگتا نہیں ہے دل مرا اجڑے دیار میں
کس کی بنی ہے عالمِ ناپائدار میں
عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں
بلبل کو باغباں سے نہ صیاد سے گلہ
قسمت میں قید لکھی تھی فصلِ بہار میں
ان حسرتوں سے کہہ دو کہیں اور جا بسیں
اتنی جگہ کہاں ہے دلِ داغدار میں
کتنا ہے بدنصیب ظفؔر دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

(بہادر شاہ ظفؔر)

سوالات

۱۔ پہلی غزل میں شاعر نے اپنی جن حسرتوں کا ذکر کیا ہے انھیں مختصر الفاظ میں بیان کیجیے۔

۲۔ دوسری غزل کے تیسرے شعر میں بلبل ، باغبان اور صیاد کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟

۳۔ اس غزل کے مقطع میں کس تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ ہے؟

۴۔ مندرجہ ذیل الفاظ کے متضاد لکھیے۔

شاہانہ ۔ دیوانہ ۔ تنگ ۔ معمورہ ۔ ناپائدار ۔ بہار ۔ قید

---

(۱)

کوئی اُمید بَر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معیّن ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پَر نہیں آتی
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زُہد
پَر طبیعت اِدھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چُپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبَر نہیں آتی
کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

(میرزا غالبؔ)

(۲)

ابنِ مریمؑ ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دَوا کرے کوئی
بات پر واں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں اور سنا کرے کوئی
نہ سنو ، گر برا کہے کوئی
نہ کہو ، گر برا کرے کوئی
روک لو ، گر غلط چلے کوئی

بخش دو، گر خطا کرے کوئی

کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقّع ہی اٹھ گئی غالبؔ
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

(میرزا غالبؔ)

سوالات

۱۔ پہلی غزل کے مقطعے کو ذہن میں رکھ کر بتائیے کہ غالب کو کعبے جانے سے کیوں شرم آرہی ہے؟

۲۔ دوسری غزل کے مطلع میں "ابنِ مریمؑ" (مریم کا بیٹا) کنیت ہے۔ کنیت کی کم از کم چار مثالیں اور لکھیے۔

۳۔ اس غزل کے چھٹے شعر میں جس واقعے کی طرف اشارہ ہے اس کی وضاحت کیجیے۔

۴۔ اس غزل کے آخری تین اشعار کی نثر بنائیے۔

۵۔ "غالبؔ" مرزا اسد اللہ خاں کا تخلّص ہے۔ اردو کے کوئی سے چار مشہور شاعروں کے تخلّص لکھیے۔

۶۔ مندرجہ ذیل کیسے حروف ہیں؟

کیا۔ بھی۔ پر۔ اور۔ گر۔ کیوں۔ جب۔ کا۔

(۱)

کاٹیے دن زندگی کے ان یگانوں کی طرح
جو سدا رہتے ہیں چوکس پاسبانوں کی طرح
منزلِ دنیا میں ہیں پا در رکاب آٹھوں پہر
رہتے ہیں مہماں سرا میں میہمانوں کی طرح
سعی سے اُکتاتے اور محنت سے کنیاتے نہیں
جھیلتے ہیں سختیوں کو سخت جانوں کی طرح
رسم و عادت پر ہیں کرتے عقل کو فرماں رواں
نفس پر رکھتے ہیں کوڑا حکمرانوں کی طرح
شادمانی میں گزرتے اپنے آپے سے نہیں
غم میں رہتے ہیں شگفتہ شادمانوں کی طرح
پاتے ہیں اپنوں میں غیروں سے سوا بیگانگی
پر بھلا تکتے ہیں ایک اک کا یگانوں کی طرح
ان کے غصے میں ہے دلسوزی، ملامت میں ہے پیار
مہربانی کرتے ہیں نامہربانوں کی طرح
کام سے کام اپنے ان کو، گو ہو عالم نکتہ چیں
رہتے ہیں بتیس دانتوں میں زبانوں کی طرح
کیجے کیا حالیؔ نہ کیجے سادگی گر اختیار
بولنا آئے نہ جب رنگیں بیانوں کی طرح

(مولانا الطاف حسین حالیؔ)

(۲)

یاروں کو تجھ سے حالی اب سرگرانیاں ہیں
نیندیں اُچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں
یاد اس کی دل سے دھو دے، اے چشمِ تر تو مانوں
اب دیکھنی مجھے بھی تیری روانیاں ہیں

بنتے ہیں غیر اپنے، ہوتے ہیں رام وحشی
الفت کی بھی جہاں میں کیا حکمرانیاں ہیں

خاور سے باختر تک جن کے نشاں تھے برپا
کچھ مقبروں میں باقی ان کی نشانیاں ہیں

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہ رہی ہے گنگا
کچھ کر لو نوجوانو! اٹھتی جوانیاں ہیں

فضل و ہنر بڑوں کے گر تم میں ہوں تو جانیں
گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں

رونے میں تیرے حالیؔ لذت ہے کچھ نرالی!
یہ خوں فشانیاں ہیں یا گُل فشانیاں ہیں

(مولانا الطاف حسین حالیؔ)

سوالات

۱۔ پہلی غزل میں شاعر نے اچھے انسانوں کے جو اوصاف بیان کیے ہیں انھیں اختصار سے لکھیے۔

۲۔ غیروں کو اپنا بنانے کا کیا طریقہ ہے؟ دوسری غزل کے تیسرے شعر کے حوالے سے بتائیے۔

۳۔ اوپر کی دونوں غزلوں کے قافیے جمع کی صورت میں ہیں انھیں واحد اسموں میں تبدیل کر کے لکھیے۔

۴۔ "خاور سے باختر تک" کیسا مرکب ہے صحیح جواب پر ✓ کا نشان لگائیے۔

(مرکبِ توصیفی۔ مرکبِ اضافی۔ مرکبِ جاری)

۵۔ اِعراب لگا کر تَلَفُّظ واضح کیجیے۔

منزل۔ سعی۔ رسم۔ ملامت۔ مقبرہ۔ فضل۔ ہنر

~~~~~~~~~
~~~~~~~~~

(۱)

دل کو سکون، روح کو آرام آ گیا
موت آ گئی کہ دوست کا پیغام آ گیا

جب کوئی ذکر گردشِ ایّام آ گیا
بے اختیار لب پہ ترا نام آ گیا

دیوانگی ہو، عقل ہو، امید ہو کہ یاس
اپنا وہی ہے وقت پہ جو کام آ گیا

صیّاد شادماں ہے مگر یہ تو سوچ لے
میں آ گیا کہ سایہ تہِ دام آ گیا

احباب مجھ سے قطعِ تعلّق کریں جگرؔ
اب آفتابِ زیست لبِ بام آ گیا

(۲)

عشق لا محدود جب تک رہنما ہوتا نہیں
زندگی سے زندگی کا حق ادا ہوتا نہیں

بیکراں ہوتا نہیں، بے انتہا ہوتا نہیں
قطرہ جب تک بڑھ کے قلزم آشنا ہوتا نہیں

اس سے بڑھ کر دوست کوئی دوسرا ہوتا نہیں
سب جدا ہو جائیں لیکن غم جدا ہوتا نہیں

درد سے معمور ہوتی جا رہی ہے کائنات
اک دلِ انساں مگر درد آشنا ہوتا نہیں

کیا قیامت ہے کہ اس دورِ ترقّی میں جگرؔ
آدمی سے آدمی کا حق ادا ہوتا نہیں

سوالات

۱۔ شاعر نے موت کو "دوست کا پیغام" کیوں کہا ہے؟

۲۔ آفتاب زیست کے لب بام آنے کا مفہوم بتائیے۔

۳۔ دوسری غزل کے پہلے شعر میں "عشق لا محدود" سے کیا مراد ہے؟

۴۔ قطرے کے قلزم آشنا ہونے کا کیا مطلب ہے؟

۵۔ لامحدود اور بے انتہا میں "لا" اور "بے" سابقے ہیں، ان سے تین تین الفاظ اور بنائیے۔

۶۔ "دیوانہ" سے دیوانگی اسمِ کیفیت ہے۔ مندرجہ ذیل سے **اسمِ کیفیت** بنائیے :-
تازہ - بیگانہ - بندہ - بیہودہ - آلودہ - بیچارہ - روانہ

- - - - - - - - - - -

(۱)

کب تلک مدعا کہے کوئی
نہ سنو تم تو کیا کہے کوئی

منتِ ناخدا نہیں منظور
چاہے اس کو خدا کہے کوئی

ہر کوئی اپنے غم میں ہے مصروف
کس کو درد آشنا کہے کوئی

کوئی تو حق شناس ہو یا رب
ظلم کو ناروا کہے کوئی

آرزو ہے کہ میرا قصۂ شوق
آج میرے سوا کہے کوئی

جی میں آتا ہے کچھ کہوں ناصر
کیا خبر سن کے کیا کہے کوئی

(۲)

کسی کا درد ہو دل بے قرار اپنا ہے
ہوا کہیں کی ہو، سینہ فگار اپنا ہے

ہو کوئی فصل مگر زخم کھل ہی جاتے ہیں
سدا بہار دلِ داغدار اپنا ہے

نہ تنگ کر دلِ محزوں کو اے غمِ دنیا
خدائی بھر میں یہی غمگسار اپنا ہے

کہیں ملا تو کسی دن منا ہی لیں گے اُسے
وہ زود رنج سہی پھر بھی یار اپنا ہے

نہ ڈھونڈ ناصرِ آشفتہ حال کو گھر میں
وہ بوئے گل کی طرح بے قرار اپنا ہے

(ناصر کاظمی)

سوالات

۱۔ پہلی غزل کے دوسرے شعر کا مفہوم اپنے الفاظ میں لکھیے۔

۲۔ شاعر کے نزدیک حق شناس کون ہے؟ وضاحت کیجیے۔

۳۔ دوسری غزل کے دوسرے شعر میں شاعر نے اپنے دل کو "داغدار" اور "سدا بہار" کیوں کہا ہے؟

۴۔ "حق شناس" (حق پہچاننے والا) میں "شناس" لاحقہ ہے۔ مندرجہ ذیل الفاظ کے آخر میں یہ لاحقہ لگا کر نئے الفاظ بنائیے اور ان کے معانی لکھیے۔

خدا۔ فرض۔ قدر۔ سخن۔ خود۔ ادا۔ موقع

۵۔ قوسین میں دیے جوابات میں سے صحیح جواب چن کر خالی جگہ میں لگائیے۔

(الف) غزل کے پہلے شعر کو ---- کہتے ہیں۔ (مُقطَع۔ مَطلَع)

(ب) شاعر اپنا تخلص غزل کے ---- شعر میں لاتا ہے (آخری۔ پہلے)

(ج) غزل کے ہر دوسرے مصرعے کے آخر میں آنے والے ہم وزن الفاظ کو ---- کہتے ہیں۔ (ردیف۔ قافیہ)

(د) قصۂ شوق قواعد کی رُو سے ---- ہے۔ (مرکبِ توصیفی۔ مرکبِ اضافی)

(ہ) "منائیں گے" گرامر میں ---- ہے۔ (فعلِ حال۔ فعلِ مستقبل)

(و) "نہ ڈھونڈ" گرامر میں ---- (فعلِ امر۔ فعلِ نہی)

~ ~ ~ ~ ~ ~ ~ ~ ~ ~

فرہنگ

فرہنگ

فرہنگ

(اس فرہنگ میں کلمات کے بالعموم وہ معانی دیے گئے ہیں جو متن میں مراد ہیں)

ا

ابخرات : بخارات ۔ بھاپیں ۔ جمع ابخرہ کی۔

ابنائے روزگار : زمانے کے بیٹے ۔ مراد انسان ۔ لوگ ۔

ابنِ مریمؑ : مریمؑ کا بیٹا۔ حضرت عیسیٰؑ۔

اِتباع : پیروی کرنا۔

اَٹوائی کھٹوائی لے پڑنا : غصے یا رنج میں الگ ہو کر کھاٹ پر سو رہنا۔

اُٹھائی گیرا : چور اچکا۔

اَثاثہ : سامان ۔

اَچھوت (ہندی) : نیچ ذات کا ہندو ۔

اَحرار : حر کی جمع معنی آزاد لوگ

اِختراع : نئی چیز کی دریافت ۔ ایجاد ۔ جدّت ۔

اِختلاط : میل جول ۔

اکھنڈ : ثابت ۔ مکمل ۔ جو تقسیم شدہ نہ ہو۔

اِدراک : عقل ۔ سمجھ ۔ فہم ۔

اَدق : بہت مشکل ۔

اَربابِ وفا : باوفا لوگ ۔

اِرتباط : میل جول ۔ تعلق ۔

اَرغوانی : سرخ رنگ کا

اِستحسان : تعریف کرنا ۔ پسند کرنا ۔

اِستعداد : لیاقت ۔ قابلیت ۔

اِستغنا : بے نیازی ۔ بے پروائی ۔ قناعت۔

اِستفسار : دریافت کرنا ۔ پوچھنا۔

اُستوار : مضبوط پائدار ۔

اِسراف : فضول خرچی ۔

اَسلاف : سلف کی جمع ۔ اگلے بزرگ ۔ آباء و اجداد۔

اَسوَد و اَحمر : کالے اور سرخ رنگ کے انسان، مختلف نسلوں کے لوگ

فرہنگ

(اس فرہنگ میں کلمات کے بالعموم وہ معانی دیے گئے ہیں جو متن میں مراد ہیں)

ا

اَبخرات : بخارات ۔ بھاپیں ۔ جمع ابخرہ کی۔

ابنائے روزگار : زمانے کے بیٹے ۔ مراد انسان ۔ لوگ ۔

ابنِ مریمؑ : مریمؑ کا بیٹا۔ حضرت عیسیٰؑ۔

اِتّباع : پیروی کرنا۔

اَٹوائی کھٹوائی لے پڑنا : غصے یا رنج میں الگ ہو کر کھاٹ پر سو رہنا۔

اُٹھائی گیرا : چور اچکا۔

اَثاثہ : سامان۔

اَچھوت (ہندی) : نیچ ذات کا ہندو۔

اَحرار : حر کی جمع معنی آزاد لوگ

اِختراع : نئی چیز کی دریافت ۔ ایجاد ۔ جدّت ۔

اِختلاط : میل جول۔

اَکھنڈ : ثابت ۔ مکمل ۔ جو تقسیم شدہ نہ ہو۔

اِدراک : عقل ۔ سمجھ ۔ فہم ۔

اَدق : بہت مشکل ۔

اَربابِ وفا : باوفا لوگ ۔

اِرتباط : میل جول ۔ تعلق ۔

اَرغوانی : سرخ رنگ کا

اِستحسان : تعریف کرنا ۔ پسند کرنا ۔

اِستعداد : لیاقت ۔ قابلیت ۔

اِستغنا : بے نیازی ۔ بے پروائی ۔ قناعت۔

اِستفسار : دریافت کرنا ۔ پوچھنا ۔

اُستوار : مضبوط پائدار ۔

اِسراف : فضول خرچی ۔

اَسلاف : سلف کی جمع ۔ اگلے بزرگ ۔ آباء و اجداد۔

اَسوَد و اَحمر : کالے اور سرخ رنگ کے انسان، مختلف نسلوں کے لوگ

اِشتیاق : شوق ۔ خواہش ۔

اَشک : آنسو ۔

اِصرار : ضد ۔ ہٹ ۔ تکرار ۔ تاکید ۔

اِصلاح پذیر ہونا : اصلاح قبول کرنا ۔

اُصولِ ہم سفری : ساتھ مل کر چلنے کے آداب ۔

اِضطراب : بے چینی ۔

اِضطراری عمل : وہ کام جو اپنے اختیار میں نہ ہو ۔ غیر اختیاری فعل ۔

اِعراب : کسی لفظ کا تلفظ بتانے کے لیے حرکات یعنی زیر ۔ زبر ۔ پیش ۔ کا استعمال

اَعِزّہ و اَقارب : بھائی بند ۔ رشتہ دار ۔ اقرباء ۔

اعضائے رئیسہ : جسم کے اہم حصے ۔ دل ، جگر ، دماغ وغیرہ ۔

افسرِ شاہانہ : شاہی تاج ۔ مراد بادشاہت ۔

اِفشا : ظاہر کرنا ۔

اَقصائے روم : روم کے دور دراز علاقے

اَلاماں : خدا اپنی امان میں رکھے ۔

اِلتزام : کسی کام کو اپنے لیے لازم ٹھہرا لینا ۔

اَلحذر : خدا کی پناہ ۔

اللّے تللّے : فضول خرچی ۔ بے دریغ خرچ کرنا ۔

اِمتدادِ زمانہ : وقت کا گزرنا ۔

امل : امید ۔

امیرالبحر : بحری بیڑے کا سپہ سالار ۔ ایڈمرل ۔ (انگریزی)

انٹرنس (انگریزی) : دسویں جماعت کا امتحان ۔

انٹلیکچوَل (انگریزی) : دانشور ۔ اربابِ عقل و دانش ۔

اَندازِ کہن : پرانا طریقہ ۔

اِنسداد : روک ۔ ممانعت ۔ بندش ۔

اَنگشتِ حیرت بدنداں : حیرانی کی وجہ سے دانتوں میں انگلی دبائے ہوئے ۔ بہت زیادہ حیران ۔

اہلِ حِرفہ : پیشہ ور لوگ

اہلِ رضا : اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہنے والے لوگ ۔

اہلِ شعور : صاحبانِ عقل ۔ عقل رکھنے والے۔

ایشیائے کوچک : ترکی کا ایشیائی حصہ۔

ایما : اشارہ ۔عندیہ۔

آ

آبِ خنک : ٹھنڈا پانی

آثار : اثر کی جمع۔ نشانات۔

آسمان گیر : آسمان تک پہنچنے والا۔

آسیب : جن بھوت کا اثر ۔ صدمہ۔

آشفتہ : حیران پریشان۔ دیوانہ۔

آشکار : ظاہر۔

آفاق : جمع افق کی ۔ دنیا۔

آفتابِ زیست : زندگی کا سورج ۔

آلۂ کار : کام کرنے کا آلہ۔ واسطہ۔

آلکس : سستی ۔ کاہلی۔

آماج : نشانہ۔ ہدف ۔

آہو : ہرن۔

آہنگ : اشارہ۔

ب

بابِ حرم : کعبے کا دروازہ۔ انوار الٰہی کا مرکز۔

بار آور : پھل دینے والا

بارہ پتھر باہر ہونا : شہر کی حدود سے باہر ہونا۔ دور ہونا۔ نکل جانا۔

باعثِ تقویم : دنیا کی پیدائش کا سبب۔

باعثِ سوزِ جگر : دل جلانے، غصہ دلانے یا غیرت دلانے کا سبب۔

بالواسطہ طور پر : براہ راست کی ضد۔

باور کرنا : یقین کرنا۔

بپتا (ہندی) : دکھ ۔ مصیبت۔

بتدریج : آہستہ آہستہ۔

بٹیا (ہندی) : بٹ کی تصغیر۔ چھوٹا راستہ۔ پگڈنڈی۔

بحر و بر : سمندر اور خشکی۔ مراد ساری دنیا۔

بد سیر : بری فطرت والا۔

بد ظنی : بدگمانی۔

بدھ (ہندی) : جوڑ۔

بد ہیئت : بدصورت۔ بدشکل۔

برج اسد : علم نجوم کی رو سے آسمان بارہ برجوں میں منقسم ہے۔ ان میں سے ایک برج کا نام اسد ہے جس میں موجود ستاروں کا مجموعہ شیر کا سا ہے

برق رفتار : بجلی کی سی رفتار والا۔ تیز رفتار۔

برگ وگیاہ : پتے اور گھاس

بَرِ صغیر : چھوٹا براعظم۔ ہندو پاک کے علاقے۔ خشکی کا چھوٹا ٹکڑا۔

بساط : توفیق۔ مقدور۔ طاقت۔

بطریق : پادری۔

بطحا : وادی مکہ۔

بُکا : رونا دھونا۔ فریاد کرنا۔ آہ وبکا۔

بلاد : بلد کی جمع۔ شہر۔ بستیاں۔

بلّی : ناؤ کھینے کا بانس۔ چھت میں سہارا دینے والی لکڑی۔ وہ لکڑی جو کواڑوں کے اندر کنڈی کی بجائے لگتی ہے۔

بلّی مار : ناؤ کھینے والا ملاح۔

بندہ پروری : کمزوروں اور زیر دستوں کی پرورش کرنا۔

بودا : تھڑدلا۔ کمزور چیز۔

بھاٹ : ایک قوم جو لوگوں کی تعریف میں شعر پڑھتی ہے اور نسب نامے یاد رکھتی ہے۔ خوشامدی۔

بہ اندیشِ کشور : ملک کا خیر خواہ۔

بھنبھوڑنا : نوچنا۔ کاٹنا۔ چیرنا۔

بہیمیت : درندگی۔ سنگ دلی۔

بے تیغ وسپر : تلوار اور ڈھال کے بغیر۔

بے چراغ : غیر آباد۔ ویران۔ سنسان۔

بے خرخشہ : بے کھٹکے۔

بے کراں : بے کنارہ۔ جس کا کوئی کنارہ نہ ہو۔ بے حد وسیع۔

بیرق : فوج کا جھنڈا

پ

پاٹ : دریا کی چوڑائی۔

پاداش : بدلہ۔ سزا۔

پا در رکاب : سفر کے لیے تیار ہونا۔

پایاب : اترا ہوا دریا۔ کم گہرا۔

پُر آشوب کشتی : طوفان میں گھری

ہوئی کشتی۔

پُراَسرار : وہ قوت جس کے راز کا پتا نہ چلے۔

پَرتَو : عکس۔ جھلک۔

پُرمنفعت : فائدہ مند۔ فائدے سے بھرا ہوا۔

پریم شکتی (ہندی) : مظہر عشق۔

پُسی (انگریزی) : بلی کو پیار سے پسی کہ کر پکارتے ہیں۔

پنڈ چھوڑنا : پیچھا چھوڑنا۔

پوشیدہ : چھپا ہوا۔

پھبتی : ایسی تشبیہ جس میں کسی کا مذاق اڑایا جائے۔

پھٹیچر : پھٹا پرانا۔ بوسیدہ۔

پی (ہندی) : پیارا محبوب۔

پیا (ہندی) : پیارا محبوب

پیرا (ہندی) : پیلا

پیکرِ محسوس : نظر آنے والا مادی جسم۔

ت

تابِ سخن : بات کرنے کی قوت یا مُجال۔

تاتار : تاتاریوں (مغلوں) کا ملک۔ ملک ترکستان۔

تاجِ گدایانہ : فقیری کا تاج۔ درویشی۔

تاحدِ امکان : ممکن حد تک۔ جہاں تک ہو سکے۔

تادیب : ادب سکھانا۔

تاخت و تاراج : لوٹ مار۔ تباہی و بربادی۔

تازہ انجم : نئے ستارے۔ مراد نئے ممالک۔

تازیہ : اصل لفظ تعزیہ ہے۔ ماتم داری۔

تَجَسُّس : تلاش۔ جستجو۔

تَجہیز و تکفین : مردے کے کفن دفن کا سامان کرنا۔

تحلیل کرنا : حل کرنا۔ گھلا دینا۔

تَرَشُّح : بوندا باندی۔ پھوہار۔

تَرکش : تیر رکھنے کا خانہ۔ تیر دان۔

تزئین : سجاوٹ۔ آراستگی۔

تَصَوُّر : خیال۔ سوچ۔

تَصَرُّف : بدل دینا۔ مراد کرامت۔

تصدُق : صدقہ۔ نثار۔ طفیل۔ بدولت۔

تصنُّع : بناوٹ۔ دکھاوا۔

تعارُف : پہچان۔ باہمی شناخت۔

تعب : رنج۔ سختی۔ دکھ۔

تعریض : طنز۔ چھیڑ۔ کنایہ سے بات کرنا۔

تعزیت نامہ : ماتم پرسی کا خط۔

تعدّی : ظلم۔ زیادتی۔ حد سے بڑھنا۔

تُفتہ : لفظی معنی ہے جلا بُھنا۔ آزردہ۔ مرزا غالب کے عزیز شاگرد ہرگوپال کا تخلص۔

تفرقہ : علٰحدگی۔ پھوٹ۔ نااتفاقی۔

تقطیع : شعر کا وزن اور بحر معلوم کرنے کے لیے اس کے ٹکڑے کرنا۔

تلافیِ مافات : نقصان پورا کرنا۔

تلف ہونا : ضائع ہونا۔

تمسُخر : مذاق۔ ٹھٹھا۔

تموُّل : دولت مندی۔ مال داری۔

تنویر : نور۔ روشنی۔

توشۂ آخرت : آخرت کا سرمایہ۔ مراد نیک اعمال۔

توقیر : وقار۔ عزت۔

تھگلی : چیتھڑا۔

تہی مغز : خالی دماغ۔ احمق۔

تیغا کرنا : اینٹ گارے سے بند کرنا۔

ٹ

ٹائپ (انگریزی) انداز۔ نمونہ۔ وضع

ٹک : ذرا۔

ٹکٹ : اجازت نامہ۔

ٹھر ٹھر کرنا (پنجابی) : سردی سے کپکپانا۔

ٹیپ ٹاپ : ظاہری سجاوٹ۔

ٹینٹوا : گلا۔ نرخرا۔

ثقافت تہذیب۔ کلچر (Culture)

ج

جا (ہندی) : جس۔

جاں پرور شمیم : روح کو تازگی بخشنے والی خوشبودار ہوا۔

جذبِ باہم : باہم کشش۔ اتحاد۔

جرأت آموز : جرأت سکھانے والی۔

جراثیم : جرثومہ کی جمع۔ ننھے ننھے

کیڑے جو بیماریوں کا باعث بنتے ہیں اور خوردبین سے ہی دیکھے جا سکتے ہیں۔

جرنلی بندوبست : فوجی قانون۔ مارشل لاء۔

جڑاؤ جھالے بالے : زیور جن میں موتی جڑے ہوں۔

جزبز ہونا : ناراض ہونا۔ تنگ ہونا۔ خفا ہونا۔

جزر و مد : پانی کا اتار چڑھاؤ۔ جوار بھاٹا۔

جسارت آفریں : جرات پیدا کرنے والا۔

جَلَّ و عَلاَ : بزرگی اور عظمت۔ مراد اللہ تعالیٰ جو جلال و عظمت کا مالک ہے۔

جلو : ہمراہی معیت۔ ساتھ۔ ہم رکابی۔

جُلوَت : خُلوَت کی ضد۔ وہ جگہ یا کیفیت جہاں تنہائی نہ ہو۔ مجمع

جلوہ فشاں : جلوہ گر۔ جلوہ دکھانے والا۔

جنجال : بکھیڑا۔ مشکل۔

جنوں : دیوانگی۔

جہاندار : بادشاہ۔ حاکم وقت۔

جوالا : آتش فشاں۔

جوق در جوق : گروہ در گروہ۔

جوہرِ قابل : ہنر و کمال حاصل کرنے کی قابلیت۔

جھروکا : دریچہ۔ کھڑکی۔

جَیبِ گُل : پھولوں کا کیسہ یا تھیلی۔ پھول کی وہ جگہ جہاں زر دانہ ہوتا ہے۔

چ

چاتُر (ہندی) : چالاک۔ ہوشیار۔ مکار۔

چاشت : صبح اور دوپہر کے درمیان کا وقت۔

چاکری : نوکری۔ خدمت گزاری۔

چاکِ قفس : پنجرے کا سوراخ۔

چراغِ فکر : فکر کا چراغ۔ عقل کی روشنی۔

چَکوا : ایک آبی پرندہ (نر)۔ اس کی مونث چکوی ہے۔

چل چلاؤ : رواروی۔ کوچ۔

چُنری (ہندی) : رنگ برنگ دوپٹا۔

چودہ طبق روشن ہونا : زمین و آسمان کے راز معلوم ہونا۔ عقل و فہم کا بڑھ جانا۔

چوڑا ہونا : کیچڑ یا پانی سے لباس کا خراب ہو جانا۔

چولا (ہندی) : پوشاک۔ لمبا کرتا۔

چھٹی ہوئی : بدمعاش ۔ چالاک۔ تیز طرار۔

چہرہ باندھنا : مرثیے کی تمہید لکھنا۔

ح

حاکم علی الاِطلاق : خود مختار حاکم۔

حائل : روکنے والا۔ روک۔ آڑ۔

حذَر : پرہیز کرنا۔ بچنا۔

حرفہ : پیشہ ۔ ہنر۔ کسب

حَرَم : مسجد حرام کا پورا علاقہ۔

حُرمت : عزت پاکیزگی۔

حُسنِ ظَن : نیک گمان۔

حضرتِ باری : اللہ تعالیٰ کی بارہ گاہ۔

حُضُوری : محبوب کا قرب۔

حَظ اٹھانا : لطف اٹھانا۔

حقانیت : سچائی۔

حنوط : خوشبودار چیزوں کا مرکب جس سے لاش کو محفوظ کرتے ہیں۔

خ

خاکستر : راکھ

خاکم بدہن : لفظی معنی ہے میرے منہ میں خاک۔ ایسی بات کرنے سے پہلے کہتے ہیں جس میں گستاخی کا خطرہ ہو۔

خانماں برباد : جس کا گھر بار لٹ چکا ہو۔

خدائی خوار : زمانے بھر کا آوارہ اور رسوا۔

خدنگ : تیر

خراسان : ایک ملک۔ موجودہ ایران کا ایک صوبہ۔

خسّت : کمینگی۔ گھٹیاپن۔

خطِ پیشانی : تقدیر کا لکھا۔ پیشانی کی تحریر۔

خطّاطی : خوش نویسی۔ کتابت۔

خفیف : شرمندہ۔ سبک۔

خفیف آثار : ہلکے نشانات۔

خَلوَت : جَلوَت کی ضد۔ تنہائی۔ اکیلے ہونے کی حالت۔

خُم : مٹکا۔ عام طور پر شراب کا مٹکا مراد ہوتا ہے۔

خودبینی : اپنی ذات کو اچھا سمجھنا۔

خودی : عام معنی غرور و تکبر۔ علامہ اقبال کے نزدیک خودی سے مراد اثبات ذات ہے۔

خیابان : کیاری۔ پھلواری۔ جو راستہ باغ کے بیچ سے گزرتا ہو۔

خِیام : خیمہ کی جمع۔

د

دار و گیر : پکڑ دھکڑ

داغ بیل ڈالنا : بنیاد رکھنا۔ نشان عمارت جو معمار زمین پر لگاتے ہیں۔

دخیل و کار فرما : اثرانداز ہونے والا۔

درجۂ فضیلت حاصل ہونا : امتیازی حیثیت حاصل ہونا۔

درسِ پامالی : پامال ہونے کا سبق۔ مراد پاؤں تلے روندا جانا۔

درماندگی : مجبوری۔ عاجزی۔ پیچھے رہ جانا۔

درندہ صفتی : وحشی جانوروں کا انداز۔ درندوں کی صفت۔

دریا : مراد سمندر۔

دستِ ہمت : ہمت کا ہاتھ مراد ہمت۔

دستور : قاعدہ۔ قانون۔ طریقہ۔

دفینہ : زمین میں گڑا ہوا خزانہ۔

دل ریش : جس کا دل زخمی ہو۔

دل سوزی : ہمدردی۔ غم خواری۔

دل گداختگی : دل کو نرم کرنے والی کیفیت۔

دُوبدُو آمنے سامنے۔ روبرو۔ مدمقابل۔

دولت : روپیہ پیسہ۔ سلطنت۔

دھاڑی چور : نامی چور۔ لٹیرا۔ ڈاکو۔

دُھول : تھپڑ۔

دیار : ملک۔

دین (ہندی) عنایت۔ عطیہ۔ بخشش۔

ڈھول کا پول کھلنا : اصلیت ظاہر ہونا۔

ڈسپیچر (انگریزی) : چٹھیاں بھیجنے والا محرر۔

ڈگری (انگریزی): عدالت کی طرف سے قرض کی وصولی کا حکم۔

ڈیوک Duke (انگریزی) : نواب۔ امیر۔

ذ

ذوقِ تن آسانی : آرام طلبی کا شوق۔

ر

رابطہ استوار : مضبوط تعلق۔

رسمِ مُشایعت : کسی کو احترام سے رخصت کرنے کے لیے چند قدم ساتھ جانا۔

رسم الخط : لکھنے کا انداز (املا)۔

رفتگاں : رفتہ کی جمع۔ گزرے ہوئے لوگ۔

رفیقِ نبوت : نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھی حضرت ابو بکر صدیقؓ

رِقّت طاری ہونا : دل بھر آنا۔

رَمق : آخری سانس۔ رہی سہی جان۔

رَن : جنگ۔ لڑائی۔

رِند : آزاد منش۔ بے فکرا۔

رَنگرُوٹ : نو آموز۔ ریکروٹ کا بگاڑ۔

روزِ حساب : قیامت کا دن جب انسان کے اعمال کا حساب ہو گا۔

روغن جوش : قورمے کی قسم۔ شوربے والا سالن۔

رولس رائس (انگریزی) : Rolls Royce ایک قیمتی کار کا نام۔

رُونگٹے کھڑے ہونا : سہمنا۔ ڈرنا۔ کانپنا۔ سردی یا خوف کے باعث جسم کے رووَں کا کھڑا ہو جانا۔

رہروِ منزل : منزل کی طرف جانے والا راہی۔

ریا : دکھاوا۔

ریاض : روضہ کی جمع۔ باغ۔

رِیت (ہندی): رسم۔ رواج۔ دستور۔

ریکارڈ کیپر (انگریزی): دفتر کے کاغذات کو محفوظ کرنے والا محرر۔

رَین (ہندی) : رات۔

ز

زال : بڑھیا۔ سفید بالوں والا بوڑھا۔

زجر و توبیخ : گھرکنا۔ جھڑکنا۔

زحمت کشِ پیکار : جنگ کی مصیبت برداشت کرنے والا۔

زرِ کامل عیار : کسوٹی پر پورا اترنے والا سونا۔ خالص سونا۔ اس نظم میں مراد زر گل یعنی پھول کے درمیان جو باریک بیج ہوتے ہیں۔

زک پہنچانا : نقصان پہنچانا۔

زمزمہ : گیت

زمین بوس ہونا : زمین کو بوسہ دینا۔ سجدے میں گرنا۔

زنہار : ہرگز۔

زور : جھوٹ۔ دھوکا۔

زورِ قضا : تقدیر کی قوت۔

س

ساجن (ہندی) : محبوب۔

ساحرہ : جادوگرنی۔

سازِ خاموش : وہ ساز جو بج نہ رہا ہو۔

سایہ فگن ہونا : سایہ ڈالنا۔

سبز قدم : منحوس۔

سبطِ نبیؐ : رسولؐ کا نواسا۔

سب گنوں پورا ہونا : طنزیہ انداز میں اس کے معنی ہے، ہر بری صفت کا مالک ہونا ہے۔

سپنا (ہندی) : خواب۔ خیال۔ وہم۔

سپوت : نیک اولاد۔ یہاں یہ لفظ طنز کے طور پر استعمال ہوا ہے یعنی نالائق اولاد۔

سَت : طاقت۔ زور۔ سچائی۔ جوہر۔

سَت وَنتی : سچی، نیک اور پاک دامن عورت۔

سحابِ بہار : موسم بہار کا بادل۔

سدا بہار : ہمیشہ سرسبز رہنے والا۔

سدِّ سکندر : سکندر کی بنائی ہوئی ایک فرضی مضبوط دیوار۔

سراپا چشم : دیدار کے شوق میں سخت مضطرب ہونا۔

سَرہانے : سرہانے۔

سرِّ یزداں : اللہ تعالیٰ کا بھید۔ خدائی راز۔

سرزنش کرنا : ڈانٹنا۔ تنبیہہ کرنا۔

سرور : خوشی۔ فرحت۔ نشے کی کیفیت۔

سعیٔ لاحاصل : بے نتیجہ کوشش۔

سُفَراء : سفیر کی جمع۔ ایلچی۔ پیغامبر۔

سقّائی : پانی پلانا۔

سُقَم : نقص۔ خرابی۔

سنگِ درِ جانانہ : محبوب کے دروازے پر رکھا ہوا پتھر۔ مراد دہلیز۔

سَلَف : پرانے بزرگ۔ آباء و اجداد۔ اَسلاف کا واحد۔

سما تا سمک : آسمان سے زمین تک۔

سَمَند : عمدہ نسل کا گھوڑا۔

سُندر (ہندی) : خوبصورت۔

سَنسار (ہندی) : دنیا۔ جہاں۔ کائنات۔

سوادِ شہر : شہر کا گرد و نواح۔

سُود فراموش : اپنا فائدہ بھول جانے والا۔

سوز : حرارت۔ تڑپ۔

سیاست پانا : سزا پانا۔

سَیل بہانا : طوفان برپا کرنا۔

سِیلن (ہندی) : نمی۔ تری۔

ش

شاخِ بریدہ : کٹی ہوئی شاخ۔

شاخ تراشی : شاخوں کی کانٹ چھانٹ۔

شارع : صاحب شریعت پیغمبر۔ مراد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

شانِ کئی : ایران کے کیانی بادشاہوں کی شان۔ مراد شاہانہ جاہ و جلال۔

شبِ تار : اندھیری رات۔

شبِ دیجور : اندھیری رات۔

شبنم افشاں : شبنم برسانے والی۔ آنسو بہانے والی۔

شرر : چنگاری۔

شش و پنج میں پڑنا : سوچ میں پڑنا۔

شِعارِ اَغیار : غیروں کے طور طریقے۔

شعلۂ جوالہ : گھومنے والا شعلہ۔

شکست و ریخت : ٹوٹ پھوٹ۔

شکوہ : شان و شوکت۔

شکوہ سنج : شکایت کرنے والا۔

شگفتہ : کھلا ہوا۔ خوش۔ شاد۔

شناور : تیراک۔

شورِ محشر : قیامت کا شور۔

شہ نشین : مکان کی کسی کھڑکی کے آگے بڑھا کر بنائی ہوئی جگہ۔

شیفتگی : حیرانی۔ پریشانی۔ عشق۔

شیوہ : طریقہ۔

شیوۂ تسلیم : مان لینے کا انداز یا طریق۔

شیوۂ فرسودہ : پرانا طریقہ۔

ص

صاحبِ ادراک : باشعور۔ سمجھ دار۔

صاحبانِ عالی شان : مراد انگریز حاکم۔

صاحبِ قدر والا : اونچے مرتبے والا۔

صحرائے پُرخار : کانٹوں بھرا جنگل۔

صدق : سچائی۔ صداقت۔

صعوبت : مصیبت۔ تکلیف۔ سختی۔

صغر سنی : چھوٹی عمر۔ خورد سالی۔

صفحۂ دہر : صفحہ ہستی۔ مراد دنیا۔

صنعا : یمن کے ایک شہر کا نام۔

صنعتِ صانع : کاری گر کی قدرت۔ خدا کی قدرت۔

صنعتِ تضاد : شاعری کی ایک صنعت جس میں ایک بات کا دوسری کے خلاف ہونا پایا جاتا ہے جیسے میر کے اس شعر میں آگ اور پانی میں صنعت تضاد ہے۔

ایک سب آگ ، ایک سب پانی
دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں

ض

ضیافتِ طبع : طبیعت کو خوش کرنے کی بات۔

ط

طاعت : فرماں برداری۔

طاق ہونا : ماہر ہونا۔

طبع سلیم : موزوں طبیعت۔ حق کو قبول کرنے والا مزاج۔

طرابلس شرق : شیخ سعدی کے زمانے میں شام کے ایک شہر کا نام طرابلس تھا جو آج کل شمالی لبنان میں واقع ہے۔

طرزِ سلف : بزرگوں کا چلن۔

طوفان : آندھی۔ تیز ہوا۔ شدت کی بارش۔ تہمت۔ الزام۔ بہتان۔

طینت : فطرت۔ خصلت۔

ظ

ظرف : اصل معنی برتن۔ مراد حوصلہ۔ لیاقت۔

ظروف : ظرف کی جمع۔ برتن۔

ع

عاقبت کا وبال : آخرت میں عذاب کا باعث۔

عَالَمِ اسباب : یہ دنیا جو ظاہری طور پر اسباب و نتائج کی بنیاد پر قائم ہے۔

عَبا : لمبا کوٹ۔ چغا۔ عربی پوشاک۔

عَبَث : فضول۔ بے فائدہ۔

عَجَم : عرب کے سوا کوئی اور ملک۔

عَزیمت : پختہ ارادہ۔

عُسرت : تنگ دستی۔

عصمتِ دامانِ پیغمبرؐ : پیغمبر کے دامن کی پاکیزگی۔ یعنی پیغمبر کی پاک دامنی۔

عِفّت : پاک دامنی۔

عفیف : پاک دامن۔

عَلَی الصُّبح : صبح سویرے۔

عمر کا جام لبریز ہونا : موت کا وقت قریب آنا۔

عنیف : سخت۔ کرخت۔ تند۔

عُور : ننگا۔ عریاں۔

عِیاذاً باللہ : اللہ کی پناہ۔

غ

غرفش : غرا کر بات کرنا۔ غراہٹ۔

غرہ شوال : شوال کے مہینے کی پہلی چاند رات۔

غرقی : لنگوٹی۔

غزا : جہاد۔

غیبت : پیٹھ پیچھے برائی کرنا۔ چغلی کھانا۔

ف

فارما کوپیا (انگریزی) : ایسا لغت جس میں ادویہ کا محل استعمال اور خواص درج ہوں۔

فال : شگون۔

فتنہ و آشوب : فتنہ و فساد۔

فردا : آنے والا کل۔

فرطِ اشتیاق : شوق کی زیادتی۔

فرطِ طرب : بہت زیادہ خوشی۔

فرماں روا : حاکم۔

فروتنی : عاجزی۔ مسکینی۔

فرنٹ ویو (انگریزی) : سامنے کے حصے کا منظر۔

فصلانہ : فصل پکنے پر ملنے والا حصہ۔

فقیہ : علم فقہ کا ماہر۔

فکرِ کسبِ ہنر : ہنر سیکھنے کی فکر۔

فکرِ مآل : آخرت کی فکر۔

فگار : زخمی۔ گھائل۔

فلاح : بھلائی۔ بہتری۔

فلاکت زدہ : مصیبت زدہ۔

فلو (انگریزی) : انفلوئنزا کا مخفف۔ وبائی زکام اور بخار۔

ق

قاز : ایک آبی پرندہ۔ کونج۔

قاصر : کوتاہی کرنے والا۔ مجبور۔

قاقم : سنجاب۔ نیولے کی قسم کے ایک جانور کی نرم اور ملائم کھال جو پہننے کے کام آتی ہے۔

قبا : ایک قسم کا لمبا کوٹ جو آگے سے کھلا ہوتا ہے۔

قباحت : برائی۔

قدم بوسی : پاؤں چومنا۔ احترام کرنا۔

قد و رخ : قد اور چہرہ مراد جسم۔ سراپا۔ پیکر۔

قریحۂ صالحہ : قریحہ کے معنی ہیں انسانی فطرت۔ نیک انسانی فطرت۔

قزاقی : ڈاکا زنی۔

قسّامِ ازل : روز ازل سے لوگوں میں روزی تقسیم کرنے والا مراد اللہ تعالیٰ۔

قضا : موت۔ حکم خدا۔

قطعِ تعلّق : تعلق توڑ لینا۔

قُلزُم : وہ بحیرہ جو عرب اور مصر کے درمیان واقع ہے۔ کنایتہ گہرا سمندر۔

ق ۔ م : قبل مسیح کا مخفف۔

قماش : طرز۔ وضع۔ ڈھنگ۔

ک

کاریڈور (انگریزی) : راہداری۔

کاسۂ سر : کھوپڑی۔

کالبدِ خاکی : مٹی کا بنا ہوا جسم۔

کان کاٹنا : سبقت لے جانا۔ بہت ہوشیار ہونا۔

کثافت : گندگی۔ گاڑھا ہونا۔

کثیف : غلیظ۔ گندا۔

کچھار : شیر کے رہنے کی جگہ۔

کدورت : کینہ۔ بغض۔ ملال۔

کراں تا بہ کراں : ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک۔

کرجگ (ہندی) : عمل کا زمانہ۔

کریہہ : مکروہ۔ قابل نفرت۔

کسبِ کمال : کسی ہنر میں پوری مہارت حاصل کرنا۔

کف : جھاگ۔ لعاب۔ تھوک۔

کل جُگ (ہندی) : چوتھا جگ۔ آخری زمانہ جس میں گناہ کثرت سے ہوں۔

کلکاریاں لگانا : چیخنا۔ چلانا۔ پکارنا (خوشی کی حالت میں)۔

کلنگ : کونج۔

کلس : گنبد کے اوپر کی چوٹی۔

کلیسا : عیسائیوں کی عبادت گاہ۔ گرجا۔

کمالِ کفش دوزی : جوتے سینے کے فن میں کمال حاصل کرنا۔

کمندِ شعاعی : شعاعوں کی سیڑھی۔

کُندہ : کھدا ہوا۔

کواکب : کوکب کی جمع۔ ستارے۔

کوفت : تکلیف۔ تھکاوٹ۔

کوکلا : فاختہ کی قسم کا ایک پرندہ۔

کونسل ہونا : مشورہ ہونا۔

کوہ و دمن : پہاڑ اور وادیاں۔

کہربا : کاہ (تنکا)

(کھینچنے والا)۔ ایک قسم کا گوند جس کی خاصیت یہ ہے کہ اگر اسے کپڑے یا چمڑے پر رگڑ کر گھاس کے تنکے کے سامنے لائیں تو وہ اسے مقناطیس کی طرح اٹھا لیتا ہے۔

کھرنی کا درخت : ایک درخت جس کا پھل نیم کے پھل کے مشابہ مگر میٹھا ہوتا ہے۔

کھنجن : سیاہ رنگ کا ایک پرندہ۔

کہنہ فروش : کباڑی۔ پرانی چیزیں بیچنے والا۔

کھونٹ (ہندی) : کونا۔ گوشہ۔ زاویہ۔

گ

گُدی : گردن کا پچھلا حصہ۔

گراں بہا : قیمتی۔

گرد : پہلوان۔

گرداب : بھنور۔

گرہستی (ہندی) : گھر سے متعلق۔

گِل : مٹی۔ گارا۔ علامتی طور پر انسان کی فطرت۔

گُل چیں : پھول توڑنے والا۔

گُل فشانی : پھول برسانا

گونڈنی کی طرح زیور میں لدی : گونڈنی ایک درخت کا نام ہے جس پر کثرت سے پھل لگتا ہے مراد ہے ڈھیروں زیور پہنے ہوئے۔

گھاگھ : پرانا تجربہ کار آدمی۔

گِیاہ : گھاس۔

ل

لَاحَولَ وَلَا قُوَّۃَ : نفرت یا بیزاری کے اظہار کے لیے یا وسوسہ و وہم دور کرنے کے واسطے، یہ کلمات زبان پر لاتے ہیں۔

لاغر : کمزور۔

لَبِ بام : چھت کا کنارہ۔ منڈیر۔

لپاڈگی : گھونسوں اور تھپڑوں کی مار۔

لُٹس : لوٹ مار۔

لذتِ آشنائی : عشق کی چاٹ۔ محبت کی لذت۔

لسانیات : زبانوں کا علم۔

لسانی حد بندی : وہ حد بندیاں جو زبان کی بنیاد پر ہوں۔

لطیفۂ غیبی : قدرت کی طرف سے معجزہ۔ مراد خوش نصیبی۔

لَنگر : لوہے کی زنجیر جس کے ساتھ وزن بندھا ہوتا ہے اور جو جہاز کو سمندر میں ٹھہرانے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

لَو بڑھانا : روشنی تیز کرنا۔ مراد گرمیِ عمل۔

لَوحِ مزار : قبر کے سرہانے لگی ہوئی تختی۔

م

مآل : انجام۔

مال گودام : مال اسباب رکھنے کی جگہ۔

ماہی : مچھلی۔

مبادا : کہیں ایسا نہ ہو۔

مُباہات : بڑائی یا فخر۔

مُبتَذِل : معیار سے گرا ہوا۔ پست۔

متاعِ حیات : زندگی بسر کرنے کا سامان۔

متبع : پیروی کرنے والا۔

مخلوط : ملا جلا۔

مفقود : غائب۔ غیر موجود۔

متبادِل : بدلنے والا۔ باری سے آ یا کام کرنے والا۔

متعدّد : کئی۔ تعداد میں زیادہ ہونا۔

متنفّس : سانس لینے والا۔ جاندار۔

متنوّع : قسم قسم کے۔

مُتورّع : پرہیز گار۔

مُثھا : ست۔ ڈھیلا۔ کند۔

مَثَل : کہاوت۔

مِثل : مانند۔

مجالِ دَم زدَن نہیں : بولنے یا اف کرنے کی ہمت نہیں۔

مُجتہد العصر : زمانے کا بہت بڑا عالم۔ شیعوں کا فقیہ۔

مُجرا لینا : سلامی لینا۔

مُجمَل : مختصر۔

مُحزوں : غمگین۔ مغموم۔

محفلِ انجم : ستاروں کی محفل۔

مُحکم : مضبوط۔ پکا۔

محکومِ ہَوا : ہوا (خواہش) کا مطیع۔ حرص و ہوس کا غلام۔

محوِ غمِ دوش : ماضی کے فکر میں غرق۔

مخمور : مست۔

مراقبہ : گردن جھکا کر فکر کرنا۔ حضور قلب سے خدا کو یاد کرنا۔

مُرتد : دین سے پھر جانے والا۔

مُرتسم : مہر ہو جانا۔ نقش ہو جانا۔

مردِ وفا سرشت : وہ شخص جس کی فطرت میں وفاداری کا مادہ ہو۔

مَرجع : جس چیز یا شخص کی طرف رجوع کیا جائے۔

مُرصّع : جڑاؤ۔ سجا ہوا۔

مزروعات : مزرعہ کی جمع۔ کھیتیاں۔ زرعی فارم۔

مسافت : فاصلہ۔ دوری۔

مُستاصَل : جڑ سے اکھڑا ہوا۔ تباہ و برباد۔

مُستعار : ادھار مانگی ہوئی چیز۔

مُستعمَل : استعمال شدہ۔

مُسٹنڈا : ہٹا کٹا۔ موٹا تازہ۔

مُسلّط : قابض۔

مَسیں بھیگنا : مونچھوں کے رووَں کا نکلنا۔

مشاغلِ منصبہ : عہدے کی رو سے جن مصروفیات کا ہونا ضروری ہے۔

مُشایعت : کسی کو رخصت کرتے وقت کچھ دور تک اس کے ساتھ جانا۔

مُشتِ خاک : خاک کی مٹھی یعنی کمزور انسانی جسم۔

مَشروب : پینے کی چیز۔ شربت۔ چائے وغیرہ۔

مُشک بار : خوشبو برسانے والا۔

مِشنری (انگریزی) : مبلغ۔

مَصرَف : خرچ کرنے کی جگہ۔ خرچ کرنے کا موقع۔

مضمحل : کمزور۔ ناتوان۔

مطرب : گویا۔

معاً : فی الفور۔

معاذاللہ : خدا پناہ میں رکھے۔

معتکف : عبادت کے لیے گوشہ نشیں ہونے والا۔

معرضِ خطر میں : خطرے کی حالت میں۔

معصیت : گناہ۔ خطا۔

معلق : لٹکا ہوا۔

مفتوح : کھولا گیا۔ فتح کیا گیا۔

مفلوک الحال : خستہ حال۔ تباہ حال۔

مقابر : جمع مقبرہ کی۔

مقتدا : وہ شخص جس کی لوگ پیروی کریں۔ پیشوا یا امام۔

مقناطیس : ایک قسم کا پتھر جو لوہے کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔

مکافاتِ عمل : عمل کا بدلہ۔

مکانِ معین : مقررہ جگہ۔

مگن : غرق۔ مست۔ مسرور۔

ملتِ بیضا : مسلمان قوم۔ ملت اسلامیہ۔

ملت رہی دوہات (ہندی) : ہاتھ ملتی رہی۔ مایوسی و محرومی کا اظہار۔

ملحق : جڑا ہوا۔ ساتھ ملا ہوا۔

ملیح : سانولا۔ خوبصورت۔

منت : احسان

منجدھار : دریا کے عین درمیان کی تیز لہر۔

منطق : وہ علم جو عقلی دلائل سے حق کو حق اور باطل کو۔ باطل ثابت کرے۔

من وکہ : میں جو کہ۔

منعم : صاحب نعمت۔ دولت مند۔

منقطع ہونا : کٹ جانا۔ ختم ہو جانا۔

موقف : کھڑے ہونے کی جگہ۔ ٹھہرنے کا مقام (مقام عرفات)۔

مورچہ : چیونٹی۔

موہنی : دل موہ لینے والی۔

مہر و ماہی : سورج اور مچھلی۔ مراد ہر قسم کی مخلوق۔

مہمان سرا : مسافر خانہ۔ مراد عارضی قیام گاہ (دنیا)۔

مہین : پتلا۔ کم حیثیت۔

ن

ناخلف : نالائق۔ کپوت۔

ناسعید : بدبخت۔

ناشائستہ: غیر مہذب
نا شُدَنی: نہ ہونے کے لائق۔
نا قابلِ قُرقی: جسے قانوناً قرق (ضبط) نہ کیا جا سکے۔
ناقہ: اونٹنی۔
ناکا (پنجابی لفظ): کھیت میں پانی لگاتے ہوئے نالی بنانا۔ کاٹنا یا پانی باندھنا۔
نالش: مقدمہ۔ دعوی۔
نجابت: خاندانی شرافت۔
نجوم: نجم کی جمع معنی ستارے۔ ایک علم جس میں ستاروں کی حرکات اور تاثیر کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔
نخوت: غرور و تکبر۔
نرباہ: نباہ۔
نروان: نجات۔ مکتی۔
نسلی تنوّع: مختلف نسلوں کے لوگ۔
نشاط انگیز: خوشی پیدا کرنے والا واقعہ۔
نشیب و فراز: اونچ نیچ۔
نشیمن: گھونسلا۔ ٹھکانا۔ گھر۔
نصاریٰ: عیسائی۔
نظیر: مثال۔ مانند۔

نَعلَین دَر بَغلَین کرنا: دونوں جوتوں کو اتار کر بغلوں میں دبا لینا۔
نغمۂ عشرت: خوشی اور عیش کا گیت۔
نفور: نفرت کرنے والا۔
نکات: نکتہ کی جمع۔ معنی باریک باتیں۔
نوائے سروش: فرشتہ غیب کی آواز۔
نومی: زیادہ سونے والا۔
نوید: خوشخبری۔
نہالچہ: چھوٹا سا بستر۔ چھوٹی رضائی۔ بچوں کا بچھونا۔
نہنگ: مگرمچھ۔
نَیرنگِ جہاں: دنیا کے عجیب و غریب احوال یعنی زمانے کے انقلابات۔

و

وارثِ شرعی: شرع کی رو سے وارث ہونے کا اہل۔
واللہ اَعلَمُ: اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔
وجد و سماع: عارفانہ کلام سننا اور بے

خود ہو جانا۔

وَدِیعت : امانت۔

وفا سرشت : وفادار۔ خیر خواہ۔

وفور : کثرت۔ بہتات۔

ہ

ہرچہ بادا باد : جو ہو سو ہو۔

ہَست و بُود : زندگی۔ وجود۔ قیام۔

ہفت خوان سر کرنا : رستم و اسفند یار کی طرح مشکل مہمات میں کامیاب ہونا یعنی کسی نہایت مشکل کام کو انجام دینا۔

ہم دوش : ہمراہی۔ ساتھی۔

ہم سخن : ہم زبان۔ ہم کلام۔ ساتھی۔ دوست۔

ہوا باندھنا : رعب جمانا۔ زور پکڑنا۔ سکہ بٹھانا۔

ہوا خواہ : ہمدرد۔ خیر خواہ۔

ہَیئت : ایک علم کا نام ہے جس میں آسمان کے برجوں کی اشکال اور کرہ زمین کی پیمائش وغیرہ معلوم کی جاتی ہے۔

ی

یاس و حرماں : ناامیدی و محرومی۔

یاوَر : مدد گار۔

یُدھ (ہندی) : جنگ۔

یکتا : بے مثل۔ لاثانی۔

یک چند : کچھ عرصہ تک۔

یک لخت : اچانک۔

یگانہ : بے مثل۔ واحد۔ بیگانہ اس کی ضد ہے۔

یلغار : دھاوا۔ تیز حملہ۔

یمین و یسار : یمین: دایاں ہاتھ دائیں جانب۔ یسار: بائیں جانب بایاں ہاتھ مراد ہے دائیں بائیں۔ چپ و راست۔

جملہ حقوق بحق پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور محفوظ ہیں

منظور کردہ! وزارت تعلیم حکومت پاکستان، اسلام آباد، بموجب
مراسلہ 4-8/87-یو-آر، مورخہ 22 نومبر 1987ء

قومی ترانہ

پاک سرزمین شاد باد کشورِ حسین شاد باد
تو نشانِ عزمِ عالی شان ارضِ پاکستان
مرکزِ یقین شاد باد

پاک سرزمین کا نظام قوّتِ اخوّتِ عوام
قوم، مُلک، سلطنت پائندہ، تابندہ باد
شاد باد منزلِ مُراد

پرچمِ ستارہ و ہلال رہبرِ ترقّی و کمال
ترجمانِ ماضی شانِ حال جانِ استقبال
سایۂ خدائے ذوالجلال

SERIAL NO. 13031

تاریخ اشاعت	اشاعت سوم	تعداد اشاعت	قیمت
مارچ ۱۹۹۳ء	بار اوّل	۳۵,۰۰۰	۱۸.۸۵